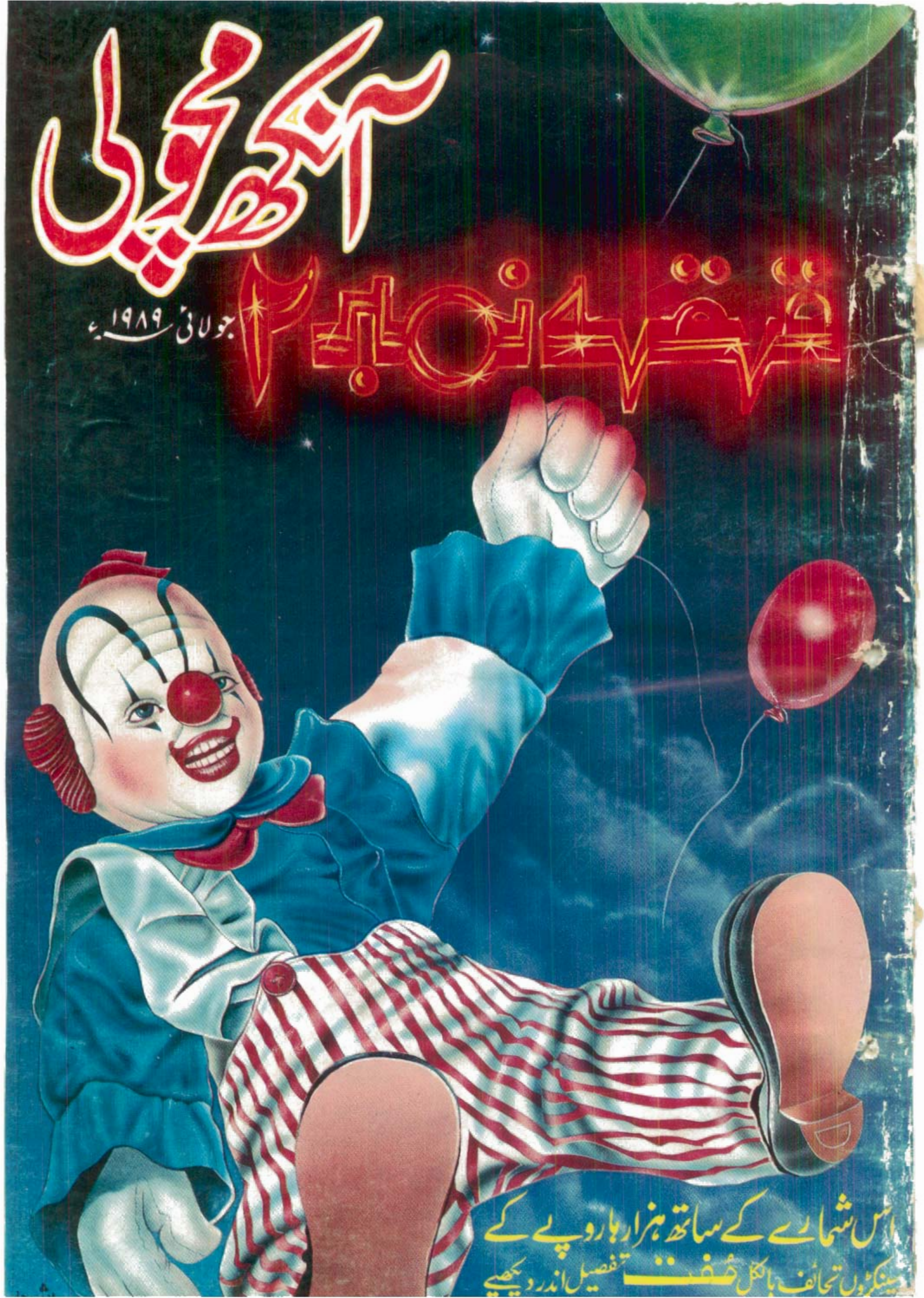
آنکھ مچولی
جولائی ۱۹۸۹ء
قصہ نمبر ۲
اس شمارے کے ساتھ ہزار ہا روپے کے
سینکڑوں تحائف بالکل مفت
تفصیل اندر دیکھیے

پہلا انعام - ۵ ، امریکن کیمرے | دوسرا انعام - ۵ ، پاکٹ سائز ریڈیو | تیسرا انعام - ۳۵ ، کیلکیولیٹرز | ۱۰۰ ، خوبصورت گھڑیاں

۶ ، سیٹ پارکر قلم | ۲۵ ، خوبصورت قلم | ۲۵ ، جیومیٹری بکس | ۱۲ ، ڈزنی ورلڈ ماؤنٹنگ | ۱۰ ، امپورٹڈ پنسل سیٹ

۱۲ ، مقناطیسی لُڈّو | ۱۰۰ ، کورین بال پوائنٹس | ۱۵۰ ، خوبصورت معلوماتی کتب | ۱۵ ، ڈرائنگ بکس | تفصیلات کے لیے سامنے کا صفحہ دیکھیے

ایک دوسرے کو تحفے دیتے رہا کریں کہ اس سے محبت بڑھتی ہے (فرمانِ رسولؐ)

آنکھ مچولی

انمول تحفے بن مول کی ایک نئی روایت

آپ گواہی دیں گے کہ

آنکھ مچولی نے آپ سے پُرخلوص تعلق کی خاطر آئے دنوں نت نئے تحائف دینے کی روایت ڈالی اپنی ہی قائم کردہ روایت سے آگے بڑھتے ہوئے اس بار قہقہہ نمبر کی قہقہاتی تحریروں کے ساتھ آنکھ مچولی کے (۵۰۰) خوش نصیب قارئین کے لئے ہزارہا روپوں کے قیمتی تحائف

بالکل مُفت

- —تمام تحائف کمپیوٹر کے ذریعے قرعہ اندازی کے بعد دیئے جائیں گے۔
- —اگست کے شمارے میں تحائف کے نتائج کا اعلان دیکھنے کے بعد خوش نصیب اپنا کوپن پر کرکے ہمیں بھجوادیں
- —احتیاطاً کوپن کی فوٹو کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ خدانخواستہ آپ کا کوپن کھو جانے پر یا ہم تک نہ پہنچنے کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
- —پہلا دوسرا اور تیسرا انعام حاصل کرنے والے ساتھی اپنی تصویر، نام اور پتہ ہمیں ضرور بھجوائیں ہم ان کے مکمل تعارف کو شامل اشاعت کرلیں گے

— — کوپن یہاں سے کاٹیں — — — — — — — — — — —

نام ________________ کلاس ________________

پتہ ________________

____

کوپن نمبر 13141

ایک بار کی زحمت

سال بھر کا آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے ہر ماہ حاصل کرنے کے لیے

صرف ایک بار زحمت کیجیے اور ۱۲ ماہ تک اپنا پسندیدہ رسالہ باقاعدگی سے حاصل کیجیۓ۔

آنکھ مچولی کے (۱۲) شماروں کی قیمت مع دو خاص نمبر اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ (۱۳۲) روپے بنتی ہے، لیکن خصوصی بچت اسکیم کے تحت آپ کو صرف (۹۰) روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یوں گویا بہ یک وقت آپ دو فائدے اٹھا سکتے ہیں۔

① **۴۲** روپے کی خصوصی بچت۔

② گھر بیٹھے رجسٹرڈ ڈاک سے رسالے کی بحفاظت ترسیل۔

یاد رہے کہ

رسالے کی قیمت میں اضافے کے باوجود زرِ سالانہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

اگر آپ سالانہ خریداری کے لیے ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتے ہوں تو ۹۰ روپے کا منی آرڈر اور مندرجہ ذیل کوائف ایک علیحدہ کاغذ پر روانہ کریں۔

① خریدار کا نام ② مکمل پتہ ③ رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے ④ فون نمبر (اگر ہو) ⑤ دستخط

"خصوصی بچت اسکیم" ماھنامہ آنکھ مچولی۔ ڈی-۱۱۲- نورس روڈ سائٹ کراچی ۱۶

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

جلد [۳] شمارہ [۱] جولائی ۱۹۸۹ء ذیقعد ۱۴۰۹ھ

ABC آڈٹ بیورو سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
- ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

مُدیرِ اعلیٰ — ظفر محمود شیخ

مُدیرِ مسئول — تجمل حسین چشتی

مُشاورت — مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مُدیرانِ اعزازی — طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت — شاہ نواز فاروقی، سیّد خورشید عالم

خطّاطی — عارف سعید

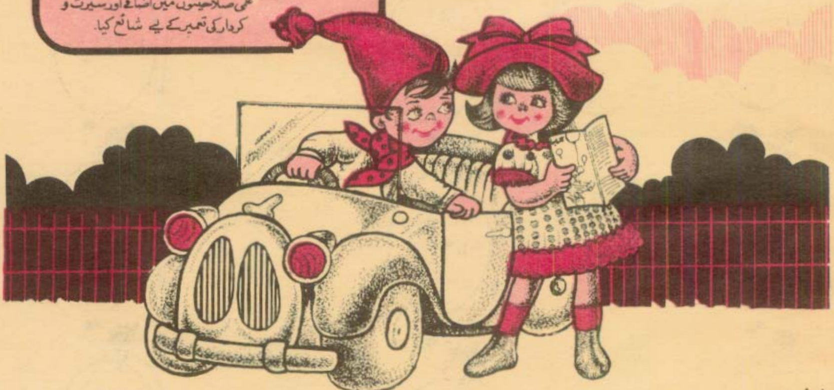

فون نمبر - ۲۹۹۱۷۸

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲-ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت ۱۵ روپے ۱۰ درہم ۱۰ ریال

زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

مُرغِ تحریرنُما

9 اداریہ

11 ڈاکیہ ڈاک لایا

17 مزاح نگاروں کے واقعات — انتخاب: راشد علی محمد

19 دلچسپ شرارتیں — صالح ارشاد

23 کسی شہر میں تھا ایک بادشاہ (نظم) — حفیظ جالندھری

26 ٹکٹ ٹون (اطرہ)

28 چھکڑا میل — نور کلیم بلوچ

31 مجھے بھی میرے دوستوں سے بچاؤ — محمد نوید مرزا

35 انڈے ہمارے دور کے چالاک ہوگئے — حارث شمیم

39 جیدی سے گپ شپ — فیاض اعوان

50 کرکٹ میں قہقہے — حبیب الرحمٰن

53 ہت تیرے کی — سلیم الطبع

57 شیرِ بے چارہ (نظم) — احمد حاطب صدیقی

58 چارلی چپلن — سید خورشید عالم

61 بچہ جمہورا کی واپسی — ایاز محمود

71 کھٹے میٹھے — منتخب لطائف

79 چٹکلے

81 سائیکل کی سواری — شین صدیقی

87 منتخب شوخ لکیریں

91 مُلّا نصرالدین — مرسلہ: محبوب ظفر انوار

95 میرا اسکول (نظم) — محمد امان خان دل

96 قسمت گھر — مصطفےٰ چاند

105 ٹلی ماؤس سے خیالی انٹرویو — محمد سلیم مغل

110 نوے سال کے بچے کی شادی (نظم) — دلاور فگار

111 چیکو کا رسالہ — طاہر مسعود

117 اوور رائیٹنگ — محمد جاوید خالد

۱۳۱ یس ریڈی پلیز
۱۳۵ مضمون لکھنے کے ۴۲۰ طریقے
۱۲۹ فکری ماموں
۱۳۶ ہندسوں کا ہیرو (نظم)
۱۳۹ کدوؤں کی کی نمبر غالب
۱۴۰ ایک تھا بادشاہ

۱۴۵ میرے بچپن کے دن — رفعت ہمایوں
۱۴۹ تخریب کار سے انٹرویو — محمد عادل سجاد
۱۵۲ بانا بانغ تماشا — وفا علاؤالدین
۱۵۵ ماموں لیموں — طارق محمود میاں
۱۶۱ ڈاکٹر وکیلیں سے ملاقات — نبیل مختار صدیقی
۱۶۵ جب بجلی چلی جاتی ہے — ساجد قمر

۱۶۸ کہانی جو بندر لے بھاگا
۱۷۱ پودے کا اغوا
۱۸۰ چھوٹی چھوٹی مزیدار باتیں
۱۸۴ مسکراہٹ اور ہم — ساجد سعید
۱۸۷ شتر مرغ اور اودبلاؤ
۱۸۹ ہنستی ہوئی زندگی — عامر یونس

۱۹۹ ٹوٹنا ہماری ٹانگ کا — شانا ایوب
۲۰۳ خوش رہو آباد رہو — ڈاکٹر سید معین اختر
۲۰۵ چھلانگ — شوکت تھانوی
۲۱۲ پرانا کوا نٹی کہانی — سید انعام اللہ شاہ
۲۱۵ ڈنر تیار ہے — نیر ابدالی
۲۱۹ ماڈرن آدمی نامہ — مجید لاہوری

۲۲۳ آئیے کرکٹ کھیلیں
۲۲۶ گداگر کیسے کیسے
۲۲۹ ایک دن بکرا پیڑی میں
۲۳۲ عقل مند کون؟
۲۳۵ ننھی نگارشات
۲۵۰ امی ابو کا صفحہ

A CUSTOM MADE VEHICLE FOR YOU

پروفیشنٹ

ہمارے ملک میں پہلی بار

آپ کی اپنی ضرورت کے مطابق گاڑی

پٹرول انجن یا ڈیزل؟
جو آپ پسند فرمائیں۔

اسٹیل یا فائبر گلاس باڈی؟
جو بھی آپ چاہیں۔

اسکول وین یا ایمبولینس؟
ہم آپ کی ضرورت کے مطابق تیار کریں گے

آپ رنگ پسند کرلیں!
ہم آپ کی خواہش کا احترام کریں گے۔

مزید کوئی اور ردّوبدل؟
ہر ضرورت جو آپ کے لئے مناسب ہے
ہمارے لئے ممکن ہے۔

بکنگ
20,000 روپے میں
این ڈی ایف سی کی معرفت

پروفیشنٹ
حقیقت پسند بنیئے - پاکستانی گاڑی خرید یئے!

ونمارک
انٹرنیشنل (پرائیویٹ) لمیٹڈ

MASS

ماہِ رواں کی پہلی بات

پچھلے برس اپریل کی چھٹیوں میں ہم نے آنکھ مچولی کا قہقہہ نمبر پیش کیا تھا آپ نے اسے پڑھ کر خوب قہقہے لگائے تھے اور اصرار کیا تھا کہ ہم ابھی اور ہنسنا چاہتے ہیں اس لیے قہقہہ نمبر ۲، بھی شائع کیجیے لیجیے آپ کی فرمائش پوری ہوئی، قہقہہ نمبر کا دوسرا حصّہ آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔ اس کے متعلّق ہمیں زیادہ کچھ نہیں کہنا صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس شمارے میں آپ کو نئے لکھنے والے زیادہ نظر آئیں گے ۔ ہم جانتے ہیں کہ لکھنے لکھانے کی جتنی قسمیں ہیں اُن میں مزاح لکھنا مشکل ترین فن ہے ۔ اس کے باوجود ہم نے نئے لکھنے والوں پر انحصار کیا ہے اور ہم ان کی نگارشات ... بغیر کسی انکساری کے ... اس یقین کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ ان کی شگفتہ تحریریں صرف آپ لوگوں ہی کو لُطف اندوز نہیں کریں گی بلکہ اُردو کے مزاحیہ ادب میں یہ خوشگوار اضافہ بھی ثابت ہوں گی ۔ آپ خود محسوس کریں گے کہ ہمارے ان نئے قلم کاروں کے قلم میں بڑی توانائی ہے ۔ طنز ہے شگفتگی ہے اور وہ سب کچھ ہے جو ان کے ادبی مستقبل کو تابناک بنا سکتا ہے ۔ اگر انھیں مناسب رہنمائی اور تربیت کے مواقع ملے تو ہمارے یہ نوعمر ساتھی آگے چل کر آسمانِ اَدب کے ستارے بَن کر چمکیں گے ۔ آنکھ مچولی کو اطمینان ہے کہ ان ادیبوں کو متعارف کرا کے اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے ۔

چلتے چلتے ایک ضروری بات یہ کہ آپ ساتھیوں کو اخبارات سے معلوم ہُوا ہو گا کہ حکومت نے کاغذ پر ڈیوٹی بڑھا دی ہے جس کی وجہ سے کاغذ بہت مہنگا ہو گیا ہے ۔ کاغذ کی مہنگائی اچھّی بات نہیں ہے ۔ خاص طور پر ہم جیسے مُلک میں جہاں پہلے ہی غرُبت اور جہالت ہے ۔ اگر کاغذ کے دام کم نہ ہوئے تو ہم آنکھ مچولی کی قیمت بڑھانے پر مجبور ہوں گے، نہ چاہتے ہوئے بھی ۔ اور یہ اس بات کا امتحان ہو گا کہ آنکھ مچولی سے آپ کو کتنی محبت ہے ؟

آپ کا دوست ظفر محمود شیخ

نیویارک

اب صرف دو منزلوں کی بات

چھ بوئنگ ۷۴۷ ہفتہ وار پروازیں

پی آئی اے واحد ایئرلائن ہے جو آپ کو طیارہ تبدیل کئے بغیر نیویارک تک لے جاتی ہے۔

مزید معلومات کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا پی آئی اے کے قریبی بکنگ آفس سے رابطہ قائم کیجئے۔

PIA - NEW YORK

پاکستان انٹرنیشنل

باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

PID ISLAMABAD

IAL—PIA—30—88

ڈاکیا ڈاک لایا

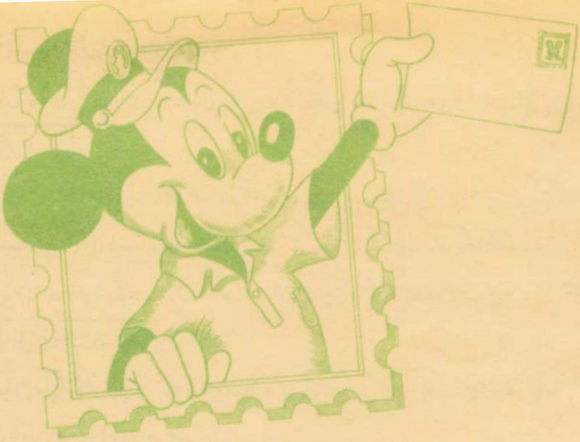

اورنگ زیب، مڈھانڈی، ضلع چکوال۔ آپ ہر ماہ سینکڑوں قارئین کا دل بے دردی سے توڑ دیتے ہیں۔ آج کل مہنگائی کا دور ہے۔ اس بے دردی سے دل نہ توڑیے۔ خطوں کی رسید کا سلسلہ شروع کر دیجیے تاکہ بہت سے قارئین ہر ماہ خوش ہو جایا کریں۔

● آپ نے خط کیا لکھا ہے قلم توڑ دیا ہے اور یہ اتنی مہنگائی میں اتنا مہنگا مشورہ۔ اگر ہم فرداً فرداً خطوں کا جواب دینے لگیں تو بہت جلد مقروض ہو جائیں گے۔ دیکھیے نا لفافہ بھی تو مہنگا ہو گیا ہے۔

فہیم احمد قریشی، واہ کینٹ، راولپنڈی۔ آنکھ مچولی ایک دفعہ خریدا تو پھر بند کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اب تو دکاندار کے پاس جانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود ہی گھر پہنچا دیتا ہے۔ میں اپنی کہانی آپ کو کس طرح بھیجوں؟

● کیوں صاحب کیا دکاندار نے آپ کو دھمکی دے رکھی ہے کہ خبردار جو آنکھ مچولی پڑھنا بند کیا۔ کہانی بھجوانے کا طریقہ یہ ہے کہ ڈاکخانے سے لفافہ خریدیں، اُس میں کہانی رکھیں، لفافہ بند کریں اور اُسے لیٹر بکس میں ڈال دیں۔

شوکت علی بلوچ اور دیگر ساتھی، گوادر۔ آپ نے ہمارے خط کا پہلے بھی جواب نہیں دیا۔ کیا آپ ہم سے اس لیے جلتے ہیں کہ ہم بلوچ ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے علم میں اضافہ نہ ہو ہم پڑھ لکھ کر اچھے افسر نہ بن سکیں۔ اس خط کا جواب نہ ملا تو ہم آئندہ آنکھ مچولی نہیں پڑھیں گے۔

● پیارے دوستو! یہ بلوچ، سندھی، پنجابی، اور مہاجر وغیرہ کیا ہوتا ہے؟ ہمیں نہیں معلوم۔ خدا جانے تم لوگوں کے ذہنوں میں یہ زہر کس نے بھر دیا ہے۔ ہمارے دفتر میں سینکڑوں خطوط آتے ہیں جن کا جواب ہم نہیں دے پاتے۔ لیکن کوئی اس طرح نہیں سوچتا۔ آپ آنکھ مچولی پڑھیں یا نہ پڑھیں، ہمیں کوئی پروا نہیں، لیکن آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ایک معمولی سی بات پر ہم پر یہ جھوٹے الزام لگائیں۔ اور آپ سب ساتھیوں سے ہمیں جو محبت ہے اُس کی توہین کریں۔

شمیم ناز عرف بے بی، فقیر کالونی کراچی۔ آپ کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں اگر میرا آنا ناگوار نہ گزرے تو خوش آمدید کہہ دیں۔ ورنہ قہقہہ نمبر پڑھ کر نہیں ہنسوں گی۔

● خوش آمدید، خوش آمدید، خوش آمدید بے بی!

نائلہ بختیار، کوہاٹ۔ آپ رسالے کی لکھائی پر توجہ دیں۔ کیونکہ یہ بہت باریک ہوتی ہے۔ اس لیے آپی ہمیں رات کو رسالہ بالکل نہیں پڑھنے دیتیں۔

● بھئی نائلہ! اس سے زیادہ بڑی لکھائی تو ممکن نہیں ہے۔ آپ رسالہ پوری روشنی میں پڑھا کیجیے۔ آنکھیں خراب نہیں ہوں گی۔ ہوسکتا ہے آپ کی آپی رسالہ پڑھنے سے اس لیے منع کرتی ہوں کہ آپ کے اسکول کی پڑھائی کا نقصان ہوتا ہو۔

واجد محمود عباسی، راولپنڈی۔ جون کے شمارے میں "ڈکٹیٹر کا انجام" ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ ہٹلر کی کہانی دینے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بچوں کا رسالہ ہے۔ خیال رکھیں۔

● بھیا! بچوں کو ڈکٹیٹروں کا انجام بتانا بہت ضروری ہے تاکہ کوئی بچہ بڑا ہو کر ڈکٹیٹر بننے کی کوشش نہ کرے۔ ہٹلر کو اگر ڈکٹیٹروں کا انجام معلوم ہوتا تو وہ کبھی ہٹلر نہ بنتا۔

عمر فاروق گل برلیجہ (شہر کا نام نہیں لکھا) آپ کا رسالہ بچوں کو پریوں اور جنوں کی کہانیوں سے نکال کر حقیقت کا رُخ دکھا رہا ہے۔ اسی لیے مجھے اچھا لگتا ہے۔ البتہ نظمیں متاثر نہیں کرتیں۔

● نظمیں آپ کو کیوں اچھی نہیں لگتیں؟ آپ کو کیسی نظمیں پسند ہیں؟ کیا آپ خود نظمیں کہتی ہیں؟ اگر کہتی ہیں تو ہمیں اپنی نظم بھیجیے تاکہ یہ پتا چل سکے کہ آپ اچھی نظم کیسے کہتی ہیں۔

ایم وسیم برلس، سانگھڑ۔ رسالے میں ایک سلسلہ 'فن پارے' بھی شروع کیجیے، جس میں چھوٹے بچے اپنی ڈرائنگ کے جوہر دکھائیں۔

● 'فن پارے' کا مشورہ نہایت فنکارانہ ہے۔ پسند آیا، لیکن اس میں کوئی جدّت ہونی چاہیے۔ وہ جدت یا نیاپن کیا ہو؟ آپ ہی سوچ کر بتائیے۔

ملک فضل ربی راھی اعوان، میوہ شاہ کراچی۔ قہقہہ نمبر ۲ کا سُن کر قہقہہ نمبر ا یاد آگیا۔ میرے لبوں پر بے اختیار مُسکراہٹ آگئی اور پھر قہقہوں کا نہ رُکنے والا طوفان اور ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں سوچنے لگا کہ اس کا نام "ہنسنا رُلانا" نمبر ہونا چاہیے۔ کیسے پسند آئی ہماری تجویز۔

● آپ کا خط پڑھ کر ہم پہلے ہنسے اور پھر رو پڑے۔ ہنسے اس لیے کہ تجویز مزیدار ہے اور روئے اس لیے کہ اب قہقہہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے، آپ کی تجویز پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اور ہاں ایک لفافے میں ایک سے زیادہ تحریریں بھیجی جاسکتی ہیں۔

سیّد اصغر علی شاہ بخاری، لانڈھی کراچی۔ آپ کم ازکم اتنا تو بتا دیجیے کہ میری کوئی تحریر آنکھ مچولی میں شائع نہیں ہوسکتی۔ تاکہ میں اپنی نگارشات وغیرہ بھیجنا بند کردوں۔ اگر آپ نے میرا خط شائع نہیں کیا تو میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ بھینس کے آگے بین بجانا فضول ہے۔

● بخاری بھائی! آپ نے بڑا پرانا محاورہ استعمال کیا ہے جدید تحقیق یہ ہے کہ اچھی موسیقی سُن کر بھینس زیادہ دُودھ دیتی ہے۔ آپ کی نگارشات سے ہمیں خدانخواستہ دشمنی تو نہیں۔ اچھی ہوں گی تو ضرور چھپیں گی۔ اچھا چلیے، اب غصّہ تھوک دیجیے۔

ایم مظہر ولایت، جمیورانوالی، گجرات:۔ آنکھ مچولی کا ایک "تحفہ نمبر" نکالیے جسے ہم تحفہ سمجھ کر پڑھیں اور لطف بھی اُٹھائیں۔

● آنکھ مچولی کا ہر شمارہ ساتھیوں کے لیے ایک تحفہ ہی تو ہوتا ہے، پھر اُس تحفے کے ساتھ بھی ایک تحفہ ہم اکثر دیتے ہیں۔ اب اور کتنے تحفے چاہئیں؟

عدنان فاروقی۔ کراچی:۔ انکل! یہ خط میں غصّے سے لکھ رہا ہوں۔ جنوری سے لے کر اب تک یہ میرا دسواں خط ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ مضمون اور اس خط کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیں اور ہاں میری کہانی اور لطیفوں کا کیا بنا؟

● بہت خوب تو کیا آپ کی کہانی اور لطیفے ردّی کی ٹوکری میں نہ پھینکے جائیں۔ اصل میں عدنان میاں! جتنے خطوط ہمیں ملتے ہیں اُن سب کا جواب دینا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہوتا۔ ہماری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ خفا ہو کر اچھے نہیں لگتے۔

رشیدہ ناز، دھابے جی، کراچی:۔ میرا بھائی "آنکھ مچولی" اپنے دوست سے لے کر آیا، لیکن میں نے اُسے نہیں پڑھا۔ ایک رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ جب میں نے یہ رسالہ اُٹھایا تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ اتنا اچھا رسالہ ہو سکتا ہے۔ اگلی صبح میں نے پورے دو ماہ سے جمع کیے ہوئے سات روپے دے کر بھائی سے آنکھ مچولی منگوایا۔ اُسی رات میں نے ایک کہانی لکھی۔ میں ہر مہینے آنکھ مچولی نہیں خرید سکتی۔ آپ بتا دیجیے کہ میری کہانی چھپ سکتی ہے یا نہیں۔؟

● رشیدہ ناز بہن! تمہارے شوق نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ خدا تمہارا حوصلہ قائم رکھے۔ کہانی پڑھ کر تمہیں مطلع کر دیا جائے گا۔

ملک شاھد ندیم، فیصل آباد۔ ایک کہانی "پاگل" بھیج رہا ہوں۔ قہقہہ نمبر، کے لیے نہایت موزوں رہے گی۔ میری کہانیاں دوسرے رسالوں میں چھپ چکی ہیں اور انعامات بھی مل چکے ہیں۔

● آپ کی کہانی پڑھ کر ہم پاگل ہوتے ہوتے بچے۔ شکر کیجیے کہ پوری کہانی پڑھنے سے پہلے ہی ہمیں بچا لیا گیا۔ ایسی خطرناک کہانی ہم اپنے قارئین کو کیسے پڑھوا سکتے ہیں۔ ویسے چپکے سے سُن لیجیے کہ یہ کہانی ہم پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔

آسیہ عمر خان، نوشہرہ کینٹ:۔ میں نے "میری ڈائری" کے لیے اپنی تحریر بھیجی تھی، لیکن شائع نہیں ہوئی۔ کیا رشوت بھیجنی پڑے گی؟

● رشوت دینے کے لیے کہیں اجازت لینی پڑتی ہے؟ بُرائی اور پوچھ پوچھ۔ بھئی بات یہ ہے کہ "میری ڈائری" کے لیے کوئی بہت اچھا سا اقتباس یا تحریر بھیجیے۔ ایسی تحریر کے پڑھتے ہی جی خوش ہو جائے اور ہم اُسے فوراً چھاپ دیں۔

رقیہ آرزو، کوئٹہ:۔ کچھ دنوں کی غیر حاضری کے بعد پھر حاضر ہوں۔ میری مصروفیتیں ایک لمحے کے لیے بھی دامن نہیں چھوڑتیں۔ کوئٹہ کے اخبارات، رسائل اور ریڈیو پروگراموں کے لیے لکھتی رہتی ہوں۔ پھر بھی میں آپ سے زندگی بھر نہیں پوچھوں گی کہ آپ لوگ میری تحریروں کا کیا کرتے ہیں؟

● رقیہ بہن! آپ کا خط ستاروں، پھولوں اور شعروں سے سجا ہوا ہے۔ جتنی محنت آپ ظاہری چیزوں پر کرتی ہیں۔ اگر اس کی آدھی محنت بھی مضمون کے معیار پر کر لیں تو آپ کو ہم سے کبھی شکایت نہ ہو۔

سعدیہ اسلم، (شہر کا نام نہیں لکھا) قہقہہ نمبر کے لیے نظم "فیشن ایبل لڑکی" بھیج رہی ہوں ۔ اسے ضرور شائع کر دیجیے گا !"

● عر " آج چڑیوں کا گھونسلا ۔ ایک لڑکی نے سر پہ سجایا ۔ معلوم نہیں چڑیا کا ہے یا بُلبل کا ہے وگھونسلا"
سعدیہ ! تمہاری یہ نظم پڑھ کر فیشن ایبل بہنیں ناراض ہو جائیں گی ۔ ویسے بھی اس نظم میں وزن نہیں ہے ۔

سیف اللہ اعوان، ٹوبہ ٹیک سنگھ ۔ چچا ایڈیٹر صاحب ! جون کا آنکھ مچولی کافی دیر سے ملا ۔ یہ میں آپ سے گلہ نہیں کر رہا ۔ آپ نے تو اُسے وقت پر ہی ڈاک خانے والوں کے سپرد کر دیا تھا ۔ مصیبت یہ ہے کہ ہمارے پوسٹ مین صاحب کے بچّوں کو بھی آنکھ مچولی بہت پسند ہے ۔ رسالے کے پیکیٹ پر ایک کے بجائے دو یا تین جگہ پتیں لگا دیا کیجیے اور ماہِ رواں کی بات ، اسی موضوع پر لکھ دیجیے ۔

● پیارے بھتیجے صاحب ! کیا ہی اچھا ہو کہ آپ پہلے تحقیق کر لیجیے ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ جس پوسٹ مین پر الزام لگا رہے ہوں اُس کے سرے سے بچے ہی نہ ہوں ۔ ڈاک میں کسی وجہ سے بھی دیر ہو سکتی ہے ۔ اس کی شکایت آپ محکمہ ڈاک سے کیجیے ۔

عمران خان، ملتان ۔ ایک بچّے نے اپنے ایک من پسند رسالے کو خط لکھا کہ پیارے انکل ! مجھے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ دنیا نے اب تک اتنی ترقی کر لی ہے مگر آپ کے رسالے نے کوئی ترقی نہیں کی جواب دیجیے ۔ اگلے مہینے سوال کے جواب میں رسالے کی قیمت پانچ روپے سے دس روپے ہو گئی ۔ آپ کیا سمجھے !

● ہم یہ سمجھے کہ جب رسالے کی قیمت بڑھے گی تو وہی بچہ خط لکھے گا ۔ پیارے انکل ! کیا آپ کو معلوم ہے کہ قیامت کی کون کون سی نشانیاں ہیں ۔ ایک نشانی یہ ہے کہ رسالوں کی قیمتیں اتنی بڑھ جائیں گی کہ بچے اُنہیں خرید نہیں سکیں گے ۔

لیجیے پٹاری کھلتی ہے

آنکھ مچولی نے اپنے قلمکار ساتھیوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لئے چند ماہ قبل ایک مقابلۂ تحریر کا اعلان کیا تھا۔ اِس مقابلے میں پانچ موضوعات پر مضامین لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ساتھیوں نے اِس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ہمیں بے شمار مضامین، کہانیاں، سفرنامے، سچی آپ بیتیاں اور طنزیہ و مزاحیہ تحریریں موصول ہوئیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ہمیں مجبوراً نتائج کا اعلان قسطوں میں کرنا پڑ رہا ہے۔ یوں تو مضامین کے انبار میں فیصلہ کرنا ہی ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ سو ہم نے یہ طریقہ کار نکالا کہ ہر موضوع کے تمام مضامین کا مطالعہ کر کے ان میں اِیسے مضامین کا انتخاب کر لیا جو مقابلے میں شریک ہو سکتے تھے۔ اِس ماہ سے ہم مقابلے کے نتائج کا اعلان شروع کر رہے ہیں۔

اگلے ماہ ہم "سچی آپ بیتیاں" کا فیصلہ آپ تک پہنچائیں گے۔ جبکہ اس مہینے کھلنے والی پٹاری میں "طنز و مزاح" کے موضوع پر کہانی یا مضمون کا نتیجہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ جب بجلی چلی جاتی ہے	ساجد قمر (راولپنڈی)	پہلا انعام
۲۔ ڈاکٹر وکیسٹن سے ملاقات	نبیل مختار صدیقی (دادو)	دوسرا انعام
۳۔ مضمون لکھنے کے ۴۲۰ طریقے	عمر شریف (گجرات)	تیسرا انعام
۴۔ یس ریڈی پلیز	ابن آدم پیفری (سیالکوٹ	خصوصی انعام
۵۔ مجھے بھی میرے دوستوں سے بچاؤ	محمد نوید مرزا (لاہور)	خصوصی انعام
۶۔ بانا بارغ تاتاشا	وفا علاؤ الدین شیخ (کراچی)	خصوصی انعام
۷۔ پھکڑا میل	انور کلیم بلوچ (لاڑکانہ)	خصوصی انعام

نوٹ: یہ تمام مضامین اور کہانیاں "قہقہہ نمبر" میں شامل ہیں

ادارہ آنکھ مچولی تمام انعام یافتگان کو دلی مُبارک باد پیش کرتا ہے۔

انعام یافتگان سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے شناختی کارڈ کی نقل ارسال کر دیں اور ساتھ ہی ایک حلف نامہ بھی جس میں اس کی یقین دہانی کرائی جائے کہ ان کا مضمون (الف) طبعزاد ہے۔ (ب) اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوا۔

اسٹیٹ لائف کا

جیون ساتھی منصوبہ

ایک بیمہ پالیسی ـــ دو زندگیوں کا بیمہ

جیون ساتھی منصوبہ شادی شدہ جوڑوں کیلئے موزوں ترین مالی تحفظ ہے۔ یہ منصوبہ دونوں زندگیوں پر بیک وقت جاری کیا جاتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ موت درمیان آئے۔ اگر ایسا ہو تو بیمہ کی رقم دو بار ادا کی جائے گی۔

- ایک بار ایک ساتھی کے المیہ پر دوسرے ساتھی کو بیمے کی رقم ادا کر دی جائے گی اور پالیسی مزید پریمیم ادا کئے بغیر دوسرے ساتھی کی زندگی پر پورے زرِ بیمہ کے ساتھ جاری رہے گی۔
- دوسری بار میعاد پوری ہونے پر جمع شدہ بونس کے ساتھ زرِ بیمہ کی ادائیگی، یا میعاد کے دوران دوسرے ساتھی کے المیہ پر بیمہ کی پوری رقم جمع شدہ بونس کیساتھ اس کے نامزد ورثا کو ادا کی جائے گی۔

جیون ساتھی منصوبہ ایسے دو افراد بھی لے سکتے ہیں جن کا ایک دوسرے پر مالی انحصار ہو، مثلاً بزنس پارٹنر وغیرہ۔

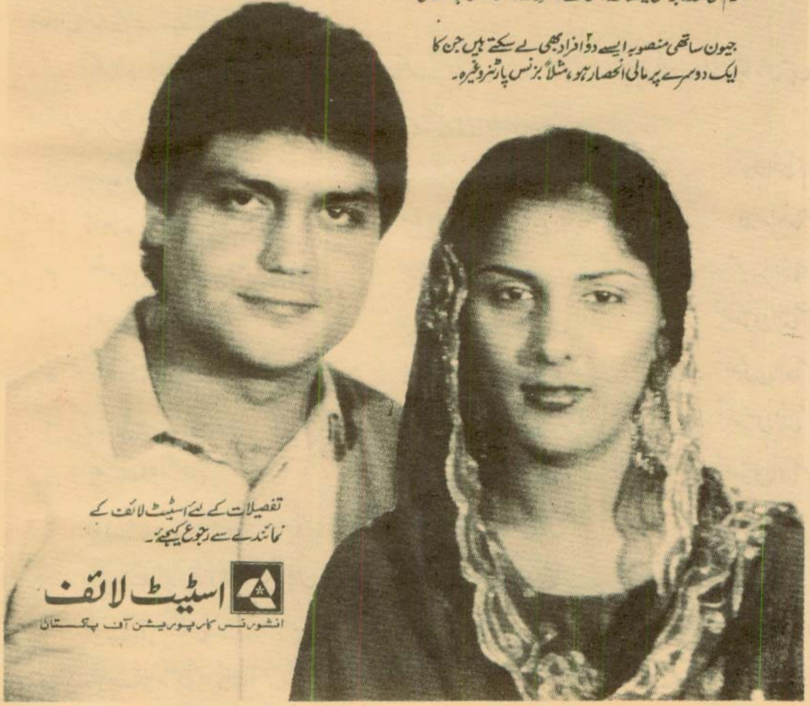

تفصیلات کے لیے اسٹیٹ لائف کے نمائندے سے رجوع کیجیے۔

اسٹیٹ لائف
انشورنس کارپوریشن آف پاکستان

UNITED PID-I 6/89

مزاح نگاروں کے واقعات

مشہور مزاح نگاروں کے چند واقعات

انتخاب:۔ راشدہ علی محمّد، کراچی

انسان اور گدھا

ھم نے پچھلی بار جاپان سے آکر لکھا تھا کہ "ضرورت ہے، جاپان کے لیے ایک گدھے کی۔" اس پر بہت سے خط آئے کہ ہم بالکل گدھے ہیں، ہمیں جاپان بھجوا دیجئے۔ ہمیں وضاحت کرنا پڑی کہ صاحبو! گدھے مت بنو۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہاں تمہاری نہیں، بلکہ سچ مچ کے گدھے یعنی جانور کی ضرورت ہے، چڑیا گھر کے لیے۔ جاپانیوں کا خیال تھا کہ جاپانی بچے چڑیا گھر میں گدھا دیکھیں گے اور ان کو معلوم ہوگا کہ یہ پاکستان سے آیا ہے تو وہ اس رشتے سے پاکستان سے بھی متعارف ہوں گے اور پاک جاپان دوستی کا راستہ کھُلے گا۔ (ابنِ انشاء)

قبلِ مسیح کا جھگڑا

سنہ عیسوی سے کہیں زیادہ مشکل اُن تاریخوں کا یاد رکھنا ہے، جن میں قبل مسیح آتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں مؤرخین گردشِ ایّام کو پیچھے کی طرف دوڑاتے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ذہنی شیرش آسن کرنا پڑتا ہے جو اتنا ہی مشکل ہے، جتنا اُلٹے پہاڑے سُنانا۔ اس کو طالب علموں کی خوش قسمتی کہیئے کہ تاریخ قبلِ مسیح نسبتاً مختصر اور ادھوری ہے۔ اگرچہ مؤرخین کوشاں ہیں کہ جوہرِ تحقیق سے، بے زبان بچوّں کی مشکلات میں اضافہ کریں۔ بھولے بھالے بچوّں کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ روم کی داغ بیل ۷۵۳ قبلِ مسیح میں پڑی تو

وہ ننّھے مُنّے ہاتھ اُٹھا کر سوال کرتے ہیں کہ اُس زمانے کے لوگوں کو یہ پتا کیسے چل گیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہونے میں ۵۳، رسال باقی ہیں۔ اُن کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ ۵۳، رقبلِ مسیح کو ساتویں صدی شمار کریں یا آٹھویں۔ عقل مند اُستاد ان جاہلانہ سوالات کا جواب عموماً خاموشی سے دیتے ہیں۔ آگے چل کر یہی بچّے جب پڑھتے ہیں کہ سکندر ۳۵۶ رقبلِ مسیح میں پیدا ہوا۔ اور ۳۲۳ رقبلِ مسیح میں فوت ہُوا تو وہ اِسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے اُستاد سے پُوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرا؟ اُستاد جواب دیتا ہے کہ پیارے بچّو! اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرتے تھے۔ (مشتاق احمد یوسفی)

بدر اور دربدر

مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کی باتیں بہت دلچسپ اور بے ساختہ ہوتی تھیں: "ایک بار دہلی کی ایک محفل میں مشہور شاعر بشیر بدر کو کلام سُنانے کے لیے بُلایا گیا، تو بیدی صاحب نے، جو میرے برابر بیٹھے تھے، اچانک میرے کان میں کہا: "ہم نے دربدر، مُلک بدر، اور شہر بدر تو سُنا تھا۔ یہ بشیر بدر کیا ہوتا ہے؟" میں نے زور سے قہقہہ لگایا تو اچانک یوں سنجیدہ بن گئے، جیسے اُنھوں نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔" (مجتبیٰ حسین، بھارت)

لڑکی والے

رشید احمد صدّیقی اُن دِنوں مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اُردو کے صدر تھے۔ مقامی گرلز کالج کی پرنسپل ممتاز حیدر نے رشید صاحب سے کہا: "میرے کالج کی لڑکیاں یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ کوئی مناسب وقت اور تاریخ بتا دیں تاکہ سہولت رہے۔" رشید احمد صدیقی نے مُسکراتے ہوئے کہا: "وقت اور تاریخ لڑکی والے ہی طے کرتے ہیں۔"

ہے گا، ماسی مصیبتے اور انکل سرگم

کے خالق فاروق قیصر سے دلچسپ انٹرویو

آنکھ مچولی کے آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

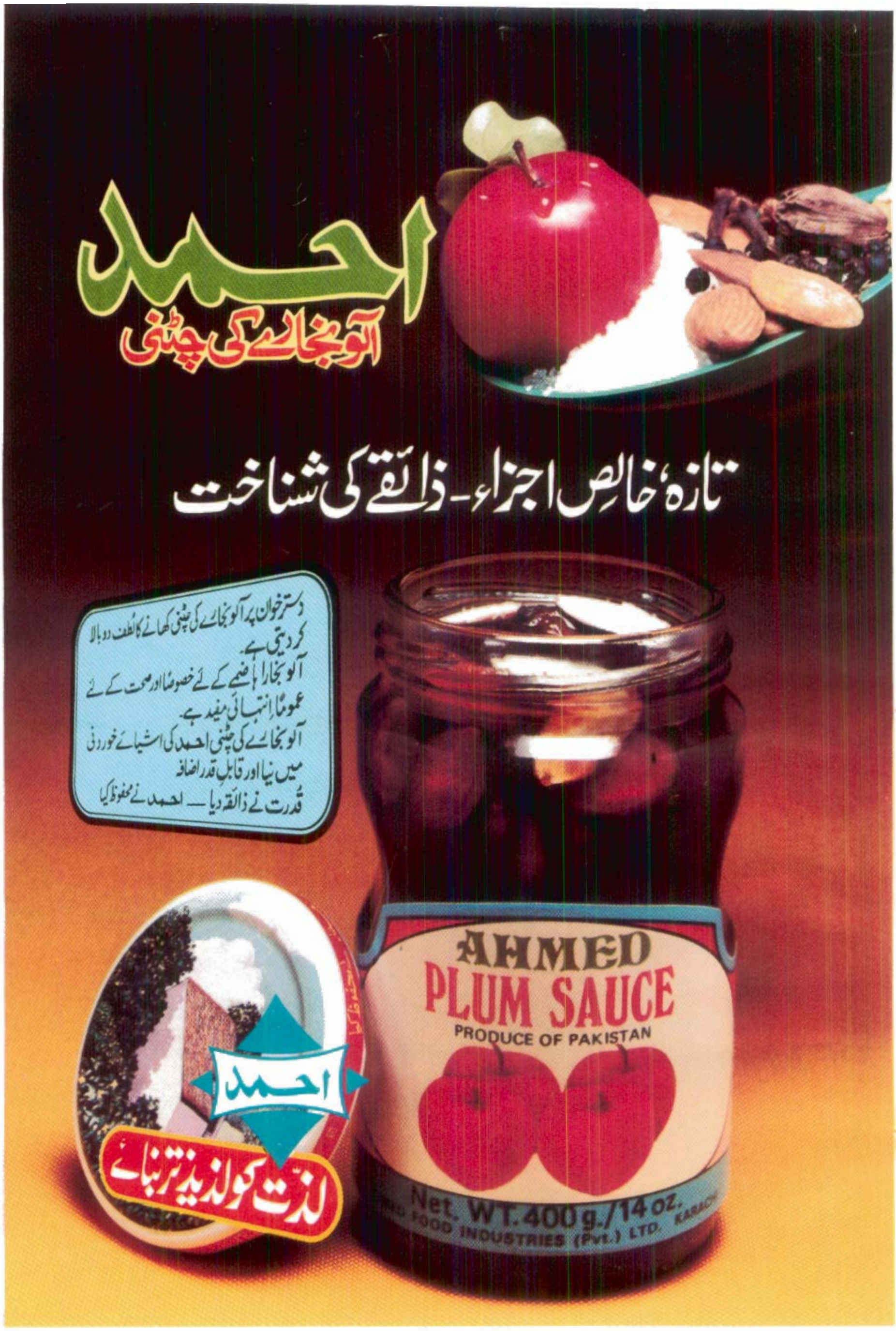
احمد
آلو بخارے کی چٹنی
تازہ، خالص اجزاء۔ ذائقے کی شناخت
دسترخوان پر آلو بخارے کی چٹنی کھانے کا لُطف دو بالا کر دیتی ہے۔
آلو بخارا ہاضمے کے لئے خصوصًا اور صحت کے لئے عمومًا انتہائی مفید ہے۔
آلو بخارے کی چٹنی احمد کی اشیائے خوردنی میں نیا اور قابلِ قدر اضافہ
قُدرت نے ذائقہ دیا — احمد نے محفوظ کیا
احمد
لذت کو لذیذ تر بنائے
AHMED
PLUM SAUCE
PRODUCE OF PAKISTAN
Net. WT. 400 g./14 oz.
INDUSTRIES (Pvt.) LTD.

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں !
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend
Net weight when packed
200 grams
ٹپال چائے
دانےدار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار، گہری رنگت، یادگار لذّت، ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین
MASS

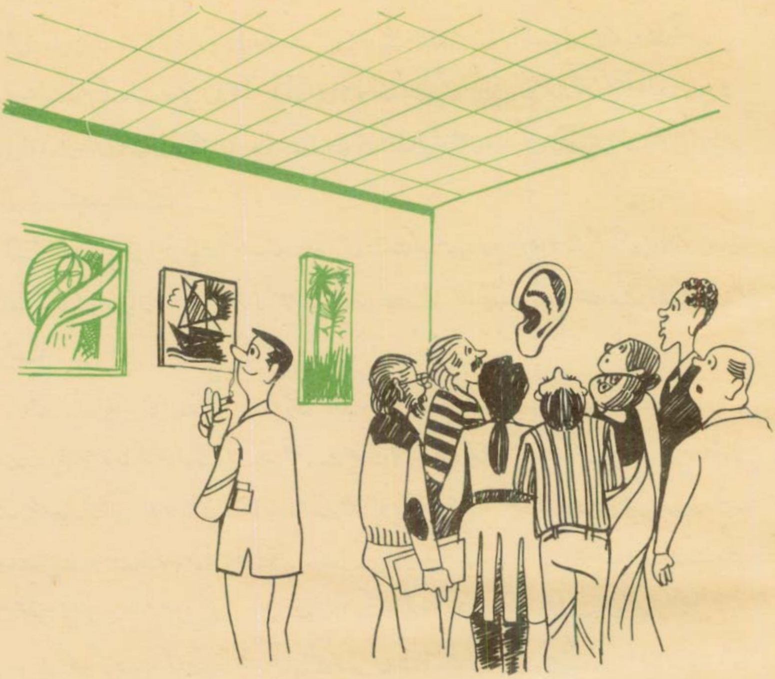

دلچسپ شرارتیں

صالح ارشاد

شرارت کے لیے بھی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے وقوف بچّے اچھے شرارتی نہیں ہو سکتے۔ شرارت کی ایک قسم تو وہ ہوتی ہے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے مثلاً غلیل سے چڑیا کو مارنا، کسی کا شیشہ توڑ دینا یا کوئی نقصان کر دینا۔ یہ شرارت نہیں بدتمیزی ہے۔ اصلی شرارت تو وہ ہوتی ہے جس سے سب لوگ لطف اندوز ہوں۔

اور شرارت کرنے والوں کو داد دیں کہ واہ بھئی مان گئے ۔ آج ہم آپ کی ملاقات ایسے ہی ایک صاحب سے کراتے ہیں جو مغربی دُنیا میں صرف اپنی شرارتوں کی وجہ سے مشہور ہوئے ۔ ان صاحب کو شرارت کرنے کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے ۔ ان کا نام ہگ ٹرائے Hugh Troy تھا ۔ ان کے لطیفوں اور شرارتوں کی مقبولیت اور پسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے انتقال کو بیس سال گزر گئے ہیں اور وہ آج بھی ایسے ہی مقبول ہیں جیسے پہلے تھے ۔

ٹرائے نے اپنا پہلا مذاق اپنے اُستاد سے اُس وقت کیا جب وہ ۱۹۲۰ء میں کورنیل یونیورسٹی نیویارک میں پڑھا کرتے تھے ۔ یہاں ٹرائے مصوّری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے ۔ ٹرائے کے ایک اُستاد تھے ۔ جن کا نام پروفیسر مارٹن تھا ۔

پروفیسر مارٹن ایک دن اپنے شاگردوں کو نچلی منزل پر واقع کلاس روم میں لیکچر دے رہے تھے ۔ لیکچر کے دوران چھت پر سے پلاسٹر ٹوٹ کر کلاس میں گرا ۔ پروفیسر نے چھت کو گھور کر دیکھا اور ایک دم آگ بگولہ ہو گئے ۔ وہ انتہائی غصّے میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے اور کلاس روم کے عین اوپر واقع کمرے میں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ ٹرائے صاحب مزے سے اپنے دوستوں کے ساتھ اُچھل کود کر رہے ہیں ۔ پروفیسر صاحب نے لڑکوں کو ڈانٹ پلائی اور کہنے لگے ۔

"احمقو ! کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ عمارت پُرانی ہے اور تم لوگ اسے کھیل کا میدان سمجھ کر اُچھل کود رہے ہو ۔ یاد رکھو اگر چھت کو کوئی بڑا نقصان پہنچے گا تو اس کے ذمّے دار تم لوگ ہو گے اور اس کا ہرجانہ بھی تم لوگوں کو بھرنا پڑے گا ۔"

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب چلے گئے ۔ ٹرائے نے پروفیسر صاحب کے ساتھ مذاق کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اس نے ایک بڑا سا کینوس لے کر اس پر کالے رنگ سے ایک دائرہ بنایا جو دُور سے دیکھنے پر ایسا لگتا تھا جیسے کینوس میں سوراخ ہو گیا ہو ۔ پھر اُس نے سوراخ کے اِردگرد پلاسٹر کے ٹکڑے چپکا دیے ۔ رات کو ٹرائے کے ساتھیوں نے پروفیسر صاحب کے لیکچر روم کی چھت سے کینوس لگا دیا ۔ چونکہ کینوس سفید ہوتا ہے ۔ اس لیے ایسا لگتا تھا جیسے سفید چھت میں سوراخ ہو گیا ہو ۔ فرش پر ان لوگوں نے پلاسٹر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بکھیر دیے ۔

اگلے دن جب پروفیسر صاحب کلاس میں آئے تو ٹوٹی ہوئی چھت دیکھ کر بہت غصّے ہوئے اور سیدھے ٹرائے اور اس کے ساتھیوں کے پاس پہنچے اور کہا "آخر وہی ہُوا ۔ تمہاری شرارتوں سے چھت ٹوٹ گئی ۔ اب تم لوگ نقصان بھرنے کے لیے تیار رہو ۔" یہ کہہ کر وہ اپنے آفس میں چلے گئے ۔ ٹرائے نے دو لڑکے پروفیسر صاحب کے دروازے پر کھڑے کر دیے تاکہ اگر پروفیسر صاحب باہر نکلیں تو وہ انہیں باتوں میں اُلجھا لیں ۔ پھر ٹرائے اور اس کے ساتھیوں

نے کمرے کی چھت پر سے کینوس اُتار لیا۔ اور فرش پر موجود تمام پلاسٹر کے ٹکڑے سمیٹ کر فرش صاف کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد پروفیسر صاحب مارٹن پرنسپل کے ساتھ لڑکوں کے پاس آئے اور انہیں لیکچر روم میں چلنے کے لیے کہا، جب سب لوگ لیکچر روم میں پہنچے اور پروفیسر صاحب نے پرنسپل کو انگلی اُٹھا کر چھت کا سوراخ دکھانا چاہا تو وہاں سوراخ غائب تھا۔ پروفیسر صاحب حیران و پریشان کھڑے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد ٹرائے نے ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ٹرائے نے ایک بڑا عجیب و غریب مذاق کیا جس سے وہ بہت مشہور ہوا۔ میوزیم آف ماڈرن آرٹ میں VAN GOGH نامی مصور کی تصاویر کی نمائش ہوئی۔ دان گو ایک عظیم مصور تھا۔ دنیا کی مہنگی ترین تصویر بنانے کا اعزاز وان گو کو ہی حاصل ہے۔ پینٹنگ کا نام "سورج مکھی SUNFLOWER تھا" یہ پینٹنگ ۱۹۸۶ء میں ۲۵ لاکھ پونڈ میں فروخت ہوئی تھی۔

وان گو اپنی عجیب و غریب حرکات کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ مثلاً ایک دفعہ انہوں نے اپنا کان کاٹ کر ایک لڑکی کو بھیج دیا تھا۔

آرٹسٹ ہونے کی وجہ سے ٹرائے صاحب نمائش دیکھنے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب تھے، لیکن رش اس قدر زیادہ تھا کہ تصویروں کو اطمینان سے دیکھنا ناممکن تھا۔ اور ٹرائے ہر تصویر کو اطمینان سے دیکھنا چاہتا تھا۔

ٹرائے کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے گائے کے سوکھے ہوئے گوشت سے ایک انسانی کان بنایا جو دیکھنے میں بالکل اصلی لگ رہا تھا۔ کان کو اُس نے ایک شیشے کے ڈبے میں مخمل پر رکھا اور ڈبہ بند کر دیا۔ اس کان کے ساتھ ہی ایک کارڈ پر یہ وضاحتی جملہ درج تھا۔

"یہ وہ کان ہے جو وان گو نے ۲۴ دسمبر ۱۸۸۸ء کو ایک لڑکی کو بھیجا تھا"

اگلے دن وہ ڈبہ لے کر میوزیم پہنچ گیا۔ ڈبے کو اُس نے ایک جگہ لٹکا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس ڈبے کے گرد لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔ ہر شخص وان گو کا کان دیکھنا چاہتا تھا۔ تصویروں کے گرد ہجوم ختم ہو گیا۔ ٹرائے صاحب نے آرام سے تصویریں دیکھیں اور گھر چلے آئے۔

اس قسم کی کتنی ہی شرارتیں ٹرائے نے اپنی زندگی میں کیں اور خوب داد حاصل کی۔ آپ بھی اسی قسم کی صحت مند شرارتیں کیجیے۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہیں وقت بھی خوب ہے۔ بس ذرا عقل لڑانے کی ضرورت ہے۔

پاکستان بھر میں آنکھ مچولی کے نیوز ایجنٹ

علم وادب کے فروغ میں جو ادارے" آنکھ مچولی "سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے -

محمد حسین برادرز - کراچی	فون:- ۷۲۳۹۵۵
سلطان نیوز ایجنسی - لاہور	فون:- ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد صاحب - راولپنڈی	فون:- ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶
مہران نیوز ایجنسی - حیدر آباد	فون:- ۲-۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی - چوک یادگار - پشاور	فون:- ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱
اے ایس حامد نیوز پیپر ورکرس - ملتان	فون:- ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷
فیاض بک ڈپو - فیصل آباد	فون:- ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز - کوئٹہ	فون:- ۷۵۰۰۲
ملک اینڈ سنز - سیالکوٹ	فون:- ۸۷۹۸۹

سعید بک اسٹال - گجرات	فون:- ۰۴۳۳۱
پاکستان اسٹینڈرڈ بک سٹال - سرگودھا	فون:- ۶۲۹۵۱
کیپٹل نیوز ایجنسی - بہاولپور	فون:- ۲۹۵۷
طاہر نیوز ایجنسی - جہلم	فون:- ۰۵۹۴۱
چوہدری امانت علی اینڈ سنز - رحیم یار خان	فون:- ۲۶۲۶
وہاڑی نیوز ایجنسی - ریل بازار - وہاڑی	
اسلم نیوز ایجنسی - اخبار گھر - گوجرانوالہ	
اشرف نیوز ایجنسی - بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ - اوکاڑہ	
نیا مکتبہ اردو - جی ٹی روڈ - سرائے عالمگیر	

سلمان برادرز - نوابشاہ — فون:- ۲۴۱۴

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھیے!

سرکولیشن مینجر - ماہنامہ "آنکھ مچولی" ڈی - ۱۱۲ - نورس روڈ - سائٹ - کراچی ۱۶

ایک تھا بادشاہ

حفیظ جالندھری

کسی شہر میں ایک تھا بادشاہ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ
مگر بادشاہ تھا بہت ہی غریب نہ آتا تھا کوئی بھی اُس کے قریب

بادشاہ اور غریب - سب بچّے سوچنے لگے کہ بادشاہ غریب بھی ہو سکتا ہے یا نہیں - شاید ہوتا ہو اگلے زمانے میں -

کیے ایک دن جمع اُس نے فقیر کھلائی اُنہیں سونے چاندی کی کھیر
فقیروں کو پھر جیب میں رکھ لیا امیروں وزیروں سے اپنے کہا
کہ آؤ چلو آج کھیلیں شکار قلم اور کاغذ کی دیکھیں بہار
مگر ہے سمندر کا میدان تنگ کرے کس طرح کوئی مچھر سے جنگ
تو چڑیا یہ بولی کہ اے بادشاہ کروں گی میں اپنے چڑے کا بیاہ
مگر مچھ کو گھر میں بلاؤں گی میں سمندر میں ہرگز نہ جاؤں گی میں

ابّاجان نے ابھی اتنی ہی کہانی سُنائی تھی کہ سب حیران ہو ہو کر ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ بھائی جان سے نہ رہا گیا - کہنے لگے یہ تو عجیب بے معنی کہانی ہے، جس کا سر نہ پیر - ابّاجان بولے کیوں بھئی کون سی مشکل بات ہے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی - منجھلے بھائی نے کہا سمجھ میں تو آتی ہے - مگر پتا نہیں چلتا - یہ سُن کر سب ہنس پڑے - خُوب بھئی خُوب سمجھ میں آتی ہے اور پتا نہیں چلتا - آپا نے کہا ابّاجان بادشاہ غریب تھا تو اُس نے فقیروں کو بُلا کر سو نے چاندی کی کھیر کیسے کھلائی - اور پھر اُن کو جیب میں کیسے رکھ لیا - مزا یہ کہ بادشاہ کے پاس کوئی آتا بھی نہیں تھا - یہ امیر وزیر کہاں سے آگئے، شکار میں، قلم اور کاغذ کی بہار کا مطلب کیا ہے اور پھر لطف یہ کہ سمندر کا میدان اور الیساتنگ کہ وہاں مچھّر سے جنگ نہیں ہو سکتی - پھر بیچ میں یہ چڑیا جی کہاں سے کود پڑیں - جو اپنے چڑے کا بیاہ کرنے والی ہیں - مگر مچھ کو اپنے گھونسلے میں بلاتی ہیں اور سمندر میں جانا نہیں چاہتیں - ننّھی بولی تو یہ تو ابّاجان نے تو بکھیڑا نکال دیا - ایسی اچھی کہانی ابّاجان کہہ رہے ہیں - میری سمجھ میں تو سب کچھ آتا ہے - سنایئے، ابّاجان پھر کیا ہوُا ابّاجان نے کہا - بس ننّھی میری باتوں کو سمجھتی ہے - ہو تا گیا -

سُنی بات چڑیا کی گھوڑے نے جب
وہ بولا یہ کیا کر رہی ہے غضب
مرے پاس دال اور آٹا نہیں
مجھے دال آٹے کا گھاٹا نہیں
یہ سُنتے ہی کُرسی سے بنیا اُٹھا
کیا وار اُٹھتے ہی تلوار کا
وہیں ایک مکھی کا پَر کٹ گیا
جُلاہے کا ہاتھی پرے ہٹ گیا

یہاں سب بچّے اتنا ہنسے کہ ہنسی بند ہونے میں نہ آتی تھی لیکن بھائی جان نے پھر اعتراض کیا۔ یہ کہانی تو کچھ اُول جلُول سی ہے - منجھلے بھائی نے کہا بھئی اب تو کچھ مزا آنے لگا - ننّھی نے کہا خاک مزا آتا ہے - تم تو سب کہانی کو بیچ میں کاٹ دیتے ہو - ہاں ابّاجی جُلاہے کا ہاتھی ڈر کر پرے ہٹ گیا - تو پھر کیا ہوا - ابّا نے کہا ننّھی اب بڑا تماشا ہوا -

مچایا جو گیہوں کے انڈوں نے شور

کس کے انڈوں نے - گیہوں کے ؟ تو کیا گیہوں کے بھی انڈے ہوتے ہیں - بھئی مجھے کیا معلوم کہانی بنانے والے نے یہی لکھا ہے - یہ کہانی کس نے بنائی ہے ؟ حفیظ صاحب نے : آہا اب میں سمجھا اب

میں سمجھا۔

مچایا جو گیہوں کے انڈوں نے شور — لگا ناچنے سانپ کی دُم پہ مور
کھڑا تھا وہیں پاس ہی ایک شیر — بہت سارے تھے اُس کی جھولی میں بیر
کریلا بجانے لگا اُٹھ کے بین — لیے شیر سے بیر چُہیا نے چھین

چُہیا نے شیر سے بیر چھین لیے۔جی ہاں، بڑی زبردست چُہیا تھی۔اب بچّوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ابّاجان ہماری سمجھ آزمانے کے لیے کہانی کہہ رہے ہیں۔امّاں جان بھی ہنستی ہوئی بولیں اور تو خیر یہ کریلے نے بین اچّھی بجائی، ننھی بہت خفا ہو رہی تھی سلسلہ ٹوٹتا تھا تو اُس کو بُرا معلوم ہوتا تھا۔ابّا جی کہیے کہیے آگے کہیے۔ابّاجان نے کہا بیٹی میں تو کہتا ہوں۔یہ لوگ کہنے نہیں دیتے۔ہاں میں کہہ رہا تھا

لیے شیر سے بیر چُہیا نے چھین

یہ دیکھا تو پھر بادشہ نے کہا — اری پیاری چڑیا ادھر کو تو آ
وہ آئی تو مونچھوں سے پکڑا اُسے — ہَوا کی کمندوں میں جکڑا اُسے

بھائی جان نے قہقہہ مارا

ہہ ہہ ہاہا۔لیجیے بادشاہ پھر آگیا اور چڑیا بھی آگئی۔چڑیا بھی مونچھوں والی۔منجھلے بولے۔ابّاجی یہ ہَوا کی کمندیں کیا ہوتی ہیں۔ابّاجان نے کہا۔بیٹے کتابوں میں اس طرح لکھا ہے۔کمندِ ہَوا۔چچا سعدی لکھ گئے ہیں۔آپا نے پُوچھا۔ابّاجی یہ سعدی کے نام کے ساتھ چچا کیوں لگا دیتے ہیں۔مگر اب ننھی بہت بگڑ گئی تھی۔اس نے جواب کا وقت نہ دیا۔اور بسورنے لگی۔اُوں اوں کہانی ختم کیجیے۔واہ سدی کہانی خراب کردی۔ابّاجان نے اس طرح کہانی ختم کی۔

غرض بادشہ لاؤ لشکر کے ساتھ — چلا سیر کو ایک جھینگر کے ساتھ
مگر راہ میں چیونٹیاں آ گئیں — چنے جس قدر تھے وہ سب کھا گئیں
بڑی بھاری اب تو لڑائی ہوئی — لڑائی میں گھر کی صفائی ہوئی

اکیلا وہاں رہ گیا بادشاہ
ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

ٹکٹون

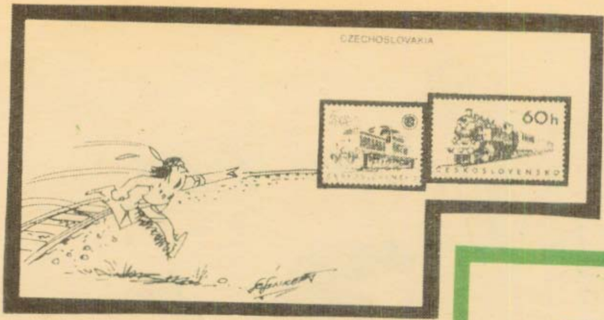
CZECHOSLOVAKIA
60h
ČESKOSLOVENSKO

GERMAN FEDERAL REPUBLIC

FUJEIRA
UNITED ARAB EMIRATES

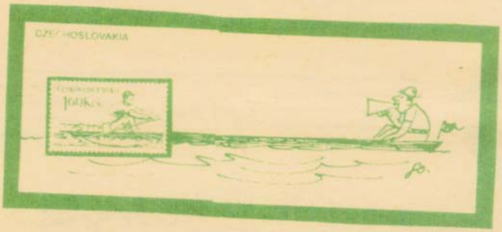
CZECHOSLOVAKIA

ČESKOSLOVENSKO
40 h
Cervus elaphus
CZECHOSLOVAKIA

چھکڑا پیل

انور کلیم بلوچ

اسے آپ موٹر سائیکل کے سوا کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔

پھٹ ... پھٹ ... ڈزن ... ڈوں ... ڈوں ...

فضا میں عجیب قسم کی دہشتناک آواز گونجی جس نے بھی یہ آواز سنی یہی سمجھا کہ شاید کوئی جنگی طیارہ آگیا ہے، مگر جلد ہی یہ آواز ایک گلی میں گونجی تو گلی میں کھیلنے والے لڑکے ڈر کر اِدھر اُدھر ہو گئے ... پھر انھوں نے عجیب منظر دیکھا ایک لوہے کی موٹر سائیکل نما "چیز" لڑھکتی پھدکتی آرہی تھی اور اس پر عزیز بھائی سوار مسکرا رہے تھے۔ گلی کے بیچ میں آکر وہ موٹر سائیکل نما چیز ایک جھٹکے سے رُک گئی ساتھ ہی وہ دہشتناک آواز بھی بند ہوئی۔

لڑکے اس چیز کو حیرت سے دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کے قریب آگئے۔

"یہ ... یہ کیا ہے عزیز بھائی؟" حمید نے حیرت سے پوچھا۔

"میری موٹر سائیکل..." عزیز بھائی اکڑ کر بولے۔

"یہ چھکڑا میل... موٹر سائیکل ہے؟" طارق نے پہلے حیرت سے پھر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

"دو ہزار روپے کی ہے... اب میں کالج بھی اسی پر جایا کروں گا اور تم لوگوں سے کرکٹ کھیلنے بھی اسی پر آیا کروں گا..." عزیز بھائی اُن کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

"ہمیں بھی کبھی سواری کا شرف بخشیں گے؟" نعیم نے کہا

"بالکل" عزیز بھائی کے اس جواب پر نعیم چیخ کر بولا "عزیز بھائی!"

"زندہ باد..." سب لڑکے چیخ کر ایک ساتھ بولے۔

"چھکڑا میل" نعیم نے پھر نعرہ لگایا "زندہ باد" لڑکے پھر ایک ساتھ بولے۔

عزیز بھائی نے کِکیں لگا لگا کر بڑی مشکل سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کیا... اور ایک لڑکے سے پیچھے بیٹھنے کو کہا... مگر لڑکا بجائے خوش ہونے کے ڈر کر بھاگا، بڑی مشکل سے حمید ڈرتے ڈرتے اُن کے ساتھ بیٹھا... یوں تھوڑا سا سب کو اِدھر اُدھر گھما پھرا کر وہ اپنے گھر چلے گئے... اب عزیز بھائی کا "چھکڑا میل" اس چھوٹے سے گاؤں میں مشہور ہو چکا تھا۔ صبح سویرے جب مُرغ بھی خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹ رہے ہوتے اور مسجد کے مولوی صاحب بھی سو رہے ہوتے۔ ایسے میں اچانک فضا میں وہی دہشتناک آواز گونجتی اور سب ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے، پھر مُرغ کو بھی یاد آتا کہ اُسے بانگ دینا ہے۔ ہمارا گاؤں شہر کے قریب ہی تھا اور عزیز بھائی جب بھی صبح کالج جاتے، واپسی پر شہر سے موٹر سائیکل کا کوئی نہ کوئی پُرزہ ضرور لے کر آتے، تاکہ آہستہ آہستہ پُورا موٹر سائیکل ہی نیا بنا دیں۔

یہ الگ بات ہے کہ جو بھی "چھکڑا میل" دیکھتا، قہقہہ ضرور لگاتا

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک رات عزیز بھائی کے ایک پڑوسی اقبال صاحب کے پیٹ میں شدید درد ہُوا... پہلے تو گھر والوں نے ایک دو ٹکیاں اور گولیاں دیں، مگر درد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، بلکہ جوُں جوُں وقت گزرتا جا رہا تھا درد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ اقبال صاحب درد سے بچوں کی طرح تڑپنے، چیخنے، چلّانے لگے۔

گاؤں میں تو کوئی ڈاکٹر نہ تھا شہر قریب تھا مگر مسئلہ تھا سواری کا...

اقبال صاحب کے بیٹے طارق کو اچانک ہی ایک خیال آیا وہ بھاگا بھاگا عزیز بھائی کے گھر پہنچا

اور اُنھیں اقبال صاحب کی حالت بتا کر مدد کی درخواست کی۔ اور پھر پہلی مرتبہ عزیز بھائی کا موٹر سائیکل وقت سے پہلے اسٹارٹ ہُوا۔ چند لوگ تو موٹر سائیکل کی آواز سُن کر جاگ گئے کہ شاید صبح ہو گئی ہے۔ مگر آدھی رات دیکھ کر، یہ سوچ کر پھر سو گئے کہ پتا نہیں آج عزیز بھائی کو کیا سُوجھی ہے؟

عزیز بھائی، اقبال صاحب کو موٹر سائیکل پر لے کر شہر ایک ڈاکٹر صاحب کے کلینک پہنچے جن کا گھر کلینک کے اوپر دوسری منزل پر تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے ملازم نے آکر کہا کہ چاہے کچھ بھی ہو ڈاکٹر صاحب اس وقت نہیں آئیں گے۔ ایک دوسرے بڑے ڈاکٹر نے بھی جواب دے دیا، تب عزیز بھائی کو اپنے ایک واقف کار مگر نسبتاً کم مشہور ڈاکٹر کا خیال آیا۔ ڈاکٹر صاحب آدمی رحم دل تھے۔ عزیز بھائی کی پھٹپھٹیا پر سوار ہو کر گاؤں پہنچے، اقبال صاحب کا علاج کیا۔

دوسرے دن اس واقعے کا چرچا سارے گاؤں میں ہُوا۔ اُس دن جب عزیز بھائی کالج سے واپس اپنے چھکڑا میل پر آئے تو لڑکے چھکڑا میل کو دیکھ کر چیخنے اور نعرے لگانے لگے "عزیز بھائی۔ زندہ باد" "چھکڑا میل ۔۔ زندہ باد"۔ مگر اب اُن کے نعروں میں مذاق اُڑانے کا پہلو نہیں تھا۔۔ شاید وہ یہ بات جان گئے تھے کہ۔ ؏ نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں۔

چھوڑو نا! نہیں کرو گد گدی، ہو رہی ہے

حارث شمیم

انڈے ہمارے دور کے چالاک ہو گئے

دنیا میں انسان کے علاوہ ہر چیز کی اہمیت بڑھ رہی ہے ۔ حتیٰ کہ انڈوں کی بھی ۔ ایک زمانہ تھا کہ انڈے صرف کھانے کے کام آتے تھے یا زیادہ سے زیادہ اساتذہ نالائق طالب علموں کو خراب پرچے کرنے پر انڈے دے دیا کرتے تھے ۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انڈوں کی اہمیت میں اضافہ ہُوا اور انڈے جلسوں، تھیٹروں اور مشاعروں میں کثرت سے استعمال ہونے لگے ۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر اب تو انڈوں نے ترقی اور اہمیت کی اُن انتہاؤں کو چھُو لیا ہے جن کو دیکھ کر ہمیں خیال آتا ہے کہ کاش ہم انسان کے بجائے انڈے ہوتے ، خواہ گندے ہی سہی ...

آنکھ مچولی کے ایک گزشتہ شمارے میں آپ نے آرٹ کی دنیا میں انڈوں کے استعمال کے بارے میں پڑھا ہوگا ۔ اس وقت ہمارا خیال تھا کہ انڈوں کا اس سے زیادہ استعمال ممکن نہیں مگر ہمیں اپنے اس خیال میں ترمیم کرنی پڑ گئی ہے ۔ اگر آپ نے بھی ہماری طرح سوچا تھا تو آپ کو بھی برابر کے صفحے پر نظر ڈال کر اپنی رائے بدلنی پڑے گی ۔ جہاں اس بار انڈے نئی شکلوں میں جلوہ گر ہیں ۔ انڈوں کے بنے ہوئے جگ اور گلدان مغرب کے ایک مصور کے بنائے ہوئے ہیں جبکہ انسانی چہرے آنکھ مچولی کے ایک قاری عارف یحییٰ کی کاوش ہیں ۔

انڈوں کا یہ استعمال ظاہر کرتا ہے کہ انڈے مشرق و مغرب میں یکساں مقبول ہیں ۔

ہم نے اپنے ایک دوست کو (جو دماغ کے بجائے پیٹ سے سوچتے ہیں) جب انڈوں کے اس حیرت انگیز استعمال کے بارے میں بتایا تو وہ ناراض ہوتے ہوئے بولے ۔

" انڈوں کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ انسانوں کے پیٹ کے کام آئیں نہ کہ آرٹ وغیرہ کے ۔"

ہمارے دوست نے خیال ظاہر کیا ہے کہ انڈوں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے انسانی پیٹ کے مقابلے پر آرٹ کی دُنیا کو ترجیح دینی شروع کی ہے ۔ اُن کے نزدیک انڈوں کا یہ عمل اُن کے چالاک ہونے کی جانب ایک اشارہ ہے

ہمارے دوست انڈوں کے اس غیر انسانی استعمال پر عنقریب دنیا کے مختلف ممالک کے سربراہوں کو خط لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ ہم اپنے دوست کے برخلاف رائے رکھتے ہیں ۔ آپ ہی بتائیے کس کی رائے درست ہے ؟

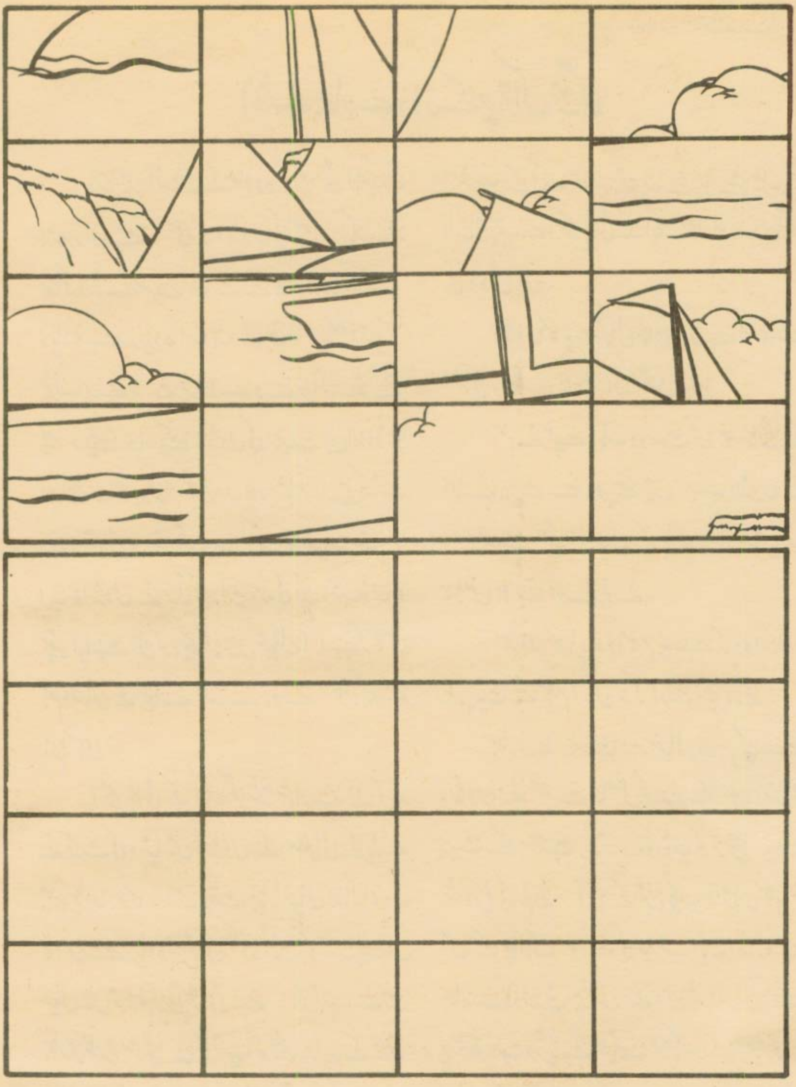

ان ٹکڑوں کو خالی خانوں میں ترتیب سے ملا کر دیکھیے تو صحیح کہ کیا چیز بنتی ہے

جیدی سے گپ شپ

فیاض اعوان

ایک اُوٹ پٹانگ انٹرویو

مسٹر جیدی کے نام سے کون سا شخص ہے جو واقف نہیں ہے۔ بچّے تو بچّے۔ بڑے۔ بڑے معروف لوگ بھی اُن سے واقف ہیں۔ وہ ہمارے مُلک کے ایک مشہور مزاحیہ فنکار ہیں۔ اگر آپ انہیں فنکار کے بجائے اداکار یا ایکٹر کہیں گے تو وہ آپ سے بات بھی نہیں کریں گے۔ اس لیے انہیں فنکار بلکہ مشہور فنکار کہنا ضروری ہے۔ وہ کئی برسوں سے اور ہر ہفتہ ریڈیو پر آرہے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر بھی جب جی چاہتا ہے آتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی عام زندگی میں بھی وہ لوگوں کو خوش رکھتے ہیں۔ بلکہ بچّوں اور لوگوں کو اتنا خوش رکھتے ہیں کہ شاید اُن کے امّی ابّو بھی نہ رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں انٹرویو کے لیے اُن کے پاس پہنچا۔

وہ ایک بلند عمارت کی آخری منزل پر رہتے ہیں جہاں سے آسمان نزدیک اور زمین بہت دُور دکھائی دیتی ہے۔ وہاں تک چڑھتے چڑھتے سانس پھُول گیا۔ ہاتھ پیر جواب دے گئے۔ آخر ایک طویل مسافت کے بعد ہم منزل تک پہنچ ہی گئے۔ انہوں نے مُسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا اور بولے۔

"مسٹر فیاض اعوان، میں آپ کے حوصلے کی داد دیتا ہوں، آخر آپ یہاں تک پہنچ ہی گئے۔ بلا شبہ

آپ ہی جیسے باہمت نوجوانوں کو میں انٹرویو دیا کرتا ہوں۔ میں کوئی معمولی شخصیت نہیں ہوں۔ آیئے اور مجھ سے پوچھیے۔ آپ پہلے خوش نصیب شخص ہیں جنہیں (جیدی) یعنی دنیا کو ایک عظیم شخصیت یعنی مجھ سے انٹرویو کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ میرے ہاتھوں کو بوسہ دیجیے اور اپنا کام شروع کیجیے۔

مَیں:۔ مَیں سب سے پہلے دنیا کی اس عظیم شخصیت سے یہ پوچھوں گا کہ آپ کا اصل نام کیا ہے؟

جیدی:۔ بہت اچھا سوال ہے۔ میرا اصل نام ہے۔ ج۔ ی۔ D-I۔ مسٹر جیدی۔ میٹرک سیکنڈ ڈویژن۔ فرام سرگودھا ڈویژن۔

میں:۔ میں آپ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ کہاں پیدا ہوئے، لیکن یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ کیوں پیدا ہوئے۔؟

جیدی:۔ میں اس لیے پیدا ہوا کہ دنیا کو ایک بہت بڑے فلاسفر کی ضرورت تھی۔ جس میں بہت سی صلاحیتیں ہوں۔ مثلاً وہ موسیقار ہو، گلوکار ہو، اداکار ہو، فنکار ہو، ماہر نفسیات ہو اور ماہر حیوانیات وغیرہ ہو تو میں اس کمی کو دُور کرنے کے لیے دنیا میں آیا ہوں۔

میں:۔ آپ کو دنیا میں آکر کیسا لگ رہا ہے؟

جیدی:۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں مریخ سے آیا ہوں۔ یقیناً یہ دنیا بڑی اچھی جگہ ہے۔ یہاں بڑے مزے مزے کی چیزیں ہیں۔ اگر ہم محبت اور پیار سے رہیں خود بھی مسکرائیں اور دوسروں کو بھی مسکراہٹیں بخشیں تو یہ دنیا واقعی بہت اچھی جگہ ہے۔ مجھے بڑا مزہ آرہا ہے۔

میں:۔ جیدی صاحب! اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟

جیدی:۔ اگر میں پیدا نہ ہوتا تو جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے۔ دنیا ایک بہت بڑی شخصیت (شخصیت) سے محروم ہو جاتی۔ کون سی چیز ہے جو مجھ میں نہیں ہے یا کونسی چیز ہے جس میں، میں نہیں ہوں۔

میں:۔ آپ کو کبھی رونا بھی آتا ہے یا آپ ہر وقت ہنستے ہی رہتے ہیں؟

جیدی:۔ مجھے کبھی رونا نہیں آتا ہے۔ میں ہر وقت ہنستا ہی رہتا ہوں بلکہ میں ہنسنے پر ہی یقین رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے روتے وہ لوگ ہیں جو زندگی سے شکست مان لیتے ہیں اور زندگی کی مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں ہمیشہ ہنستا ہی رہتا ہوں۔ کیونکہ ہنسنے سے بہت سی مشکلات کم ہو جاتی ہیں۔ جیسے آپ انٹرویو کر رہے ہیں اور میں ہنس رہا ہوں "۔۔ ہا ہا۔۔۔ آ۔۔۔"

میں:۔ یہ تو آپ نے واقعی درست کہا۔۔۔!

جیدی:۔ میں ہمیشہ ہی درست بات کہتا ہوں۔ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔

میں:۔ پلیز! ناراض مت ہوں۔ یہ بتائیے کہ یہ جو کوٹ آپ پہنے ہوئے ہیں۔ یہ آپ کی بیوی نے آپ کو تحفے میں دیا ہے یا۔۔ میں اب کیا کہوں۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں؟

جیدی:۔ ارے ہاں میں خوب سمجھتا ہوں۔ کیوں نہیں سمجھتا ہوں۔ کہہ دیجیے کہ چوری کا ہے، لیکن یہ غلط بات ہے، اور یہ 'بیوی' کہاں سے آگئی۔ آپ مفت میں میری بیوی کا نام لے رہے ہیں۔ حالانکہ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ جہاں تک کوٹ کا سوال ہے تو مجھے یہ کوٹ کسی نے نہیں دیا تھا۔ بلکہ یہ مجھے ورثے میں ملا تھا۔ یہ دراصل سکندرِ اعظم صاحب کا کوٹ ہے۔ وہ میرے سگے انکل ہوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ دیا تھا۔ آپ نے نام تو سُنا ہو گا 'سکندرِ اعظم' کا۔ وہ ہمارے قریبی عزیز ہوتے ہیں۔

میں:۔ تو انہوں نے یہ آپ کو مفت دے دیا۔ یعنی بالکل مفت۔ حیرت ہے!

جیدی:۔ آپ کو حیرت کیوں ہے۔ کوٹ تو مجھے دیا ہے۔ آپ کو تو اس بات کا بھی نہیں پتا ہو گا کہ آنٹی کلوپیٹرا، ہماری آنٹی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت تھیں۔ انکل سکندر نے انہی کے کہنے پر اپنا کوٹ ہمیں دیا تھا۔ اور تب سے یہ ہمارے پاس ہے۔ خبردار جو کوٹ کو بُری نظروں سے دیکھا بھی...

میں:۔ جیدی صاحب! ہمارے ملک کے ایک بہت مشہور ادیب، ڈرامہ نگار اور مضمون نگار اطہر شاہ خان صاحب ہُوا کرتے تھے۔ میں نے 'تھے' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ وہ بہت دنوں سے مل نہیں رہے ہیں۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ سنا ہے انہیں آپ نے اغوا کر لیا ہے۔ کیونکہ وہ آپ سے حسد کرتے تھے؟

جیدی:۔ ہرگز نہیں جناب وہ نہ تو مجھ سے حسد کرتے تھے اور نہ میں نے انہیں اغوا کیا ہے۔ وہ تو میرے محسن تھے۔ انہوں نے ہی مجھے گمنام پہاڑوں سے شہر میں آباد کیا ہے اور وہ ہی مجھے ریڈیو بھی لے کر گئے تھے۔ وہ تو میرے محسن تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں چونکہ بہت مشہور شخصیت ہوں۔ تو بہت سے لوگ میرے مخالف بھی ہو گئے ہیں اور یہ اُنہی دشمنوں نے اُڑادی ہے کہ میں نے اطہر شاہ خان کو اغوا کر لیا ہے۔ میں بھلا اُنہیں کیوں اغوا کروں گا۔ وہ تو ماشاءاللہ بڑے اچھے شخص ہیں۔ بڑے اچھے رائٹر ہیں۔ بس ذرا گوشہ نشین رہتے ہیں۔ میں نے خود کل ہی انہیں ایک گوشے میں دیکھا ہے۔ اس لیے یہ غلط بات ہے کہ وہ گم ہو گئے ہیں۔ بس وہ ذرا میری طرح عوامی شخصیت نہیں ہیں۔ میں تو ایک مشہور اور عوامی شخصیت ہوں ناں۔ تو بس لوگ مجھ سے حسد کرتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں اُڑاتے ہیں۔ مجھے تو آپ بھی دشمن کے جاسوس لگتے ہیں۔ جائیے میں آپ سے نہیں بولتا...!

میں:۔ خدا کے لیے جیدی صاحب مجھ سے بات ختم نہ کیجیے۔

جیدی:۔ چلیے آپ نے کہا ہے تو نہیں کرتا۔ آخر آپ پیدل چل کر میرے گھر آئے ہیں۔

میں:۔ جیدی! ہم نے سُنا ہے کہ آپ نے مرنے کا ارادہ بھی ہمیشہ کے لیے ملتوی کر دیا ہے۔ آخر کیا بات ہے۔ کچھ ہمیں بھی بتائیے؟

جیدی:۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ میرے خلاف سازش ہے میں نے مرنے کا ارادہ ہرگز ملتوی نہیں کیا ہے۔ البتہ خود اُس نے مجھے ملتوی کر رکھا ہے۔ ورنہ وہ کوئی دروازہ کھٹکا کر تو آئے گی نہیں کہ مسٹر جیدی کیا میں اندر آسکتی ہوں؟

میں:۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا ارادہ بہرحال ہے؟

جیدی:۔ ارادہ تو ہے مگر اس ینگ ایج میں یہ باتیں کچھ عجیب بلکہ غریب سی لگتی ہیں۔ ابھی تو آپ کو پتا ہی ہے کہ میری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو بہت عرصہ باقی ہے۔ تقریباً نائنٹی ٹو ایئرس کا ابھی اور پروگرام ہے کافی لمبا پروگرام ہے ابھی میرا۔

میں:۔ لیکن جیدی صاحب میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ آپ کی عمر بھی نہیں بڑھ رہی ہے۔ یہ بات بڑی عجیب ہے کہ دنیا میں ہر آدمی کی عمر بڑھتی ہے۔ مگر آپ کی عمر ہی نہیں بڑھ رہی ہے۔ آخر یہ کیا راز ہے؟

جیدی:۔ یہ بھی کسی دشمن کی سازش ہی ہے۔ آپ سے کس نے کہا ہے کہ میری عمر ہی نہیں بڑھتی ہے میری عمر بڑھتی ہے، ضرور بڑھتی ہے۔ دیکھیے اب میں ٹین ایجز میں ہوں۔ آئی ایم اونلی ٹوئنٹی فرسٹ۔ تو یہ جو میں اکیس سال کا ہوا ہوں تو ظاہر ہے میری عمر بڑھی ہے۔ آپ نے کیسے کہہ دیا ہے کہ میری عمر نہیں بڑھ رہی ہے۔

میں:۔ اچھا تو آپ کی عمر اکیس سال ہے؟

جیدی:۔ جی ہاں میں ٹین ایجز میں ہوں۔ اکیس سال کا ہوں۔ آپ کو نہیں پتا کہ اکیس سال کی عمر ٹین ایجز ہوتی ہے۔!

میں:۔ مجھے تو نہیں معلوم تھا۔ خیر آپ یہ بتائیے کہ کبھی آپ ٹی وی پر ہوتے ہیں۔ کبھی ریڈیو پر ہوتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جیدی نے اپنی شخصیت کو کچل ڈالا ہے۔ کیونکہ ریڈیو اور ٹی وی سے تو کوئی بھی فنکار آجاتا ہے۔ جیدی جیسی عظیم شخصیت کو نہیں آنا چاہیے تھا۔

جیدی:۔ ایک تو میرے خلاف سازشیں بہت ہونے لگی ہیں۔ میری شش شخصیت سے لوگ بہت

جلنے لگے ہیں۔ آخر مجھے کیوں ریڈیو اور ٹی وی پر نہیں ہونا چاہیے۔ پھر کہاں ہونا چاہیے۔ میرا تو خیال ہے مجھے اور بھی بہت سی جگہوں پر آنا چاہیے، لیکن وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ مجھے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر نہیں ہونا چاہیے۔ کیا چاہتے ہیں کہ مجھے یتیم خانے میں ہونا چاہیے۔

میں :۔ اچھا یہ بتائیے کہ محلّے کے بچّوں کے ساتھ آپ کے تعلّقات کیسے ہیں۔ وہ آپ کی پٹائی تو نہیں کرتے ہیں ؟

جیدی :۔ ارے، کون کر سکتا ہے میری پٹائی۔ مجال ہے کسی بچے کی پھر بچّے مجھے کیوں ماریں گے وہ تو مجھے بڑے پیارے لگتے ہیں۔ سب بچّے میرے دوست ہیں۔ البتہ پچھلے دنوں میری ایک بکرے سے لڑائی ہوئی تھی۔ میں نے وہ زور کی ٹکّر ماری کہ بے ہوش ہو گیا۔

میں :۔ "اچھا جیدی صاحب! یہ بتائیے کہ آپ کی ماہانہ آمدنی کیا ہے"؟

جیدی :۔ بھئی یہ میں آپ کو کیوں بتاؤں۔ یہ میرا ایک کانفیڈینشل راز ہے۔ آپ کو بتاؤں گا تو آپ فوراً انکم ٹیکس والوں کو بتا دیں گے۔ تو میں اپنی یہ باتیں اس لیے کسی کو نہیں بتاتا ہوں۔ ویسے مختلف ملکوں میں میری آمدنی مختلف ہوتی ہے۔ کہیں مجھے پاؤنڈ ملتے ہیں۔ کہیں ڈالر ملتے ہیں۔ کہیں ین اور کہیں روپیہ ملتا ہے۔ تو دنیا بھر میں جتنے ملک ہیں۔ میری ہر جگہ انکم ہو رہی ہے۔ دراصل میری شخصیت ایسی ہے کہ میں جہاں جاتا ہوں۔ مجھے بڑے بڑے تحفے ملتے ہیں۔ میری دعوتیں کی جاتی ہیں۔ مجھے ہیروں اور جواہرات سے نوازا جاتا ہے تو میں کیا بتاؤں کہ میری آمدنی کتنی ہے؟

میں ۔ اچھا! جتنی آمدنی ہوتی ہے۔ آپ اپنی ہی شخصیت اور بناؤ سنگھار پر خرچ کرتے ہیں یا غریب و غرباء میں بھی کچھ تقسیم کرتے ہیں ؟

جیدی :۔ نہیں میں غریب و غرباء کی بھی بڑی مدد کرتا ہوں۔ ابھی پرسوں ہی میں نے ایک فقیر کو دس پیسے دیے تھے۔ تو میں بڑا سخی شخص ہوں۔ غریبوں کی مدد اکثر کرتا رہتا ہوں۔

میں :۔ اچھا جب آپ نے اُس فقیر کو دس پیسے دیے تھے تو فقیر نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ دُعائیں دی تھیں یا آپ کے پیچھے دوڑا تھا اینٹ اُٹھا کر ؟

جیدی :۔ نہیں میرے پیچھے تو نہیں دوڑا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں اُس کے پیچھے اُس سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہوں۔ بس مجھے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کچھ بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ جیدی مجھے کھوٹے دس پیسے دے گیا ہے۔ اب دیکھیں نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔ ایک تو میں نے اُسے دس پیسے دیے اوپر سے بُرا بھلا کہنے لگا۔

میں :- جیدی صاحب ! یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ آپ کی تعلیم میٹرک سیکنڈ ڈویژن ہے۔ مگر پھر بھی آپ اتنے قابل ہیں۔ کیا آپ مزید تعلیم اسی لیے حاصل نہیں کرتے ہیں کہ قابلیت اور زیادہ ہو جائے گی؟

جیدی :- یہ آپ نے بالکل صحیح کہا ہے۔ مگر کان ذرا ادھر لائیں۔ میں ویسے تو ہر ایک کو یہ بتا دیتا ہوں کہ میں میٹرک سیکنڈ ڈویژن ہوں۔ مگر میں نے خفیہ طور پر کئی مضامین میں پی ایچ ڈی بھی کر رکھی ہے جی ہاں۔ یہ میں عام لوگوں کو بتاتا نہیں ہوں مگر آپ تو گھر کے آدمی ہیں۔ آپ کو بتا دیتا ہوں۔ بس بات یہ ہے کہ لوگ تنگ کرتے ہیں۔ اگر انہیں پتا چلے کہ میں نے خفیہ طور پر اتنی ڈگریاں بھی لے رکھی ہیں تو تنگ کرنے لگیں گے۔ ببلو کہے گا مجھے پڑھا دیں اور کوئی کہے گا منے کے ابا کو پڑھا دیں۔ تو میری ٹیوشن بھی بہت زیادہ ہے تو پھر کیا فائدہ محلّے والوں سے تعلقات خراب کرنے سے میٹرک سیکنڈ ڈویژن ہی ٹھیک ہے۔ ہاہا... میں بڑا چالاک ہوں۔

میں :- جیدی صاحب۔ جتنے چالاک آپ ہیں۔ آج کل کے بچّے بھی کم چالاک نہیں ہیں۔ وہ ساری سیاسی پارٹیوں کو بھی جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ کس کس پارٹی میں ہیں ؟

جیدی :- دیکھیے یہ بالکل غلط بات ہے۔ میرا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتّہ یہ بات صحیح ہے کہ مجھے وہ پارٹی ہمیشہ پسند آتی ہے جو میری پارٹی کرتی ہے۔ کبھی میرے لیے ٹی پارٹی کرتی ہے اور کبھی ڈِنر پارٹی۔ آپ بھی مجھے اپنی ڈِنر پارٹی میں بُلائیں، مجھے بڑی اچھی لگے گی۔

میں :- اس کا مطلب ہے کہ وہ خبر بھی غلط ہے کہ شہر کی بسوں کے شیشے بھی آپ توڑتے ہیں ؟

جیدی :- بالکل غلط ہے۔ کمال ہے آپ پتا نہیں مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ میں نے تو صرف ایک بار ہی بس کے شیشے توڑے ہیں۔ یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب میں بس میں سفر کر رہا تھا۔ ٹکٹ کنڈیکٹر سے میرا ٹکٹ پر جھگڑا ہو گیا۔ تو میں نے کہا مجھ جیسی شخصیّت بھی اگر ٹکٹ دینے لگے تو پھر بات ہی کیا ہے۔ کتنی غلط بات تھی کہ مجھ سے ٹکٹ کے پیسے مانگ رہا تھا۔ آدمی کا آخر سوشل اسٹیٹس دیکھنا چاہیے۔ آدمی آدمی کو دیکھ کر ٹکٹ مانگنا چاہیے۔ بس اسی بات پر مجھ سے جھگڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھے دھکّا دیا تو، تو میرا سر کھڑکی سے جا ٹکرایا۔ اور بس اُس سے بس کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ میرا سر بڑا مضبوط ہے وہ تو شیشہ تھا میں تو ٹکّر مار کر دیوار بھی توڑ دیتا ہوں۔ کہیں تو یہ دیوار بھی توڑ کر دکھاؤں۔ اوہ! یہ نہیں یہ تو میرے ہی گھر کی دیوار ہے۔

میں :- جیدی صاحب! آپ کا پسندیدہ ٹی وی اسٹار کون سا ہے؟

جیدی:۔ یعنی مجھ سے ہی پوچھ رہے ہیں کہ میرا پسندیدہ ٹی وی اسٹار کون سا ہے ۔ بھئی میں خود سب سے بڑا اسٹار ہوں اور بہت سے بین الاقوامی ٹی وی اسٹیشنوں پر آچکا ہوں۔ تو میرا پسندیدہ ٹی وی اسٹار میں خود ہوں ۔۔۔!

میں:۔ کوئی خاتون ٹی وی اسٹار بتائیے ؟

جیدی:۔ وہ بھی میں خود ہی ہوں ۔ آپ کو نہیں پتا ۔ میں خواتین کے کردار بھی ادا کر چکا ہوں ۔ اس کے علاوہ میں ملکہ حسن بھی رہ چکا ہوں ۔ ایک مقابلہ ہوا تھا جس میں مجھے ملکہ حسن کا خطاب ملا تھا ۔

میں:۔ اچھا جیدی صاحب یہ بتائیے کہ آپ نے بے شمار شہر دیکھے ہیں ۔ ہنالولو ، ٹمبکٹو ، چیچو کی ملیاں وغیرہ لیکن فرض کیجیے کہ گدو بندر والے آپ کو بلانا چاہیں تو آپ بلا تکلف چلے جائیں گے ؟

جیدی:۔ کیوں نہیں جاؤں گا ۔ ضرور جاؤں گا آخر وہ بھی میرا اپنا ہی شہر ہے ۔ بلکہ گدو بندر تو مجھے بہت پسند ہے ۔ ایک بار میری وہاں دعوت بھی ہوئی تھی ۔ بڑا مزا آیا تھا ۔

میں:۔ اچھا جیدی صاحب! یہ بتائیے کہ آپ کے ہاں ناشتہ اور کھانے کا انتظام کون کرتا ہے ؟

جیدی:۔ میں خود کرتا ہوں اور کون کرتا ہے ۔ میں بہت اچھا کک بھی ہوں ۔ میں انڈا خاص طور پر بڑا اچھا ابال لیتا ہوں ۔۔۔!

میں:۔ اچھا اچھا یہ جو ہمارے ہاں بڑے بڑے ہوٹلوں میں تقریبات ہوتی ہیں ۔ جن میں بڑے بڑے لوگ آتے ہیں ۔ وہاں بھی مزے مزے کے کھانے آپ ہی پکاتے ہیں ۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا ؟

جیدی:۔ نہیں نہیں ۔ آپ کیا مجھے ہوٹلوں کا خانساماں سمجھ رہے ہیں ۔ میں اپنے گھر میں ککنگ کرتا ہوں ۔ صرف اپنے لیے ۔ آپ کمال کرتے ہیں ۔ اگر مجھے شادیوں والے دیگ پکانے کے لیے بُلائیں گے تو کیا میں چلا جاؤں گا ۔ بھئی میں صرف اپنا کُک ہوں ۔ اپنے لیے ہی کرتا ہوں ۔ دوسروں کو تو میں پوچھتا بھی نہیں ہوں جیسے آپ کو نہیں پوچھ رہا ہوں ۔

میں:۔ اچھا اچھا پلیز، مجھے پانی تو پلادیں ۔

جیدی:۔ ہاں پانی بہت ۔ یہ لیجیے مٹکا حاضر ہے ۔ اب میں اتنا بھی کنجوس نہیں ہوں ۔ خوب جی بھر کر پانی پیجیے ۔ بلکہ پیٹ بھر کر پیجیے ۔

میں:۔ جیدی صاحب ! آپ افریقہ کے بڑے بڑے جنگلوں کی سیر کر چکے ہیں اور بڑے بڑے جانوروں سے مقابلہ کر چکے ہیں ۔ کبھی کسی جانور کو دیکھ کر ڈر نہیں لگا ؟

جیدی:۔ نہیں مجھے کبھی کسی جانور کو دیکھ کر ڈر نہیں لگا ۔ وہ خود مجھ سے ڈرتے ہیں ۔ وہ مجھ سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ میں عجیب عجیب طرح سے اُنہیں ڈراتا ہوں ۔ ایک بار میرے مقابلے پر ایک شیر آگیا ۔ میں نے سوچا اگر اس نے مجھے پہچان لیا تو فوراً کھا جائے گا ۔ اس لیے میں نے فوراً میک اپ کیا اور گینڈا بن گیا ۔ میں میک اپ کا بھی بہت ماہر ہوں ۔ تو اب جو شیر نے دیکھا کہ سامنے ایک خونخوار گینڈا کھڑا ہے تو وہ دُم دبا کر بھاگ نکلا ۔ بعد میں پتا چلا ہوگا تو بڑا شرمندہ ہُوا ہوگا کہ اتنا اچھا موقع کھانے کا نکل گیا ۔ وہ بھی جیدی ایسی عظیم شخصیت کو... ہاہا ۔

میں:۔ سُنا ہے دنیا کے بڑے بڑے فلاسفر مثلاً ارسطو ، بقراط اور افلاطون وغیرہ آپ کے شاگرد رہ چکے ہیں ۔

جیدی:۔ بالکل ٹھیک سُنا ہے آپ نے ۔ یہ سب میرے بڑے فرماں بردار قسم کے شاگرد تھے اور اکثر مجھ سے فلسفہ اور بہت سی چیزیں سیکھنے آتے تھے ۔ فیثاغورث بھی میرے شاگرد تھے ۔ اُنہیں میں نے ہی کہا تھا کہ آپ زیادہ غور کیا کریں ۔ اس لیے ان کا نام پڑ گیا ۔ فیثا... غورث یعنی فیثاغورث ۔ تو یہ میرے پاس پگڑی لے کر اور سوا کلو مٹھائی لے کر آئے تھے کہ اُستاد مجھے شاگرد بنالو اور میں نے بنا لیا ۔

میں:۔ جیدی آپ سوچ کر بولتے ہیں یا بول کر سوچتے ہیں ؟

جیدی:۔ دراصل مجھے سوچ کر بولنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ کیونکہ میں اتنا سوچا ہُوا آدمی ہوں کہ مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اکثر میں بول کر سوچتا ہوں کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا ۔ کیونکہ بہت سے لوگ میرے

کہے ہوئے جملے لکھ لیتے ہیں ۔ میرے بڑے بڑے قول ہوتے ہیں۔ وہ لکھ لیتے ہیں ... تو میں بولنے کے بعد سوچتا ہوں کہ میں نے کیا بولا ہے ۔

میں :۔ جیدی صاحب آپ میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں یا کوئی کمزوری بھی ہے ؟

جیدی :۔ نہیں میری کوئی کمزوری نہیں ہے اس لیے کہ میں صبح اُٹھ کر تین کلو دُودھ پیتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی بادام کھاتا ہوں۔ پھر ہر ہر کا مربّہ کھاتا ہوں تو مجھ میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔ میں خوبیوں کا مرقّع ہوں۔ جسے خوبیوں کا مجموعہ بھی کہتے ہیں۔ یہ شاعروں کے مجموعے سے کافی بہتر ہوتا ہے ۔

میں :۔ آپ کے بارے میں بعض شکایات بھی ملی ہیں مثلاً یہ شکایت ملی ہے کہ جو دودھ والا آپ کو دودھ دے کر جاتا ہے۔ وہ دودھ بھی دیتا ہے اور پیسے بھی دیتا ہے آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

جیدی :۔ (بگڑ کر) تو آپ کیوں جلتے ہیں۔ پیسے دیتا ہے تو مجھے دیتا ہے۔ یونہی تھوڑا ہی دیتا ہے ۔ میں اُس کی بھینس کو باہر ٹہلانے کے لیے لے جاتا ہوں ۔ اس کو چہل قدمی کراتا ہوں ۔ بھینس کو جوگنگ کی بڑی ضرورت ہوتی ہے ۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ جو بھینس جوگنگ نہ کرے وہ خراب دُودھ دیتی ہے ...

میں :۔ اچھا جیدی صاحب ! آپ کا اسٹار کون سا ہے ؟

جیدی :۔ میرا اسٹار دراصل سُپر اسٹار ہے ... !

میں :۔ آپ کا وزن زیادہ ہے یا قد بڑا ہے ؟

جیدی :۔ اصل میں میرا وزن زیادہ نہیں ہے۔ بعض دشمن کہتے ہیں کہ میں موٹا ہو گیا ہوں ۔ تو یہ غلط بات ہے ۔ کیونکہ میرا وزن صرف ۲۸۸ پونڈ ہے ۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں میرا جسم کتنا سڈول ہے۔ باڈی بلڈر ہوں میں ۔

میں :۔ جیدی صاحب بہت سے بچے بلکہ بچوں کے والدین بھی بڑی حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ جیدی کس قدر معلومات رکھتے ہیں ۔ دنیا کی کوئی سی بھی بات ہو انہیں معلوم ہوتی ہے۔ یوں جیسے وہ خود انسائیکلو پیڈیا ہوں ...؟

جیدی :۔ کبھی شاید میں انسائیکلو پیڈیا ہوتا تھا ۔ مگر اب میں موٹر سائیکل پیڈیا ہوں۔ کیونکہ اب سائیکل کی جگہ موٹر سائیکل نے لے لی ہے ۔ تو آپ مجھے سائیکل سے تشبیہ نہ دیں ۔ مجھے انسائیکلو پیڈیا نہ کہیں بلکہ موٹر سائیکل پیڈیا کہیں ... !

میں :۔ یہ ہم انسانوں کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کا تعلق ہماری ہی دُنیا سے ہے۔ ماشاءاللہ کس قدر حسین و جمیل ہیں آپ۔ اگر جن بھوت بھی دیکھیں تو حیرت زدہ رہ جائیں؟

جیدی :۔ یہ آپ نے بھوتوں کی کیا بات کی ہے۔ کیا میری شکل بھوتوں جیسی ہے۔؟

میں :۔ نہیں نہیں میرا مطلب ہے بھوتوں میں بھی تو ایک سے ایک حسین ہوتے ہیں۔۔۔!

جیدی :۔ اچھا اچھا اس لیے! بلاشبہ بھوتوں میں بھی حسین ہوتے ہیں۔ ایک بار مجھے ایک بھوتوں کا شہزادہ ملا تھا۔ مجھے کہنے لگا کہ آپ بھی ہمارے قبیلے میں آ جائیں۔ میں نے کہا نہیں، میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ آئی ایم ویری بیزی مین۔

میں :۔ اچھا جیدی صاحب! آخر میں آپ خود ایک اچھا سا سوال کیجیے اور پھر خود ہی جواب دیجیے۔

جیدی :۔ میں ضرور بتاؤں گا آپ سب سے اچھا سوال مجھ سے یہ کر سکتے ہیں کہ مسٹر جیدی! کل آپ کی ہمارے ہاں دعوت ہے۔ ہم نے ککڑ روسٹ پکایا ہے۔ پلاؤ ہے۔ بریانی ہے۔ نرگسی کوفتے ہیں تو آپ کتنے بجے تشریف لائیں گے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب میں آپ کو فوراً دے سکوں گا۔

میں :۔ کیا سب بچے یہ سوال کر سکتے ہیں؟

جیدی :۔ کوئی بھی بچہ کھانے پلانے کے بارے میں سوال کر سکتا ہے۔ دعوت کے بارے میں کوئی بھی سوال کر سکتا ہے۔ میں انشاءاللہ مایوس نہیں کروں گا۔ فوراً مثبت جواب ملے گا۔

میں :۔ آنکھ مچولی کے بچے اگر خط لکھیں کہ جیدی صاحب آپ ہمارے ہاں ککڑ روسٹ کھانے آسکتے ہیں۔ آپ کو دعوت ہے۔ تو دعوت قبول کر لیں گے؟

جیدی :۔ ویسے تو میں ہر بچے کی دعوت قبول کر لوں گا۔ مجھے کھانے کی دعوت سے بڑی روحانی خوشی ہوتی ہے۔ پھر بھی میں مصروف آدمی ہوں۔ ہو سکتا ہے میں ہر بچے کے ہاں نہ جا سکوں۔ اگر ایسا ہو تو بھی بچے پریشان نہ ہوں۔ وہ مجھے پارسل بھیج سکتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ بڑی غلط بات بھی کرتے ہیں۔ وہ بھنے ہوئے گوشت کے بجائے باسی دال بھیج دیتے ہیں۔ یہ بڑی غلط بات ہے۔ ایسا بالکل نہ کیا کریں۔ بلکہ مذاق میں بھی نہ کیا کریں۔ کیونکہ میں گھر جیسا کھانا ہر جگہ نہیں کھا سکتا۔

میں :۔ اچھا مسٹر جیدی! اب ہم چلتے ہیں اور آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جیدی :۔ آپ صرف شکریہ کیوں ادا کرتے ہیں آپ کچھ اور بھی تو ادا کیا کریں ناں۔ جو آتا ہے شکریہ ادا کر دیتا ہے۔ پیسے کوئی نہیں ادا کرتا۔ یہ کیا بات ہے۔ یہ کیا مذاق ہے۔ یعنی آپ نے اتنا میرا قیمتی وقت

لیا ہے اور آپ صرف شکریہ ادا کر کے چلے جائیں گے ؟

پھر مسٹر جیدی نے مجھ سے ہاتھ ملایا ۔ مجھے گلے لگایا ۔ اور انعام میں دس پیسے دیے ۔ مسٹر جیدی تک پہنچنے کا سفر جس قدر دشوار تھا ۔ واپسی کا سفر اُس سے بھی زیادہ کٹھن تھا ۔ ہم آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگے ۔ ہر قدم پر دل دھڑکتا اور ہم دل کی دھڑکن بند کیے اُترتے رہے ۔ رفتہ رفتہ آسمان دُور اور زمین نزدیک ہوتی گئی ۔ مسٹر جیدی ہاتھ ہلا رہے تھے ۔ اور پھر اُن کا ہاتھ بھی غائب ہوگیا۔

آنکھ مچولی کے ساتھیوں کے لیے جیدی کا آٹوگراف

"جو بکرے نے مارا ہے بکری کے سینگ
تو بکری بھی مارے گی بکرے کے سینگ"

ج. ی. D. ۱

کرکٹ میں قہقہے

کرکٹ کے میدان میں پیش آنے والے قہقہہ آور واقعات

انگلینڈ کی کاؤنٹی سسیکس کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ایک میچ کھیلا جارہا تھا ۔ دنیا کے مشہور تیز رفتار بالر ڈینس للی نے نئی گیند سے چند ہی اوور پھینکے تھے کہ اچانک بارش شروع ہوگئی ۔ اور کھیل کو مجبوراً روکنا پڑا ۔ بارش تھمی تو کھیل کا دوبارہ آغاز ہُوا ۔ للی نے تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں گیند پھینکی ۔ گیند پچ سے ٹکرانے کے بعد دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی بیٹسمین آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے ۔ ابھی اُن کی حیرانی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ گیند کا ایک ٹکڑا... بیٹسمین کے پیڈز پر لگا جبکہ دوسرا ٹکڑا وکٹوں سے جا ٹکرایا جس سے بیلز بھی گر پڑیں ۔ للی نے انتہائی سنجیدگی کے عالم میں پہلے ایل بی ڈبلیو اور پھر بولڈ آؤٹ کی اپیل کی ۔ امپائر بل اپلے بڑی دلچسپی سے سارا منظر دیکھ رہے تھے ۔ انہیں للی کی شرارت کا علم ہو چکا تھا ۔ اس لیے انہوں نے للی کی دونوں اپیلوں کو مسترد کرتے ہوئے اس بال کو نو بال قرار دیا ۔ دراصل للی بارش کے وقفے کے دوران ایک سُرخ اور چمکدار سیب اپنی جیب میں چھُپا کر میدان میں لے آئے تھے اور گیند کو جیب میں رکھ کر انہوں نے گیند کے بجائے سیب بیٹسمین کی طرف پھینکا تھا جو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا ۔ جب تماشائیوں نے اس واقعے کا علم ہُوا تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے ۔

ڈریسنگ روم میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ ٹیم کے مینجر نے ٹیلی فون اُٹھایا ۔ دوسری جانب ٹیم کے کپتان کی بیگم تھیں جو اپنے شوہر سے بات کرنا چاہتی تھیں ۔

"میں ٹیم کا مینجر ہوں ، میں معذرت خواہ ہوں" مینجر نے کہا "آپ کے شوہر کی ابھی ابھی باری آئی ہے اور وہ میدان میں بیٹنگ کرنے گئے ہیں ، آپ کو زحمت نہ ہو تو بعد میں ٹیلی فون کر لیجیے گا ۔"

"آپ فکر نہ کیجیے، میں نے ہولڈ کیا ہُوا ہے" کپتان کی بیگم نے جواب دیا۔
"آپ کچھ دیر بعد ٹیلی فون کیجیے گا' آج وہ بہت مُوڈ میں ہیں سنچری سے کم اسکور نہیں کریں گے۔"
کپتان کی بیگم (غصیلے لہجے میں)، "میں نے کہا کہ میں ہولڈ کیے ہوں۔"
ٹیم مینجر (کچھ توقف کے بعد مرے ہوئے لہجے میں)" آپ ہولڈ رکیے، وہ پہلی گیند پر آؤٹ ہو گئے اور اب واپس آرہے ہیں۔"
کپتان کی بیگم "میں نے سچ کہا تھا نا، میں کپتان کی بیگم ہوں اور آپ مینجر آپ کو کیا پتا اُن کی صلاحیتوں کا۔"

۲۲ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو انگلینڈ اور بھارت کے صوبے مہاراشٹر کی ٹیموں کے درمیان پونا میں کھیلے جانے والے میچ میں ایک بہت ہی حیران کُن منظر دیکھنے میں آیا۔ ہُوا یوں کہ کرکٹ کا رسیا ایک بندر اچانک میدان میں داخل ہوکر پچ کے قریب بیٹھ گیا۔ کھلاڑیوں نے اُسے بھگانا چاہا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ غصّے کے عالم میں خیں خیں کرنے لگا۔ جب کھلاڑیوں نے بندر کو زیادہ ہی اشتعال دلادیا تو وہ اچانک ایک امپائر کی طرف لپکا۔ میدان میں موجود تمام افراد یہ منظر دیکھ کر ہنستے ہنستے بے حال ہوگئے۔ بالآخر منتظمین اُس بندر کو میدان سے نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور کھیل دوبارہ شروع ہوا۔

کرکٹ میچ شروع ہوا۔ اوپننگ بیٹسمین، پیچ پر آیا۔ پچ بہت خراب تھی اور بالر بہت تیز رفتار۔ بالر نے اسٹارٹ لیا۔ بیٹسمین اُس کے اسٹارٹ ہی سے خوفزدہ ہوگیا۔ بالر دوڑتا ہُوا آیا، اُس نے گیند کرائی۔ گیند بہت تیز رفتار تھی، جب وہ گیند بیٹسمین کے بائیں کان کے قریب سے گزری تب اُسے احساس ہُوا۔ بیٹسمین کے ڈر اور خوف میں اور اضافہ ہوگیا۔ بالر نے پھر گیند پھینکی۔ گیند پچ پر اچانک اُچھلی۔ بیٹسمین نے بچنے کی کوشش کی۔ بیٹسمین گیند سے تو محفوظ رہا لیکن اُس کی کیپ وکٹ پر گرتے گرتے بچی۔ اب تو بیٹسمین کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ دِل ہی دِل میں دعائیں مانگنے لگا۔ اسی اثنا میں بالر تیسری گیند پھینکنے کے لیے تیار تھا۔ بالر پھر دوڑا۔ بیٹسمین کے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہونے لگا۔ بالر نے ایک اور خطرناک گیند پھینکی۔ گیند بیٹسمین کے دل کے قریب لگی۔ وہ میدان میں گر گیا۔ فیلڈرز اس کے پاس آئے۔ اُنھوں نے اُسے سنبھالا دیا۔ بیٹسمین بڑی مشکل سے اُٹھا اور دوبارہ گیند کھیلنے کی تیاری کرنے لگا۔ امپائر نے ہمدردی کے طور پر بیٹسمین سے دریافت کیا۔ وہ بیٹنگ کے لیے تیار ہے یا نہیں؟ بیٹسمین نے جواب دیا" میں بالکل تیار

ہوں لیکن ذرا سائیٹ اسکرین کو ہٹوا دیجیے" امپائر نے پوچھا کہ "کس جانب ؟ دائیں یا بائیں ؟"
بیٹسمین نے جواب دیا" سائٹ اسکرین کو اُٹھا کر میرے اور بالر کے درمیان پیچ پر لگوا دیجیے۔"

جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن اور پیٹر مارٹز برگ کی ٹیموں کے مابین سالانہ روایتی میچ ہو رہا تھا۔ ڈربن کی ٹیم کے کپتان، وہاں کے میئر تھے۔ وہ پندرہ سال سے اپنی ٹیم کی نمائندگی کر رہے تھے لیکن اُن کا کرکٹ ریکارڈ بڑا خراب تھا۔ انہوں نے پندرہ سالوں میں صرف دو وکٹیں لی تھیں اور صرف سترہ رَن بنائے اور کیچ تو ایک بھی نہیں پکڑا تھا۔

پیٹر مارٹز برگ کی ٹیم کی بیٹنگ تھی۔ ڈربن میں کھیلے جانے والے اُس میچ میں خاصی بڑی تعداد میں شائقین موجود تھے۔ پیٹر مارٹز برگ کی ٹیم کے کئی کھلاڑی آؤٹ ہونے کے بعد اُن کے میئر کی بیٹنگ آئی۔ اُنہوں نے ایک تیز رفتار اور اونچا اسٹروک کھیلا۔ گیند سیدھی ڈربن کے میئر کی جانب آئی، جنھوں نے اب تک ایک بھی کیچ نہیں پکڑا تھا۔ جیسے ہی گیند اُن کے قریب پہنچی انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ گیند میئر کے بائیں ہاتھ میں آکر چپک گئی۔ چند لمحے کے لیے تو میئر خود ہکّا بکّا رہ گئے۔ لیکن جب ان کو احساس ہُوا کہ انہوں نے اپنی زندگی کا پہلا کیچ پکڑ لیا ہے تو اُن کی خُوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ بے خود ہو گئے اور خوشی کے عالم میں انھوں نے گیند کو ہوا میں اُچھال دیا۔ خود زمین پر گر پڑے اور قلابازیاں کھانے لگے۔ وہ پھر اُٹھے، گیند ہاتھ میں پکڑی اور اپنے ساتھیوں سے اپنے کارنامے کی مبارک باد وصول کرنے آگے بڑھے۔ اتنے میں مڈآن پر کھڑے ہوئے فیلڈر نے میئر سے کہا۔
"خدا کے واسطے اب تو گیند تھرو کر دو، وہ نو بال تھی۔ اور بیٹسمین اب تک دوڑ کر سات رن بنا چکے ہیں۔"

انگلینڈ کے مشہور کرکٹر ڈاکٹر ڈبلیو جی گریس اپنی کاؤنٹی کے میدان میں بیٹنگ کر رہے تھے۔ میدان میں بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ ڈاکٹر گریس کے مقابل ایک تیز رفتار بالر تھا۔ بالر نے گیند کرائی۔ گیند آف پر پڑنے کے بعد تیزی سے اندر کی جانب آئی اور بیلز سے چھُوتی ہوئی گزر گئی، بیلز زمین پر گر گئیں۔ ڈاکٹر گریس نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طرح کا تاثر دیا جیسے بیلز ہوا سے گری ہوں۔ انہوں نے امپائر سے کہا کہ "مسٹر امپائر آج ہوا بہت تیز چل رہی ہے۔" امپائر اُن سے زیادہ حاضر جواب تھا اُس نے برجستہ کہا۔" ہاں ڈاکٹر! واقعی بہت تیز ہوا ہے۔ ذرا پویلین جاتے وقت اس بات کا خیال رکھیے گا کہ کہیں آپ کی کیپ نہ اُڑ جائے۔"

سلیم الطبع

ہت تیرے کی

یہ مضمون اُس وقت مزہ دے گا جب آپ اُسے پورا پڑھیں گے

ٹرن ...... ٹرن ...... ٹرررن

"ہیلو"

"ہیلو! کون بول رہا ہے؟"

"میں جمال بول رہا ہوں"

"ارے بھئی جمال ثاقب بول رہا ہوں۔ کہو کیا حال چال ہیں؟"

"باہر کھیلنے جا رہا ہوں تم کہو کیسے فون کیا؟"

"یار آج تم سکول گئے تھے۔ مجھے چونکہ ہلکا سا بخار تھا اِس لئے میں نہیں جا سکا۔"

"آج میں بھی سکول نہیں گیا۔ دادی جان لاہور سے آ رہی تھیں۔ ان کو لینے سٹیشن پر جانا پڑا۔"

"ارے بھئی آج تو گرمی بڑی سخت تھی۔ تم تو تیز دھوپ میں جل بُھن کر کباب ہو گئے ہو گے۔"

"ہاں! لیکن دادی جان کے آنے کی خوشی میں مجھے گرمی بالکل محسوس نہیں ہوئی۔"

"پچھلے سال جب میرے چچا آئے تھے تو مجھے بھی اتنی خوشی ہوئی تھی کہ میں سردی کے موسم میں بغیر سوئیٹر

یاکوٹ پہنے سٹیشن چلا گیا تھا۔ اور وہاں تو مجھے سردی نہیں لگی۔ تم بتا سکتے ہو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"اصل میں یہ جو ہمارے ماموں، دادی اور پھوپھا وغیرہ باہر سے آتے ہیں۔ ہم لوگوں کے لئے اچھے اچھے تحفے لاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں گرمی سردی اور موسم کا پتہ نہیں چلتا۔ اب دیکھو نا میری دادی جان میرے لئے بہت خوبصورت سا قلم لائی ہیں۔ اور پھر ہماری دادی جان کہانیاں بہت اچھی اچھی سناتی ہیں۔"

"ارے بھئی واہ مزے آ گئے۔ پھر تو میں بھی آؤں گا ان سے کہانی سننے۔"

"ضرور، بلکہ چاہو تو ابھی آجاؤ۔"

"ارے نہیں ابھی تو وہ تھکی ہوئی ہوں گی۔"

"ارے یار میں تم کو ایک مزے کی بات بتاؤں، آج گلی میں ایک بندر والا آیا تھا۔"

"اس میں مزے کی بات کیا ہے۔ جہاں بندر رہتے ہوں گے۔ بندر والا وہیں جائے گا۔"

"خیر ہمیشہ تو اس طرح نہیں ہوتا۔ بس آج ہی وہ تمہاری گلی چھوڑ کر ہماری گلی میں آیا تھا۔"

"بھئی ہماری گلی میں تو وہ تماشہ دکھانے آتا ہے اور تمہاری گلی میں وہ بندر پکڑنے جاتا ہے۔"

"چلو تم یہی سمجھ کر خوش ہوتے رہو۔ لیکن وہ مزے کی بات سنو۔"

"ہاں کیا ہوا"

"ہوا یہ کہ جب مداری تماشہ دکھا چکا تو اس نے بندر سے پوچھا کہ تو یہ تماشہ کس لئے دکھاتا ہے۔ بندر نے پیٹ پر ہاتھ مار مار کر اشارہ کیا کہ اس لئے۔ مداری نے پوچھا کہ تُو نے یہ سب کہاں سے سیکھا؟ تو پتہ ہے۔ بندر نے کیا کیا؟"

"کیا کیا"؟

"وہ تیزی سے وہاں سے بھاگا اور میری طرف آیا اور میری طرف آ کر اس نے بڑی کلاس کی حرکت کی۔"

"آخر کیا حرکت کر دی۔ کیا تمہاری ناک پکڑ لی۔"

"ارے نہیں بھئی سنو تو۔ اس نے میرے ہاتھ سے اس ماہ کا آنکھ مچولی چھین کر مداری کو دے دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ سب حرکتیں اس سے سیکھی ہیں۔"

"ارے بیوقوف فون پر ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اگر خدانخواستہ لائن آنکھ مچولی کے ایڈیٹر صاحب سے مل گئی تو وہ آئیں گے اور ڈگڈگی بجا کر تمہیں اتنا نچائیں گے کہ ساری چوکڑیاں بھول جاؤ گے۔"

"ارے ہاں آنکھ مچولی پر یاد آیا کہ کل تم جب اسکول آنا تو میرا آنکھ مچولی لے آنا۔ میں نے ابھی پورا نہیں پڑھا ہے۔"

"چلو آنکھ مچولی تو میں لے آؤں گا۔ لیکن بھائی وہ تمہارا کب سے ہو گیا؟"

"کیا مطلب تم مجھ سے مانگ کر لے گئے تھے۔"

"گھاس کھا گئے ہو کیا؟ میں نے کب تم سے آنکھ مچولی لیا تھا۔"

"اُف اللہ جمال اتنا جھوٹ تو مت بولو۔ کل ہی تو کلاس روم میں، میں نے تم کو دیا تھا۔ اور جب تم اسے لے کر بھاگ گے تھے تو انگریزی کے سر نے ہم دونوں کو سزا کے طور پر مرغا بنایا تھا۔"

"بھئی واہ کہانی گھڑنا تو کوئی تم سے سیکھے تم ہی مرغا بنے ہو گے۔ مجھے تو کسی نے مرغا نہیں بنایا اور ویسے بھی کل انگریزی کے سر اسکول نہیں آئے تھے۔"

"کیا کہا۔ انگریزی کے سر اکرام کل اسکول نہیں آئے تھے؟"

"تم ہوش میں بھی ہو۔ اس نام کے تو کوئی ٹیچر ہی نہیں ہیں ہمارے اسکول میں۔"

"چلو چھٹی ہوئی ایک آنکھ مچولی کے لئے اتنا جھوٹ تو نہ بولو۔ کل اسکول سے واپسی میں راستے بھر تمہارا بھائی کمال آنکھ مچولی پڑھتا رہا ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کون کمال، کونسا بھائی میرا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ..... کیا تمہارا نام جمال اشرف نہیں ہے اور کیا تمہارا بھائی کمال اشرف بھی نہیں ہے۔ اور کیا تم پاکستان گرامر اسکول میں آٹھویں میں نہیں پڑھتے ہو۔"

"کیا کیا..... کیا ہو گیا ہے بھئی میرا نام تو جمال محسن ہے۔ اور میں گلشن کیمبرج اسکول میں ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔"

"کیا کہا..... کیا یہ ایٹ فور ون سیلون ڈبل تھری نہیں ہے۔"

"نہیں بھئی یہ تو ایٹ فور ون سکس ڈبل تھری ہے۔"

"ہت تیرے کی۔"

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ
أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى ﴿١٣١﴾

اور کئی طرح کے لوگوں کو جو ہم نے دنیا کی (زندگی میں) آرائش کی چیزوں سے
بہرہ مند کیا ہے تاکہ انکی آزمائش کریں ان پر نگاہ نہ کرنا اور تمہارے
پروردگار کی (عطا فرمائی ہوئی) روزی بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے ﴿١٣١﴾

131. And strain not thine eyes toward that which We cause some wedded pairs among them to enjoy the flower of the life of the world, that We may try them thereby. The provision of thy Lord is better and more lasting.

آنکھ مچولی آنکھ مچولی آنکھ مچولی آنکھ مچولی
ضمیمہ نمبر ۲ جولائی ۱۹۸۹ء

شیر بے چارہ

احمد حاطب صدیقی

شیر جنگل میں ہے اُداس بہت — جانور کم ہیں اور گھاس بہت
فکر میں ہے کہ " کیا کریں اب ہم — کر لیا غور اور قیاس بہت
ماہ دولت کا ہو گیا بیڑا — تھی کبھی اپنی دھونس دھاس بہت
سب رعایا چلی گئی " زُو " میں — نوکری آئی اُس کو راس بہت
اُس کے جنگل کو چھوڑ جانے سے — ہو گیا ہے ہمارا لاس¹ بہت
کھانے پینے کے پڑ گئے لالے — چاہیے فیملی کو ماس² بہت
بچّے اُودھم مچائے رکھتے ہیں — اُن کو لگتی ہے بھُوک پیاس بہت
شیرنی نے بھی روز لڑ لڑ کر — کر دیا ہے ہمارا ناس بہت
وہ سمجھتی ہے ، آج بھی ہَیگا — مال و دولت ہمارے پاس بہت
روز میک اپ کا چاہیے سامان — اور درکار ہیں لباس بہت
اُس کے شکوے شکایتیں سُن کر — طعنے دیتی ہے ہم کو ساس بہت
جی میں آتا ہے خودکُشی کر لیں — زندگانی سے ہیں نراش³ بہت
پَر کبھی سوچتے ہیں شہر چلیں — سُونگھ لی جنگلوں کی باس بہت
جا کے سرکس میں نوکری کر لیں — گر ملیں ، تو ہیں سو پچاس بہت "

۱۔ LOSS ۔ نقصان (انگریزی)
۲۔ ماس ۔ گوشت (ہندی)
۳۔ نراس ۔ مایوس (ہندی)

سیّد خورشید عالم

چارلی چپلن

ایک ذہین کامیڈین جسے امریکہ سے نکلنا پڑا

وہ شخص تھا تو بڑا ہی معصوم اور ہر ایک کے کام آنے والا۔ مگر یہ اُس کی بدقسمتی تھی کہ وہ جو کام بھی کرتا وہ اُلٹا ہو جاتا اور مصیبت الگ گلے پڑ جاتی۔ اپنے حلیے کی وجہ سے وہ بلا مبالغہ لاکھوں میں ایک تھا۔ چھوٹا اور انتہائی تنگ کوٹ۔ ڈھیلی ڈھالی پتلون۔ ڈیڑھ اور بد وضع جُوتے۔ ہاتھ میں ٹیڑھی سی بید کی چھڑی، چھوٹا سا ہیٹ اور چھوٹی سی مونچھ اُسے دُور سے نمایاں کر دیتے تھے۔

جی ہاں! آپ اسے یقیناً پہچان گئے ہوں گے۔ یہ لافانی کردار، چارلی چپلن کا ہے جسے آج بھی فلم کے پردے پر دیکھ کر لوگوں کے چہرے پر ہنسی دوڑ جاتی ہے۔ اور بچّے تو ہنس ہنس کر دہرے ہو جاتے ہیں۔

چارلی چپلن ۱۶ اپریل ۱۸۸۹ء میں لندن میں پیدا ہُوا، اس کے باپ کا نام چارلس اور ماں کا نام حنّا تھا۔

چارلی کے والدین بھی لندن کے مختلف میوزک پروگراموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ چارلی چپلن نے بھی اُن سے ابتدائی عُمر میں گانے اور رقص کی تربیت حاصل کی۔ آٹھ برس کی عُمر میں چارلی نے ایک اسٹیج پروگرام میں شرکت کرکے داد وصول کی۔ اس کے باپ کا لڑکپن میں انتقال ہو گیا اور ماں کافی عرصہ دماغی عارضے میں مُبتلا رہی۔ اس کا اثر اُس پر یہ ہُوا کہ وہ مختلف بورڈنگ ہاؤس اور بے سہارا بچّوں کے ہاسٹلوں میں رہا اور تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کے بچپن کا زمانہ بڑا اُداس اور محرومی کے سائے میں گزرا۔ جب وہ سترہ برس کا ہُوا تو اُس کے ایک بھائی سڈنی نے اُسے ایک انگریز نوٹنکی ادارے فریڈ کارنو کمپنی میں کام دلوادیا۔ سڈنی خود بھی یہاں کام کرتا تھا۔ چارلی ۱۹۱۳ء تک اس کمپنی میں مختلف نوعیت کے پروگرام پیش کرتا رہا۔ اسی سال اُس کی قسمت نے اُسے آگے بڑھنے کا ایک موقع دیا۔ ہُوا یہ کہ کمپنی کے ساتھ ایک پروگرام

کے سلسلے میں اُس کا نیویارک آنا ہُوا۔ یہاں کی "اسٹون" نامی کمپنی کے پروڈیوسر میک سینیٹ نے اس کا پروگرام دیکھا اور اُسے فلم میں کام کرنے کی پیش کش کی جسے اُس نے قبول کر لیا۔ اس طرح دسمبر ۱۹۱۳ء میں ۱۵۰ ڈالر فی ہفتہ تنخواہ پر چارلی چپلن نے کام شروع کر دیا۔ فلم کے شعبے میں قدم رکھنے کے بعد وہ پھر کبھی اسٹیج کے کسی پروگرام میں شریک نہیں ہُوا۔

اُس زمانے میں جو فلمیں بنا کرتی تھیں۔ اُن میں آواز نہیں ہوتی تھی۔ صرف چہرے کے تاثرات اور جسم کی حرکات سے خوشی اور غمی کی کیفیات کا اظہار ہوتا تھا۔ چارلی چپلن اپنی پہلی ہی فلم سے ایک بڑا اسٹار بن گیا۔ صرف دو برسوں میں وہ پورے امریکہ کا جانا پہچانا اداکار بن گیا۔ اب چارلی چپلن غربت کے تاریک دور سے نکل کر شہرت اور دولت کے دَور میں داخل ہو چکا تھا۔ بہت جلد اُس نے اپنی فلمیں خود ڈائرکٹ کرنا شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی آمدنی میں بھی بے پناہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔

۱۹۱۵ء میں اُس کی آمدنی ۱۲۵۰ ڈالر فی ہفتہ ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں وہ دس ہزار ڈالر فی ہفتہ کمانے لگا۔ ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی رقم کا اس میں کوئی شمار نہیں جو اُسے گلوکاری کے عوض حاصل ہوئی۔ وہ اپنی فلموں کا صرف ڈائریکٹر یعنی ہدایت کار ہی نہیں تھا بلکہ مصنّف اور مرکزی کردار بھی تھا۔ اپنی ہر فلم میں بہترین جذبات نگاری اور بے ساختگی کی بناء پر وہ شہرت کی بلندیوں تک پہنچ گیا۔

جس طرح چارلی چپلن فلموں میں لوگوں کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کرتا تھا۔ اسی طرح اُس کی گھریلو زندگی خوشیوں سے بھرپور نہیں تھی۔ اس نے چار شادیاں کیں۔ ۱۹۱۸ء میں ملڈرڈ ہیرس، ۱۹۲۴ء میں لیتا گرے، ۱۹۳۶ء میں پاؤلیٹ گوڈارڈ اور ۱۹۴۳ء میں اُونا اُونیل سے اُس نے شادی کی۔ اُس کی پہلی تینوں شادیاں ناکام ثابت ہوئیں۔

اپنے سیاسی نظریات کی بنا پر اُسے ۱۹۵۲ء میں امریکہ چھوڑنا پڑا۔ وہ سوئٹزرلینڈ کے ایک مقام ویوی میں اپنی بیوی اُونا اور چھ بچوں کے ساتھ رہنے لگا۔ ۱۹۵۷ء میں اُس نے لندن میں ایک فلم کو پروڈیوس بھی کیا جس کا نام "دی کنگ ان نیویارک تھا"۔ اس فلم کو بھی بڑی شہرت ملی۔

چارلی چپلن کو بیس برس بعد ۱۹۷۲ء میں امریکہ جانا پڑا جہاں اُسے اکیڈمی آف موشن پکچر آرٹس اینڈ سائنسز کی جانب سے ایک خصوصی ایوارڈ دیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۷۳ء میں اُسے فلمی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز یعنی آسکر ایوارڈ بھی دیا گیا جو اس کی ۱۹۵۲ء کی فلم "لائم لائیٹ" پر دیا گیا تھا۔ اس نے تقریباً

۴۰۔ فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے

آج پوری دنیا میں فلمیں بن رہی ہیں۔ اُن میں مزاحیہ بھی ہوتی ہیں اور مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں بھی۔ مگر مزاحیہ فلموں کا جو انداز چارلی چیپلن دے گیا، اس کی بنا پر آج بھی ہر مزاحیہ اداکار کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی انداز میں اُس کی نقل کرتا ضرور نظر آتا ہے۔ چارلی چیپلن کو بلاشبہ "مزاحیہ فلموں کا بادشاہ" کہا جاسکتا ہے جس نے اپنی فلموں کے ذریعے لاکھوں دلوں پر حکومت کی۔

بلّی، چوہے میں
اتنا پیار
اس سے پہلے
نہ کبھی دیکھا
نہ کبھی سُنا

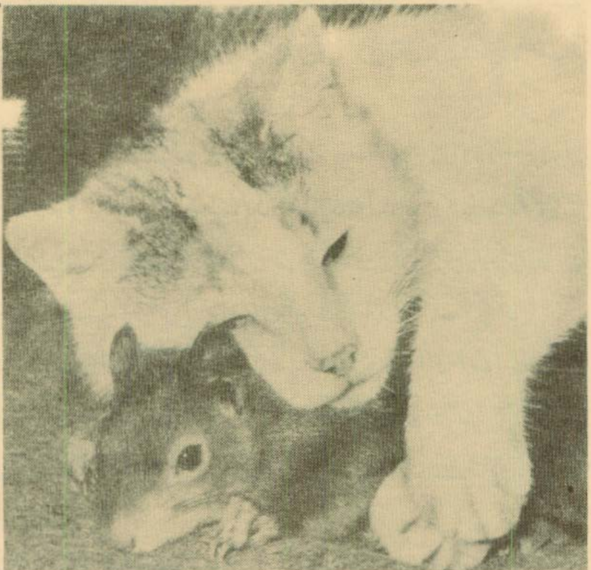

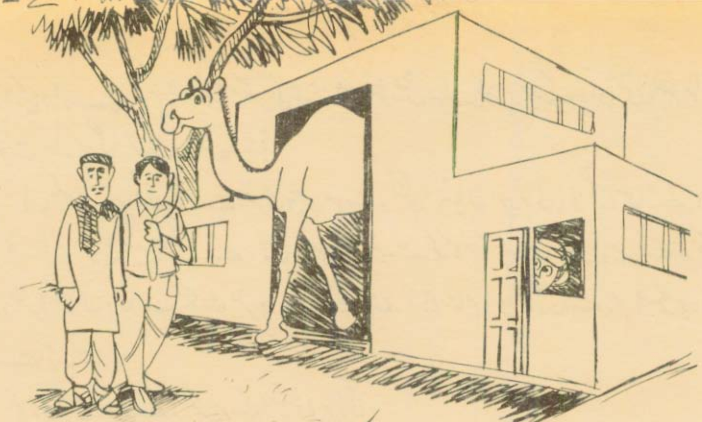

بچّہ جمہورا کی واپسی

ایاز محمود

ایک عظیم سُراغ رساں کا کارنامہ جس نے شرلاک ہومز کو شرما دیا

سہ پہر کے تین بجے تھے ۔ باہر گرم ہوا کے جھکڑوں نے گلیاں اور محلّے سنسان کر دیے تھے۔
سراغرساں، چالاک بوم نے چیونگم مُنہ میں ڈالی اور چھت کو گھُورنے لگا ۔

"کیوں بوم ۔ خیریت تو ہے ؟" ڈاکٹر مکھن نے دلچسپی سے سوال کیا ۔ تشویشناک صورتِ حال میں چیونگم چباتے ہوئے چھت کو گھُورنا چالاک بوم کا خاص انداز تھا ۔

"ہوں" ۔ چالاک بوم نے چونکتے ہوئے کہا ۔ "ڈاکٹر مکھن، تم نے آج ماہنامہ بدنام کا فلمی صفحہ پڑھا؟"

"نہیں تو... کوئی خاص خبر؟" ڈاکٹر مکھن نے زمین پر تازہ چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا ۔

"یہ دیکھو فلم "پاگل دے پُتر" کے اشتہار کے اُوپر" چالاک بوم نے اخبار نکال کر ایک خبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

خبر کچھ اس طرح تھی ۔

"ڈنگر پور کے مضافاتی علاقے وحشت آباد میں وہاں کے بڑے زمیں دار وحشت خان کا اونٹ پُراسرار طور پر گمُ ہو گیا ۔ واضح رہے کہ مذکورہ اونٹ چودھری صاحب کو بہت پیارا تھا ۔ اور گزشتہ برس ہی سمندر پار سے خاص طور پر درآمد کیا گیا تھا ۔ پولیس حسب معمول تفتیش کر رہی ہے ۔"

"کیا ارادے ہیں بوم ؟" ڈاکٹر مکھن کی آواز میں تشویش صاف طور پر جھلک رہی تھی۔ پھر سراغرسانی کا بھوت سوار ہو گیا۔ تمہارے سر پر...؟"

"ہاں مکھن "۔ چالاک بوم نے تھری پیس سوٹ (لنگی، بنیان اور کوٹی) کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔ "سراغرسانی میرا پیشہ نہیں مشن ہے۔ میں دکھی انسانیت کے کام آنا چاہتا ہوں۔ میرے اور تمہارے لیے دو تھرڈ کلاس ریلوے ٹکٹ خرید لیے گئے ہیں۔ آج شام والی گاڑی سے ہم ڈنگر پور روانہ ہو رہے ہیں"۔

گاڑی صبح سویرے ڈنگر پور کے اسٹیشن پر رُکی۔

اسٹیشن سے باہر آکر دونوں سراغرساں کچھ دیر ہونقوں کی طرح منہ اُٹھائے اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ آخر ایک بیل گاڑی آئی دونوں ساتھی کُود کر بیل گاڑی میں جا بیٹھے۔ تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ تین میل طے کر چکے تھے۔ چالاک بوم نے سفر کا بیشتر حصہ اکڑوں بیٹھ کر آسمان کو تکتے ہوئے طے کیا۔ ڈاکٹر مکھن نے سوچ بچار کے اس عالم میں دخل اندازی مناسب نہ سمجھی اور سفر کا بیشتر حصہ خاموشی میں ہی کٹ گیا۔

چالاک بوم نے ایک ہوٹل کے پاس بیل گاڑی رکوائی۔ ہوٹل میں اُن کے نام کی دو چارپائیاں پہلے ہی فون کے ذریعے بُک کرالی گئی تھیں۔ اس لیے کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

شام ہوئی تو دونوں دوست تازہ دم ہو کے وحشت آباد کے چودھری وحشت خان کی حویلی پر جا پہنچے۔ حویلی پر عجب سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ لوگ چل پھر رہے تھے مگر کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ ہر چہرے سے غم ٹپک رہا تھا۔ چالاک بوم کی عقابی نظریں ہر ایک کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اچانک اس کی نگاہ تخت پر بیٹھے ہوئے ایک ایسے شخص پر پڑی جس کا پیٹ باہر، آنکھیں سُرخ، اور مونچھیں لٹکی ہوئی تھیں۔ جب کسی نے اُسے چودھری صاحب کہہ کے مخاطب کیا تو چالاک بوم سمجھ گیا۔ کہ یہی چودھری وحشت خان ہے۔ اُس نے بُلند آواز سے چودھری صاحب کو سلام کیا۔ چالاک بوم اور ڈاکٹر مکھن اب اس انتظار میں تھے کہ چودھری صاحب ان سے حال احوال پوچھیں گے کہ کہو میاں کیسے آنا ہُوا۔ اور کچھ نہیں تو لسّی کا آرڈر ہی دے دیں گے، مگر وہاں محفل میں تو سب کو سانپ نے سونگھ رکھا تھا۔ خود چودھری وحشت خان ان کی طرف دیکھ کر احمقوں کی طرح آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔ ہمت کر کے چالاک بوم نے اپنا اور اپنے ساتھی کا تعارف کرایا۔ چودھری کو جب یہ معلوم ہُوا کہ یہ دونوں نوجوان سراغرساں

ہیں اور اس کی مدد کرنے آئے ہیں تو اُس کی غمگین آنکھیں یکایک چمک اُٹھیں۔

" او ہو ہو ہو! تو آپ ہیں مُلک بلکہ دُنیا کے مانے ہوئے سراغ رساں۔ چالاک بوم اور ڈاکٹر مکھن۔ آپ کے کارناموں کا چرچا تو بچے بچے کی زبان پر ہے۔"

کچھ دیر کی بات چیت کے بعد چالاک بوم کو یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ گُم شُدہ اونٹ کا نام بچہ جمہورا تھا۔ بچہ جمہورا چودھری صاحب کا نورِ نظر اور لختِ جگر تھا اور گزشتہ برس ہی خصوصی آرڈر پر شمالی افریقہ سے درآمد کیا گیا تھا۔ آخری رات وہ اپنے کمرے میں ہی سویا مگر صبح ہوئی تو اُس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ پہلے تو اہلِ خانہ نے اُسے اِدھر اُدھر تلاش کیا، پھر قصبے میں ڈونڈی پٹوائی اور آخر کار مایوس ہو کر پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس آئی اُس نے تفتیش کی اور اب تشویش میں مُبتلا ہے۔

خاطر تواضع کے بعد دونوں سراغ رساں واپسی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے مگر چودھری صاحب مچل گئے۔ کہ اتنی بڑی حویلی کے ہوتے ہوئے مہمان بھلا ہوٹل میں کیسے ٹھہر سکتے ہیں۔

رات دونوں ساتھی اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹے تو چالاک بوم نے کہا۔

" ایک بات تو طے ہے کہ بچہ جمہورا زندہ ہے۔"

" یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا؟" ڈاکٹر مکھن نے پوچھا۔

" سیدھی سی بات ہے۔" چالاک بوم نے چیونگم چباتے ہوئے کہا: "ایک تو اونٹ کو ذبح کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ پورا محلّہ مل کر اونٹ کو پٹختا ہے تب جا کر چھُری پھیرنے کی نوبت آتی ہے اور چور ظاہر ہے اکیلا ہو گا۔ اتنا بڑا کام بلکہ اتنا بڑا اونٹ اُس کے بس میں نہیں ہو گا۔"

" ہاں یہ بات تو ہے۔" ڈاکٹر مکھن نے اتفاق کیا۔

" چلو اب سو جاؤ۔ صبح واردات کی جگہ کے معائنے پر ہی کچھ پتا چلے گا۔" چالاک بوم نے کہا۔

صبح ناشتے کے بعد دونوں سراغ رساں واردات کی جگہ پر پہنچے جو حویلی کے قریب ایک اصطبل نما عمارت تھی۔ کمرے میں بستر بچھا ہُوا تھا۔ ساتھ ہی پانی پینے کا برتن رکھا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر نئی تازہ سفیدی ہوئی تھی۔ ایک کیلنڈر بھی لٹک رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ بنی ہوئی لکڑی کی الماری میں ایک عدد تین بینڈ کا ریڈیو بھی رکھا ہوا تھا۔ چھت سے لٹکتے ہوئے ایک تیس واٹ کا بلب جل رہا تھا۔

چالاک بوم نے چودھری صاحب سے ابتدائی تفتیش شروع کی۔

" پانی کا برتن یہاں کیوں رکھا ہے؟"

"بچہ جمہورا کے لیے۔"

"اور یہ ریڈیو؟"

"یہ بھی بچہ جمہورا کے لیے۔" چودھری نے غمگین آواز میں کہا۔ "کبھی کبھار اُس کی طبیعت اُداس ہوتی تو میں اُس کو راگ بھیروین سُنایا کرتا تھا۔"

"اس بستر پہ کون سوتا تھا؟"

"ہم نے تو بچہ جمہورا کے لیے بچھایا تھا۔ سونا نہ سونا اُس کی مرضی پر تھا۔ ہم نے تو اُسے آرام پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔"

"کمرے میں آخری بار سفیدی کب ہوئی تھی؟"

"پچھلے ہفتے۔"

سوال و جواب سے مطمئن ہونے کے بعد چالاک بوم نے جیب سے عدسہ نکالا اور اس کی مدد سے کمرے کا بغور جائزہ لینے میں مصروف ہوگیا۔ اِدھر اُدھر سونگھا، الماری میں سے ریڈیو اُٹھایا۔ اور اُلٹ پلٹ کر واپس رکھ دیا۔ یکبارگی چودھری سے مخاطب ہوتے ہوئے اُس نے کہا۔

"چودھری صاحب آپ سر میں کون سا تیل استعمال کرتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" چودھری نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

چالاک بوم کو جتنی زبانیں آتی تھیں، اُس نے باری باری ان زبانوں میں اپنے سوال کو دُہرایا۔ مگر چودھری کی شکل پر بدستور بارہ بج رہے تھے۔

"ڈاکٹر مکھن" چالاک بوم نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "صدمے سے چودھری صاحب کے دماغ پر اثر ہوگیا ہے تم ان کا سر سونگھ کر بتاؤ کہ یہ کون سا تیل لگاتے ہیں۔"

ڈاکٹر مکھن نے چودھری کا سر زور سے سونگھا اور بنولے کے تیل کی موجودگی کی اطلاع دی۔

"چودھری صاحب" چالاک بوم نے کہا۔ "آپ یا آپ کے نوکروں میں کوئی نسوار کا شوقین تو نہیں۔"

"نہیں جناب" چودھری نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتائیے۔ آپ کو یا آپ کی سات پشتوں میں سے کسی کو کلاسیکی موسیقی سے تو دلچسپی نہیں رہی؟"

"نہیں جناب۔"

"لیجیے صاحب۔ آپ کا آدھا مسئلہ تو حل ہوگیا۔" چالاک بوم نے انکشاف کیا۔

"یعنی یعنی!" چودھری نے بدحواسی میں کچھ کہنا چاہا۔

"آپ کا چور ایک ایسا شخص ہے جو چنبیلی کا تیل استعمال کرتا ہے۔ پکّے گانوں کا شوقین ہے۔ زکام کا مریض ہے، نسوار کھاتا ہے اور شطرنج کا کھلاڑی بھی ہے۔"

"یعنی..." چودھری صاحب پھر کچھ بولنا چاہتے تھے۔

چالاک بوم نے ہاتھ بلند کر کے انہیں خاموش کیا اور بولا۔

"یہ بات تو طے ہے کہ چوری رات کو کسی وقت ہوئی۔ چور چوری کی نیت سے آیا تو اونٹ سو رہا تھا۔ اب سوتے اونٹ کو جگانا مشکل اور بغیر جگائے گود میں اُٹھا کر لے جانا ناممکن۔"

"تو پھر آخر اس نے کیا کیا؟" ڈاکٹر مکھن سے صبر نہ ہُوا۔

"انتظار میرے بھائی انتظار۔ وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کو امید تھی کہ بچہ جمہورا رات کو پانی پینے کے لیے اُٹھے گا۔ لہٰذا وہ آرام سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھیے اس کے سر کا نشان۔"

چالاک بوم نے دیوار پر تیل کا دھبّہ دکھایا۔

"اس دھبّے سے بنولے کے تیل کی خوشبو صاف آرہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنولے کے تیل کا رسیا تھا۔ انتظار کرتے کرتے اچانک اُس کی نظر ریڈیو پر پڑی تو فوراً اس کے ذہن میں آیا کہ شاید ریڈیو کی آواز سے بچہ جمہورا جاگ جائے اور اُسے انتظار کی زحمت نہ اُٹھانی پڑے اور اگر بچہ جمہورا پھر بھی نہیں جاگتا تو اتنی دیر تک اُس کا اپنا دل بہلتا رہے گا اور نیند بھی نہیں آئے گی۔ جس اسٹیشن پر اس وقت ریڈیو کی سوئی لگی ہے۔ وہاں سے رات کو صرف پکّے گانے نشر ہوتے ہیں۔ اس بات سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ چور پکّے گانوں کا شائق تھا۔ رہی شطرنج کے کھلاڑی ہونے کی بات تو محض یہ ایک اندازہ ہے اور وہ اس لیے کہ اتنا صبر صرف شطرنج کے کھلاڑیوں میں ہی ہوتا ہے کہ اللہ کا نام لے کر چال چلی اور اللہ ہی کے بھروسے پر اگلی چال کا انتظار کرنے لگے اور یہ جو زمین پر آپ کو تجریدی آرٹ کا شاہکار نظر آرہا ہے یہ پھیلی ہوئی نسوار ہے۔"

چالاک بوم کی چالاکی سے بھرپور تقریر سُن کر چودھری وحشت خان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے گلوگیر آواز میں کہا کہ اگر اُس کا پیارا اونٹ مل گیا تو وہ چالاک بوم کو افریقہ سے دوسرا اونٹ منگوا دے گا۔

یہ سُن کر چالاک بوم نے چودھری کو گلے لگا لیا اور زاروقطار رونے لگا۔ جب آنسو تھمے تو اُس نے اعلان کیا کہ پرسوں رات سے پہلے پہلے بچہ جمہورا واپس آجائے گا ورنہ وہ خود واپس چلے جائیں گے۔

ڈنگر پور دراصل ایک بہت بڑی غلّہ منڈی تھی۔ یہاں بڑے بڑے گودام بنے ہوئے تھے۔ اس لیے چالاک بوم

کو یقین تھا کہ اونٹ قصبے میں ہی ہے۔ قصبے میں رہنے والے زمیندار اور تاجر اثر و رسوخ والے لوگ تھے۔ اس لیے بغیر کسی ثبوت کے کسی پر ہاتھ ڈالنا ایک نئی مصیبت کو آواز دینا تھا۔ چور بنولے کا تیل لگاتا تھا اور پکے راگ کا شوقین تھا۔ مگر راہ گیروں کو روک روک کر نہ ان کو سونگھا جا سکتا تھا، اور نہ ہی اُن سے راگ ایمن کلیان اور میاں کی ٹوڈی کے بارے میں ان کی رائے لی جا سکتی ہے۔ چالاک بوم اور ڈاکٹر مکھن اپنے کمرے میں بیٹھے انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے کہ ڈاکٹر مکھن نے کہا۔

"بوم میرے ذہن میں تو کچھ نہیں آتا۔ اونٹ کے پیروں کے نشان پکی سڑک پر جا کر ختم ہو گئے ہیں۔ کوئی واضح سراغ بھی نہیں۔ میرے خیال میں تو معذرت کر لی جائے۔"

"معذرت" چالاک بوم نے چیختے ہوئے کہا۔ "میں آج تک کبھی ناکام نہیں ہوا۔ میں نے بغیر کسی سُراغ کے مسئلوں کے حل نکالے ہیں۔ یہاں تو ہمارے پاس سُراغوں کا ڈھیر لگا ہے۔ تم کہتے ہو معذرت کر لی جائے۔" چالاک بوم جذباتی ہو گیا۔

"تمہارے ذہن میں ہے کوئی ترکیب؟" ڈاکٹر مکھن نے دریافت کیا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ قصبے کے چوک میں بنولے کے تیل کی رعایتی سیل لگا لیتے ہیں۔ اس سے پتا چل جائے گا۔ کہ قصبے میں بنولے کا تیل کون استعمال کرتا ہے اس طرح ہماری تفتیش کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔"

"مگر بوم،" ڈاکٹر مکھن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تیل سستا ملے گا تو اُسے استعمال نہ کرنے والے بھی خرید لیں گے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" چالاک بوم نے اعتراف کیا۔ "اچھا یوں کرو کہ تمام اقسام کا تیل خرید کر ان کی سیل لگا دو۔ اس طرح گاہک وہی تیل خریدے گا جسے وہ استعمال کرتا ہے۔"

"مگر یہ کام کرے گا کون؟"

"تم اور کون۔" چالاک بوم نے کہا۔

"کل صبح تم چوک میں آدھی قیمت پر تیل بیچو گے۔ چودھری کا ایک آدمی تمہیں گاہکوں سے متعارف کراتا رہے گا۔ تمہارا کام صرف اتنا ہو گا کہ بنولے کا تیل خریدنے والے کا نام اپنی فہرست میں درج کر لو۔"

رعایتی سیل بہت کامیاب رہی۔ ڈاکٹر مکھن نے اپنی فہرست نکالی اور معائنے کے لیے چالاک بوم کو پیش کر دی۔ فہرست کچھ اس طرح سے تھی۔

"دس عدد بوتلیں لوگوں نے بچوں کے ہاتھ خرید وائیں۔ پانچ بوتلیں عورتوں نے خریدیں۔ نو افراد نے ایک

ایک بوتل خریدی۔ آٹھ لوگ دو دو بوتلیں لے گئے۔ ایک آدمی نے تین اور تین آدمیوں نے پانچ پانچ بوتلوں کی خریداری کی۔

"ایک اور دو دو بوتلوں والے شوقیہ معلوم ہوتے ہیں": چالاک بوم نے کہا۔ "مگر تین اور پانچ بوتلوں کے خریدار عادی خریدار ہی ہو سکتے ہیں۔ یہی ہماری تفتیش کا محور ہوں گے۔"

"بنولے کی تین بوتلوں کا خریدار تو خود چودھری وحشت خان کا ڈرائیور تھا۔ لہٰذا اب تین افراد رہ گئے۔ فہرست کے مطابق ان میں سے ایک زمیندار ایک غلّہ کا تاجر اور ایک اشتہاری کمپنی کا مینیجر تھا۔"

"چور زمیندار اور غلّے کے تاجر ہی میں سے ہے": ڈاکٹر مکھن نے کہا۔

"ڈاکٹر مکھن، کل اسٹیشن جا کر تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ لے آنا": چالاک بوم نے کہا: "ہم کل شام کی گاڑی سے واپس جا رہے ہیں۔"

اگلی دوپہر بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ حویلی کے بڑے کمرے میں اشتہاری کمپنی کا مینیجر، بجّہ جمہورا اور اُن کے بیچ میں چودھری وحشت خان بیٹھے تھے۔ مینیجر کی جیب سے نسوار کی ڈبیا نظر آ رہی تھی، وہ وقفہ وقفہ سے آستین سے اپنی ناک پونچھتا۔ آخر کار جب چودھری ڈانٹتے ڈانٹتے ڈانٹتے اور مینیجر معافی مانگتے مانگتے نیز چھینکتے چھینکتے تھک گیا تو محفل برخاست ہوئی۔ جس کے بعد چودھری اُن کی طرف متوجہ ہوا۔ اور بہت خلوص کے ساتھ چالاک بوم کی خدمت میں رومال میں لپٹا ہوا نذرانہ پیش کیا جسے چالاک بوم نے ٹھکرا دیا۔ اس پر چودھری نے مزید نذرانہ پیش کیا، جسے مزید وقت ضائع کیے بغیر قبول کر لیا گیا۔

اسٹیشن پر ڈھول دھمکّا اور باجے تاشوں کے ساتھ دونوں سراغ رسانوں کو رخصت کیا گیا۔

"یہ کیس بھی بخوبی اپنے انجام کو پہنچا، مگر تم نے مینیجر پر ہاتھ کیسے ڈالا۔" ڈاکٹر مکھن نے پوچھا۔

"اس مرتبہ کیس بڑا پیچیدہ ہو گیا تھا مکھن۔ چالاک بوم نے چیونگم کا پیکیٹ پھاڑتے ہوئے کہا۔ "جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ آج صبح میں تینوں افراد یعنی زمیندار، غلّے کے تاجر اور اشتہاری کمپنی کے مینیجر کے ہاں اچانک پہنچ گیا تھا۔ مگر وہاں اک عجب مسئلہ پیدا ہو گیا۔ تینوں افراد نے بنولے کا تیل لگایا ہوا تھا۔ تینوں نسوار کے شوقین نکلے، تینوں پکّے گانوں کا ذوق رکھتے تھے۔ تینوں شطرنج کے کھلاڑی تھے۔ اور تینوں ہی زکام میں مبتلا تھے۔"

"ارے ....": ڈاکٹر مکھن کے منہ سے نکلا "پھر تو تم بڑی مشکل میں پھنس گئے ہو گے؟"

"ہاں یقیناً": چالاک بوم نے جواب دیا۔ "میں قدرت کے اس اتفاق پر حیران ہو رہا تھا کہ اتفاق سے قسمت مجھ پر مہربان ہو گئی۔"

"یعنی؟" ڈاکٹر مکھن نے لقمہ دیا۔

"یعنی یہ کہ جب میں اشتہاری کمپنی کے مینجر کے گھر پہنچا تو تھوڑی دیر کے بعد میں نے جان بوجھ کر کلاسیکی موسیقی کی بات چھیڑ دی۔ مینجر نے سُروں، تالوں، راگنیوں، انتروں، ٹھاٹھوں اور مرکیوں کے بارے میں تقریباً آدھ گھنٹہ تک مجھے قیمتی معلومات فراہم کیں اور جب وہ مجھے ٹیپ ریکارڈر پر بلمپت میں راگ جے جے ونتی سُنانے لگا تو پتا ہے کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" ڈاکٹر مکھن نے بے صبری سے پوچھا۔

"پہلے پہل تو کچھ نہیں ہوا مگر جب میں نے غور کیا تو صاف سُنائی دیا کہ ٹیپ ریکارڈر میں تقریباً ایک درجن بکرے چلّا رہے تھے:"

"بکرے ...!" ڈاکٹر مکھن کے منہ سے کچھ اور نہ نکل سکا۔

"اونٹ کو مینجر ہی نے چرایا تھا۔ وہ اس وقت ساتھ والے کمرے میں بند تھا۔ مینجر کے لیے چوری کے بعد سب سے بڑا مسئلہ چارے کی خریداری کا تھا۔ گھر میں ڈنگر مویشی تو تھے نہیں، لہٰذا لوگوں کو فوراً شبہ ہو جاتا۔ اس بات کا انتظام اُس نے یوں کیا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بکروں کی آواز والا ٹیپ چلا دیتا۔ لوگ سمجھتے کہ گھر میں بکرے پلے ہوئے ہیں۔ ٹیپ چلنے کے بعد اس کی گھبراہٹ سے مجھے شبہ ہو گیا۔ جب میں نے بکروں کی عادات پر مینجر سے گفتگو کی تو پتا چلا کہ آپ بکروں کے متعلق بالکل کورے ہیں۔ میں نے فوراً جیب سے کیکر کے پتّے نکالے اور اسٹول پر چڑھ کر روشن دان میں رکھ دیے۔ تمہیں پتا ہوگا کہ کیکر اونٹوں کا مَن بھاتا کھاجا ہے۔ لہٰذا اگلے ہی لمحے پتّے وہاں سے غائب تھے۔ میں نے مینجر سے کہا کہ میاں آپس کا معاملہ ہے اب تو بتا دو۔ اس پر وہ گھبرا کر رنجیدہ ہو گیا اور مجھے تسوار پیش کرتے ہوئے درخواست گزار ہُوا کہ وہ ہی مجرم ہے اور اُسے معاف کر دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔" چالاک بوم نے اپنا بیان مکمّل کرتے ہوئے کہا۔

"مگر بوم" ڈاکٹر مکھن نے استفسار کیا۔ "اشتہاری کمپنی کے مینجر کو آخر کیا مصیبت آپڑی تھی اونٹ چرانے کی؟"

"وہ اونٹ اسپیشل قسم کا تھا سمجھے۔" چالاک بوم نے کہا "شمالی افریقہ سے منگوایا گیا تھا۔"

"لیکن پھر بھی ...؟" ڈاکٹر مکھن نے بولنا چاہا۔

"اشتہاری کمپنی کا مینجر اونٹ کو ایک اشتہاری فلم میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔"

"اشتہار میں؟ اونٹ کو؟"

چالاک بوم نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا "ہاں! وہ ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بنانا چاہتا تھا۔"

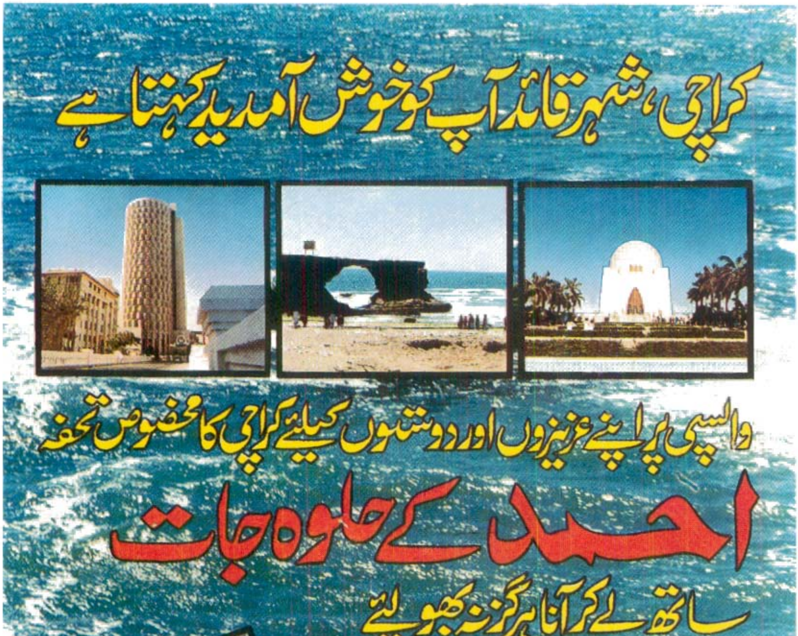
کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے
حلوہ جوزی
سوہن ڈیلائیٹ
فریش ویل
حبشی حلوہ
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA
MASS

a great new taste
mayfair Fruta Chew
Chew it, you'll love it.
Fruta Chew
Fruta Chew
mayfair – the sweet favourites

اس ماہ کے قہقہاتے لطائف

کھٹے میٹھے

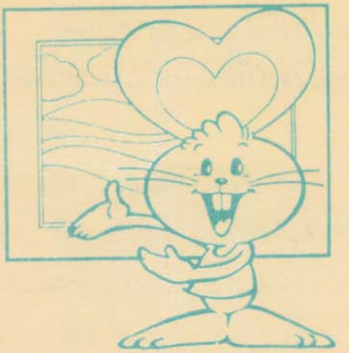

انعامی لطیفہ

ایک شخص کی ناک بہت موٹی تھی، جبکہ اُس کی مونچھیں بہت باریک اور پتلی سی تھیں جو اُس کے چہرے پہ بڑی عجیب سی لگتی تھیں۔ ایک صاحب نے اُن سے پوچھا۔

"کیوں جناب آپ نے اتنی موٹی ناک کے نیچے اتنی باریک مونچھیں کیوں رکھی ہیں؟"

"میں اپنے اُستاد کی نصیحت پر عمل کرتا ہوں۔" اُس شخص نے جواب دیا۔

اُن صاحب نے حیرت سے پوچھا "کون سی نصیحت...؟"

جواب ملا: "اُستاد نے کہا تھا "ہر اہم چیز کو انڈرلائن کر دیا کرو۔"

سید فیصل عمران، کراچی

ایک محلّے میں جاپانی کھلونوں کی نئی دُکان کھلی ایک باپ اپنے بیٹے کو کھلونے دلانے گیا۔ بیٹا اڑ گیا "میں وہی جاپانی گڈا لوں گا جو کونے میں رکھا ہے۔" جب بچے نے بہت ضد کی تو باپ نے سیلز مین سے کہا: "بھائی وہ جاپانی گڈا کتنے کا ہے؟" سیلز مین نے گھبرا کر کہا "شش شش، وہ دکان کا مالک ہے۔"

صبا سلیم، نارتھ ناظم آباد، کراچی

ایک بار مُلّا نصیرالدین کو جج بنا دیا گیا۔ ایک مقدمہ ان کے سامنے پیش ہُوا۔ پہلے فریق نے اپنا بیان دیا اور کہا "میں بے گُناہ ہوں۔"

مُلّا نصیرالدین نے کہا "تم سچے ہو۔"

دوسرے فریق نے احتجاج کرتے ہوئے اپنے دلائل پیش کیے تو۔

مُلّا نے کہا "تم بھی سچے ہو۔"

ایک شخص نے جو وہاں موجود تھا کہا "جناب دونوں فریق کیسے سچے ہو سکتے ہیں؟"
مُلّا نے کہا "تم بھی سچّے ہو۔"

عدنان فاروقی ، کراچی

اُستاد ۔ (انور سے) "اگر تم مغرب کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو جاؤ تو تمھارے بائیں ہاتھ پر کیا ہوگا؟"
انور۔ "جناب! چار انگلیاں اور ایک انگوٹھا۔"

ذوالفقار علی ضیاء ، ضلع پشاور

طلبہ جماعت میں پڑھ رہے تھے کہ ایک طالب علم کھڑا ہوا اور بولا۔
"اُستاد جی! ابھی میرے پاس شیطان آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ سب لڑکوں کو مارو۔"
"اُستاد نے کہا: "شیطان کی بات نہیں ماننی چاہیئے۔"
طالب علم بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر کھڑا ہوا اور بولا "شیطان پھر آیا تھا کہہ رہا تھا کہ سب لڑکوں کو سبق پڑھنے سے منع کرو"
اُستاد نے کہا کہ "ہمیں شیطان کی بات نہیں ماننی چاہیے۔" طالب علم بیٹھ گیا۔
تھوڑی دیر بعد پھر کھڑا ہُوا اور کہنے لگا "شیطان پھر آیا تھا کہہ رہا تھا کہ ماسٹر صاحب کے لیے دیسی گھی کے پراٹھے اور بھُنا ہُوا مُرغ لاؤ۔"
"کبھی کبھی شیطان کی بات بھی ماننی چاہیئے"
ماسٹر صاحب نے کھنکھارتے ہوئے طالب علم سے کہا

جمال عبدالناصر ، ایبٹ آباد

ایک دن مُلّا نصیرالدّین مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے۔ اتّفاق سے ان کے برابر والا آدمی نماز کے دوران بول اُٹھا۔
"اوہ... میں چولھا جلتا چھوڑ آیا ہوں۔"
دوسرے نے جھٹ کہا "نماز میں بولا نہیں کرتے۔" مُلّا جی بھی نہ رہ سکے۔ بولے۔
"خدا کا شکر ہے میں نہیں بولا۔ ورنہ میری نماز بھی ٹوٹ جاتی۔"

سیّد نزاکت علی شاہ ، مقام ، نامعلوم

ایک آدمی حج کر کے آیا تو لوگوں نے پوچھا۔
"وہاں کے لوگ کیسے تھے؟"
"بہت ہی نیک اور پرہیز گار۔" اُس نے کہا۔
"وہ کیسے؟" لوگوں نے پوچھا۔
"جب میں سمندری جہاز پہ واپس آ رہا تھا تو دو عربی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ آپس میں لڑ پڑے لیکن لڑنے کے دوران بھی وہ قرآن کی آیتیں پڑھ

رہے تھے:

سید محمد حسن نقوی، لاہور

اسکول ٹیچر نے بچّوں کو نیوٹن کا واقعہ سناتے ہوئے کہا: "ایک دن نیوٹن باغ میں سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ اُس کے سر پر ایک سیب گِرا اور یوں اُس نے کششِ ثقل کا اصول دریافت کیا۔" پھر اُس نے بچوں سے پوچھا۔

"آپ نے اس بات سے کیا سبق حاصل کیا؟"

ایک بچّہ بولا "یہی کہ اسکول سے غائب ہونا کتنی اچھی بات ہے۔ اگر نیوٹن اُس دن اسکول گیا ہوتا تو یہ اصول کبھی دریافت نہ ہوتا۔"

اسماء اسحاق تونسوی، تونسہ شریف

باپ نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا "بیٹا، محنت دنیا میں اپنا انعام ضرور دیتی ہے اب تم یہی دیکھو کہ میں جس دکان کا مالک ہوں اس پر دس روپے ماہوار ملازم ہوا تھا، مگر انتھک محنت سے آج اس کا مالک ہوں۔"

بیٹے نے جواب دیا: "درست ہے ابّو مگر اب وہ دور نہیں رہا۔ اب تو دکاندار ایک ایک پیسے کا حساب رکھنے لگے ہیں۔"

شہباز غنی، ملتان

امریکہ کے چند نامور سائنس دانوں نے ایک ایسی سلاخ تیار کی جو صرف خورد بین کے ذریعے نظر آتی تھی۔ انہوں نے یہ سلاخ جاپان بھجوائی۔ تاکہ وہاں کے ماہرین اس کے بارے میں اپنی رائے دے سکیں۔ یہ سلاخ ۶ ماہ بعد جاپان سے آگئی۔ جب امریکہ کے ماہرین نے اس کا مطالعہ کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس میں ایک سوراخ ہو چکا تھا۔ پھر انہوں اس سلاخ کو یہ سوچ کر پاکستان بھیجا کہ دیکھو وہاں کے ماہرین اس بارے میں کیا رائے دیتے ہیں۔ سلاخ ایک ہفتہ میں واپس آگئی۔ جب ماہرین نے اس کا معائنہ کیا تو وہ سب بے ہوش ہو گئے۔

ایک سائنس دان کو بڑی مشکلوں سے ہوش میں لایا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے سلاخ میں کیا دیکھا ماہر یہ کہتا ہوا پھر بے ہوش ہو گیا کہ انھوں نے سلاخ پر MADE IN PAKISTAN لکھ دیا ہے

فیصل جعفر، کوئٹہ

متعلقہ شخص کھلاڑی سے: "آپ نے کتنے عرصے ہاکی کھیلی؟"

کھلاڑی: "جناب پچھلے دس برس سے ہاکی کھیل رہا ہوں..."

افسر: "ماشاء اللہ، آپ کی بہترین کارکردگی میرا مطلب ہے ایک میچ میں کتنے گول کیے؟"

کھلاڑی: "سر کوئی نہیں!"

افسر: تو پھر آپ کے سفارشی ہونے میں شک نہیں"
کھلاڑی: "نو سر! میں گول کیپر ہوں"
راؤ یاور زمان ۔ لطیف آباد، حیدر آباد

ایک پارک میں دو بچیوں میں انتہائی خفیہ گفتگو ہو رہی تھی۔
ایک نے دوسری سے کہا: "تم یہ بات صرف نبیلہ، شکیلہ، شازیہ، نجمہ، شازیہ، شمائلہ اور نادیہ کو بتانا اور کسی کو نہیں"
محمد احسن منیر، ٹوبہ ٹیک سنگھ

مٹی کے تیل کی دکان بند تھی مگر اس پر رش بہت تھا۔ ہر شخص پہلے تیل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس دھکم پیل میں ایک بوڑھا جتنا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا لوگ اسے اتنا ہی پیچھے ہٹا دیتے۔ آخر تنگ آکر اس نے کہا۔
"اگر تم لوگ مجھے آگے نہیں جانے دو گے تو میں دکان نہیں کھولوں گا"
ولی محمد، کراچی

قائدِ اعظمؒ ایک مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ انگریز مجسٹریٹ طنز سے بولا۔
"مسٹر جناح آپ کی باتوں کو میں ایک کان سے سنتا ہوں اور دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں"۔
قائدِ اعظمؒ نے برجستہ جواب دیا۔
"لگتا ہے آپ کے دونوں کانوں کے درمیان کی جگہ خالی ہے"
خرم معراج، پرانہ سکھر

ندیم (نوید سے) "نوید تم نے یہ ٹائی کتنے کی لی ہے؟"
نوید "جب یہ ٹائی میں نے لی تھی تو اس وقت دکاندار دکان پر نہیں تھا"
عمران بشیر ضلع اٹک

ہوٹل کے بیروں اور ملازموں کو ٹپ دے دے کر ایک مسافر کا ناک میں دم آگیا۔ ملازم نت نئے طریقوں سے ٹپ وصول کرتے تھے۔ ایک روز وہ دروازہ بند کیے سوچ رہا تھا کہ اس لعنت سے کیونکر چھٹکارا حاصل کرے کہ دروازے پر دستک ہوئی پوچھا
"کون ہے؟"
"جناب! ایک ٹیلی گرام لایا ہوں" باہر سے آواز آئی
"ٹھیک ہے! دروازے کے نیچے سے اندر ڈال دو"
مسافر نے بستر پر بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔
"ناممکن ہے جناب! ٹیلی گرام ٹرے میں رکھا ہے" باہر سے آواز آئی۔
صائمہ ارم، لالہ رخ، واہ کینٹ

شوہر غصے سے بارہ بجے گھر آتے ہوئے

"خبردار بیگم جو تم نے آئندہ مجھے کسی شادی میں بھیجا۔ غضب خدا کا نکاح کا ٹائم ۹ بجے لکھا تھا اور رخصتی ہوئی گیارہ بجے۔"

بیوی: "کیوں کیا کھانا دیر سے ملا؟"

شوہر: "نہیں، قاضی صاحب ہکلے تھے۔"

طاہرہ ضیاء، النور سوسائٹی کراچی

ایک دفعہ تاتاریوں کے سردار چنگیز خاں سے کسی نے پوچھا۔

"اے خاقانِ تاتار تُو نے کبھی کسی پر رحم کیا ہے؟"

"ہاں" چنگیز خان نے جواب دیا "ایک دن میں گھوڑے پر سوار نیزہ اُٹھائے ایک ندی کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دیکھا ایک عورت ندی کے کنارے کھڑی روتے ہوئے مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ میں نے دیکھا اُس کا ننھا بچّہ ندی میں ڈبکیاں کھا رہا ہے مجھے عورت پر ترس آگیا۔ بچّہ کنارے سے زیادہ دُور نہ تھا۔ میں گھوڑے سے اُتر کر قریب پہنچا پھر میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر نیزہ اُس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ اور اُسے نیزے کی نوک پر اُٹھا کر اُس کی ماں کے سپرد کر دیا۔"

مرسلہ۔ سہیل احمد ثاقب، بشیر آباد

سپاہی (ڈرائیور سے) "جب میں نے تمہیں رُکنے کا اشارہ کیا تو تم رُکے کیوں نہیں؟"

ڈرائیور: "جناب میں سمجھا آپ مجھے سلام کر رہے ہیں۔"

فیصل سعید، اسلام آباد

ڈاکٹر (مریض سے) "آپ اچھے ہو جائیں گے بشرطیکہ آپ جمعہ میں جانے سے پرہیز کریں۔"

مریض: "جناب میں اپنے پیشے سے مجبور ہوں"

ڈاکٹر: "آپ کا پیشہ کیا ہے؟"

مریض: "جیب تراشی"

خرّم سلیم، کراچی

ایک خاتون (فقیر کو دس پیسے دیتے ہوئے) "یہ لو اور میری صحت کے لیے دُعا کرو۔"

فقیر (سوچتے ہوئے) محترمہ آپ کے چہرے کی زردی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دس پیسے کی دعا آپ کے لیے کافی نہیں ہوگی۔"

مظہر حیات، بھلوال

ایک دوست (دوسرے دوست سے) "ڈاکٹر نے دعویٰ کیا تھا کہ چھ ماہ کے اندر اندر میں اپنے پیروں پر چل سکوں گا۔"

دوسرا دوست "تو کیا دعویٰ سچ ثابت ہوا؟"

پہلا: "ہاں، اس نے تین بل بھیجے اور میں اپنی کار بیچنے پر مجبور ہو گیا اور آج کل پیدل سفر کر رہا ہوں"

خرّم محمید، راولپنڈی

ایک سائنس دان مینڈک پر تجربہ کر رہا تھا۔۔۔
سائنس دان جب بھی سیٹی بجاتا مینڈک اُچھل پڑتا
یہ عمل کافی دیر تک جاری رہا۔ پھر سائنسدان نے مینڈک
کی ایک ٹانگ کاٹ دی اور سیٹی بجائی۔ مینڈک
پھر اُچھل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد سائنس دان نے مینڈک
کی دوسری ٹانگ بھی کاٹ دی۔ نتیجتاً مینڈک مر گیا۔
مگر سائنسدان کو معلوم نہ ہُوا۔ اُس نے حسبِ معمول
سیٹی بجائی مگر مینڈک نہ اُچھلا۔ سائنس دان نے اپنی
ڈائری نکالی اور اُس میں اپنے تجربے کے متعلق لکھا۔
"تجربات سے ثابت ہُوا کہ اگر مینڈک کی دونوں
ٹانگیں کاٹ دی جائیں تو وہ بہرہ ہو جاتا ہے۔"

عرفان افتخار، اسلام آباد

ہمارے یہاں کی پڑھی لکھی عورتیں ہر لفظ کے
ساتھ ایس لگا دیتی ہیں جیسے۔
"ہمارے کراچیز "KARACHIES" میں بہت
سی مارکیٹس "MARKETS" ہیں۔ اسی طرح
ایک محفل میں ایک خاتون نے اپنی سہیلی کو دیکھ کر
پوچھا۔۔
"ارے روبینہ تم اکیلی ہی آئی ہو؟" اُن خاتون
(روبینہ) نے برجستہ جواب دیا۔
"نہیں تو میرے ساتھ میرے ہسبینڈز
"HUSBANDS" بھی آئے ہیں۔"

جواد تنویر۔ لاهور

ایک رسالے کے ایڈیٹر نے کہانی لکھنے والے
کو فون کیا اور کہا
"بھئی تمہارے لیے ایک اچھی اور ایک بُری
خبر ہے۔" کہانی نویس نے کہا
"پہلے اچھی خبر سناؤ۔"
"اچھی خبر یہ ہے کہ تمہاری کہانی پیراماؤنٹ کو اتنی
پسند آئی کہ وہ اُسے ہضم کر گیا۔"
کہانی نویس نے کہا: "اور بُری خبر کیا ہے؟"
ایڈیٹر نے جواب دیا: "بُری خبر یہ ہے کہ پیراماؤنٹ
میرے کتے کا نام ہے۔"

عائشہ سحر علی۔ فیڈرل بی ایریا کراچی

وکیل: "آپ کہتے ہیں کہ حادثہ جہاں ہُوا۔ وہاں سے آپ سو فٹ کے فاصلے پر تھے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کتنی دُور تک کی چیزیں صاف دیکھ لیتے ہیں:"

گواہ: "میں جب صبح سو کر اُٹھتا ہُوں تو سُورج کو آسانی سے دیکھ لیتا ہوں اور بتایا جاتا ہے کہ سورج ہماری زمین سے ۹ کروڑ تیس لاکھ میل دُور ہے۔"

صائمہ محمود، لاہور

ایک سخت مزاج میجر، جنگی مشق کے دوران ایک دریا میں جا گرا۔

ایک سپاہی اُس کے پیچھے دریا میں کُودا اور بڑی مشکل سے اُسے کنارے پر لے آیا۔ میجر نے دریا سے باہر آکر کہا: "تم نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر میری جان بچائی ہے۔ بتاؤ تمہارے اس احسان کا بدلہ کس طرح اُتاروں؟"

"سر!" سپاہی نے جواب دیا: "آپ مجھ پر اتنا احسان کیجیے گا کہ کمپنی کے جوانوں میں سے کسی کو پتا نہ چلے کہ میں نے آپ کو ڈوبنے سے بچایا ہے۔"

محمد اعجاز خاں، ملتان

دو دیہاتی جب شہر جانے لگے تو کسی نے اُن سے کہا۔

"تم دونوں شہر میں ساتھ ساتھ نہ چلنا اور کوئی پوچھے تو اُسے اپنی ذات نہ بتانا کیونکہ تم گوجر ہو اور شہر کے لوگ گوجر کو پسند نہیں کرتے۔" جب دونوں

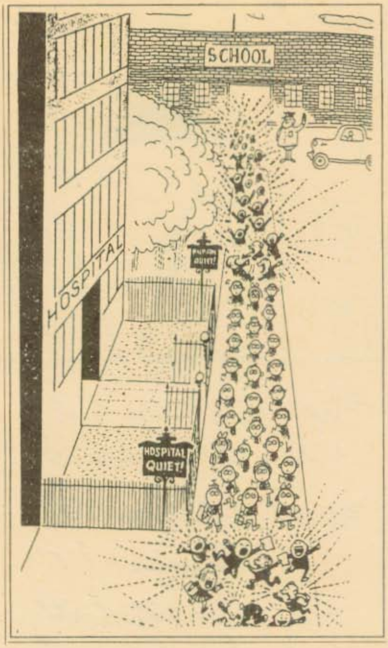

دیہاتی شہر پہنچے تو شہر کے کسی آدمی نے اُن میں سے ایک سے اُس کی ذات پُوچھی۔ اُس نے کہا۔

"میں پٹھان ہوں۔" "اور وہ جو تمہارے پیچھے آ رہا ہے، وہ کون ہے؟" شہری نے پوچھا۔

"وہ بھی گوجر ہے۔" پہلے دیہاتی نے معصومیت سے کہا۔

افضال حسین، ننکانہ صاحب

مریض (حکیم سے): "میرے دائیں ہاتھ میں خارش ہو رہی ہے۔"

حکیم: "یقیناً تمہارے پاس روپے پیسے آئیں گے۔"

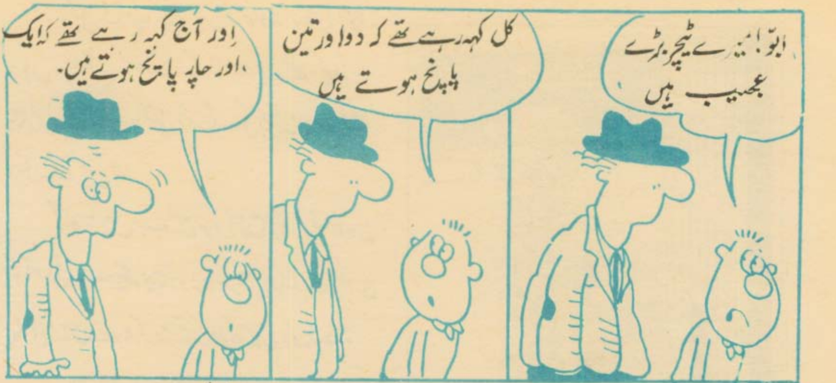

مریض: "میرے بائیں ہاتھ میں بھی خارش ہو رہی ہے"
حکیم: "لگتا ہے تم بہت مالدار ہونے والے ہو۔"
مریض: "میرے دائیں پیر میں بھی خارش ہو رہی ہے"
حکیم: "تم سفر کرنے والے ہو۔"
مریض: "میری پیٹھ میں خارش ہوتی ہے۔"
حکیم: "معاف کیجیے گا! مجھے لگتا ہے کہ آپ کو خارش کی بیماری ہے۔"

سلیمان نقی، کراچی

پروفیسر صاحب بڑی تیزی سے حاضری لے رہے تھے۔ ہر نام پر "یس سر!" کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اچانک ایک نام پر پوری کلاس میں خاموشی چھا گئی۔

"کیا پوری کلاس میں اس لڑکے کا کوئی دوست نہیں ہے۔؟ پروفیسر نے پوری کلاس کو خاموش دیکھ کر، مسکراتے ہوئے پوچھا۔

گل رعنا، کراچی

شاہ ایڈورڈ ہفتم کی ولی عہدی کا زمانہ تھا... انہوں نے اپنی والدہ ملکہ وکٹوریہ کو ایک خط لکھا جس میں اُن سے پانچ پونڈ مانگے تھے۔ ملکہ نے روپے بھیجنے کے بجائے اُنہیں لمبا چوڑا خط لکھا جس میں اُنہیں فضول خرچی سے بچنے اور کفایت شعاری کی تلقین کی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد ولی عہد نے ماں کو شکریے کا خط لکھا جس میں تحریر تھا "اب مجھے پانچ پونڈ کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ میں نے آپ کا خط بیس پونڈ میں فروخت کرکے اپنی ضرورت پوری کرلی ہے۔"

محمد اعجاز خان، ملتان

ایک نوعمر لڑکا ایک گدھے کو کھینچتا ہوا پولیس اسٹیشن کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ ایک سپاہی نے کہا "ارے میاں، تم اپنے بھائی کو کھینچ کر کیوں لے جا رہے ہو؟"

"مجھے ڈر ہے کہ یہ کہیں پولیس میں بھرتی نہ ہو جائے" لڑکے نے جواب دیا۔

عبدالصمد، کراچی

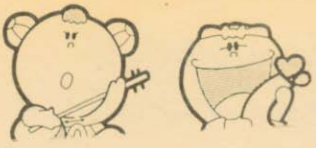

نازیہ
رمضان

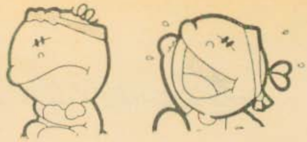

چٹکلے

عید کیک بنانے کی ترکیب

اگر آپ نے سچ مچ یہ کیک بنالیا اور پھر کھا بھی لیا تو اس کی ذمّے داری ادارے پر نہ ہوگی

اشیائے ضرورت :۔ بیکنگ ٹرے، میدہ (اگر میدہ نہ ہو تو ٹیلکم پاؤڈر سے کام چلایا جاسکتا ہے) چینی ایک پلیٹ، انڈے، دودھ، ایسنس (خوشبو)

ترکیب :۔ سب سے پہلے بیکنگ ٹرے میں ٹیلکم پاؤڈر چھڑکیے۔ چینی کی پلیٹ کو پتھر سے توڑ کر باریک پیس لیجئے اسے بھی ٹرے میں ڈال دیں۔ اب انڈے توڑیئے۔۔۔۔۔

ارے، مگر نہیں! یہ پیارے پیارے خوبصورت انڈے خراب ہو جائیں گے۔ ایسا کریں کہ انہیں سجاوٹ کے لئے اوپر ہی سجادیں۔

اب خوشبو ڈالیں، ایسنس نہ مل سکے تو کوئی اچھا سا پرفیوم چھڑک دیں۔ اب اس ٹرے کو آپ اوون میں رکھ دیں۔

لیجئے آپ کا کیک تیار ہو رہا ہے اتنی دیر میں آپ چاہیں تو میوزک سن لیں یا ایک آدھ ٹیلی فون بھی کرلیں۔

اب اوون سے کیک نکال کر اس کا بغور معائنہ کریں۔ اگر اس کی حالت آپ کو ٹھیک نہ دکھائی دے تو کسی قریبی بیکری سے اچھا سا کیک منگا کر مہمانوں کی تواضع کریں۔

اگر مچھر کان میں چلا جائے تو :

۱۔ سر کے بل کھڑے ہو جائیں مچھر پھسلتا ہوا جب کان کے کنارے پر پہنچے تو جھٹ اسے پکڑ کر پنجرے میں قید کر دیں۔

۲۔ کان کے قریب بین بجائیں۔ بے شک پردہ پھٹ جائے لیکن جب مچھر جھومتا ہوا باہر نکلے تو اس کو پکڑ کر گدگدی کریں۔ وہ ہنسنے کے لئے منہ کھولے تو اس کے منہ میں مچھر مار دوائی ڈال دیں۔

۳۔ کان کے اندر فینائل ڈالیں تاکہ مچھر تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو جائے۔

۴۔ اپنے سر پر برف رکھیں اور کان میں یخ ٹھنڈا پانی انڈیلیں۔ اس طرح مچھر کو نمونیا ہو جائے گا۔ اور وہ ٹھٹھر کر مر جائے گا۔

۵۔ کان کے اندر ایک اور مچھر پکڑ کر ڈال دیں تاکہ دونوں میں خوب لڑائی ہو اور دونوں جاں بحق ہو جائیں۔

۶۔ اگر مچھر زندہ ہاتھ آ جائے تو اسے نیشنل اسٹیڈیم میں سرِ عام پھانسی دے دیں۔

راہ نُما
سچی قرآنی کہانیوں کا
خوبصورت مجموعہ

قرآن کی سچی کہانیاں
بچوں کی تربیت میں
نہایت اہم کردار
ادا کر سکتی ہیں
راہ نُما کے حصول کے لیے
دس روپلے کے
ڈاک ٹکٹ ارسال کیجیے ،

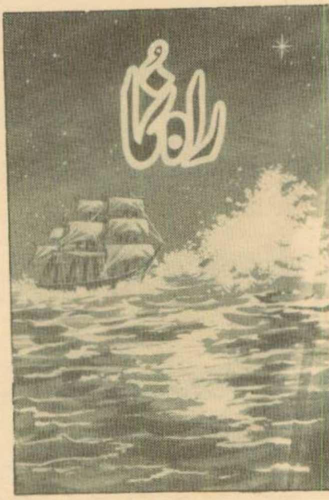

سائیکل کی سواری

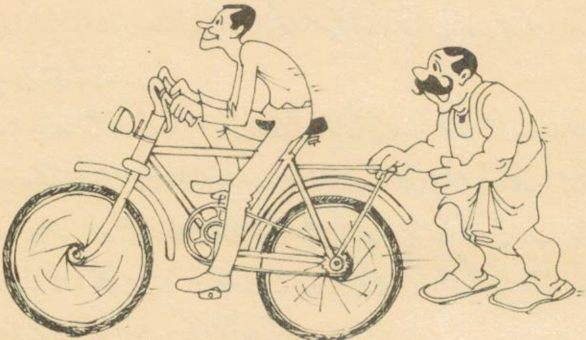

ہم سڑک پر چاروں شانے چت پڑے تھے اور بچّے تالیاں بجا رہے تھے۔

شین فاروقی

منی بس کو دیکھ کر ہمیں علامہ اقبالؒ یاد آجاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ علاّمہ زندہ ہوتے تو وہ پاکستان میں منی بس کو متعارف نہ ہونے دیتے۔ کیونکہ منی بس اُن کے فلسفۂ خودی کے خلاف ایک خطرناک سازش ہے۔ منی بس میں سفر کرنیکے بعد مسافر اپنی اُس خودی سے محروم ہوجاتا ہے جسے علاّمہ نے اپنی شاعری میں بلند کرنے کی تلقین کی ہے مزید یہ کہ منی بس کا مسافر علاّمہ کا شاہین بننے کے بجائے ۸ کا ہندسہ بن جاتا ہے اسلئے ہم نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ دفتر کا سفر آئندہ سے سائیکل پر طے کیا جائے۔ سائیکل جو غریبوں کی سواری ہے۔ جس سے صحت بہتر رہتی ہے اور جس پر سفر کا ٹکٹ بھی نہیں لگتا۔

سائیکل پر دفتر جانے کا خیال جب ہم نے بیگم کے سامنے بیان کیا تو وہ بولیں۔

"اے لو! اس بڑھاپے میں تم سائیکل چلا کر دفتر جاؤ گے؟" ہم نے بیگم کے بڑھاپے کے طعنہ کو ان کی کمزوری کے باعث نظر انداز کیا اور کہا۔

"اس عمر میں سائیکل چلانا جرم ہے کیا؟"

"جرم تو نہیں، مگر سائیکل چلانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان میں طاقت ہو، تم تو خود مشکل سے چل پاتے ہو، سائیکل کیا چلاؤ گے؟" بیگم نے اس بار ہماری صحت پر حملہ کیا تھا آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جو چیز انسان کے پاس نہ ہو، یا کم ہو وہ اُسے بہت عزیز ہوتی ہے۔ چنانچہ بیگم نے جب ہماری عزیز ترین کمزوری پر حملہ کیا تو ہمیں طیش آ گیا اور ہم نے طے کر لیا کہ ایک ہفتہ میں سائیکل چلانا سیکھ کر بیگم صاحبہ کو اپنا جملہ واپس لینے پر مجبور کر دیں گے اگلے روز ہم نے دفتر سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے لی۔

محلّے میں چوہدری چراغ دین کی سائیکلوں کی دکان تھی۔ چراغ دین سائیکلوں کی مرمت کے علاوہ کرایے پر بھی سائیکلیں دیا کرتے تھے۔ چراغ دین جسمانی اعتبار سے بھولو خاندان کے چشم و چراغ لگتے تھے۔ تاہم لوگ ان کے پہاڑ جیسے جسم کے باعث اُنکی جانب متوجہ نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ اُن کی مونچھیں تھیں جو ہر کسی کو اُن کی جانب دیکھنے اور زیرِ لب مسکرانے پر مجبور کرتی تھیں۔ محلّے بھر میں مشہور تھا کہ چراغ دین اپنی مونچھوں کو اصلی گھی پلاتے ہیں۔ اور ہر صبح مونچھوں کے گول گول اختتام پر مرغی کے انڈے رکھ کر مونچھوں کو کسرت کراتے ہیں۔

دفتر سے واپس آتے ہی ہم چراغ دین کے پاس پہنچے اُور اُن سے اپنا مدعا بیان کیا۔ ہماری بات سن کر وہ مسکرائے بولے "باؤ جی کیوں مذاق کرتے ہو؟"

"کیا مطلب؟ ہم نے آپ سے پہلے کبھی مذاق کیا؟"

"نہیں جی مذاق کیا آپ نے تو کبھی سلام بھی نہیں کیا"، چراغ دین نے ہمارے پچھلے رویہ کی طرف اشارہ کیا

"بہرحال تم ہمیں سائیکل چلانا سکھاؤ"، ہم نے درگزر کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"مگر آپ کریں گے کیا سائیکل سیکھ کر۔ میرا مطلب ہے اس عمر میں؟" چراغ دین جرح کرنے لگا۔

"خودی کو بلند کریں گے؟"، ہم نے کہا۔

"جی کس کو بلند کریں گے؟" چراغ دین نے آنکھیں میچتے ہوئے سوال کیا۔

"بھئی تمہیں اس سے کیا؟ تم بس ہمیں سائیکل چلانا سکھاؤ"، ہم نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے کل صبح شیرینی لے کر آجایئے گا۔"

"شیرینی!"، ہم نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جناب عالی کیا اُستاد کا منہ میٹھا کئے بغیر ہی سائیکل چلانا سیکھیں گے"۔

"اچھا اچھا!" ہم نے معاملہ کو نپٹاتے ہوئے کہا۔

ہم نے سُن رکھا تھا کہ سائیکل سیکھنے میں چوٹ ضرور لگتی ہے۔ بلکہ اگر چوٹ نہ لگے تو سائیکل چلانی ہی نہیں آتی۔ اِس خیال سے ہم نے چھوٹا موٹا فرسٹ ایڈ بکس تیار کر لیا۔ تاکہ بہ وقت ضرورت کام آئے۔

رات بھر ہمیں سائیکل سے متعلق طرح طرح کے خواب آتے رہے۔ کبھی ہم دیکھتے کہ ہم سائیکل پر سوار چلے جا رہے ہیں، اور بیگم سمیت محلے کے تمام لوگ سڑک کے دونوں جانب کھڑے ہمیں حیرت سے دیکھ رہے ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں کبھی دیکھتے کہ ہماری سائیکل فضاء میں ہوائی جہاز کی طرح اُڑ رہی ہے کبھی دیکھتے کہ ہم ٹرک سے ٹکرا گئے ہیں۔ آخری خواب دیکھا تو ہم بوکھلا کر اُٹھ بیٹھے گھڑی پر نظر گئی تو معلوم ہوا کہ ساڑھے پانچ بج رہے ہیں۔ جلدی جلدی تیار ہوئے اور شیرینی کے ساتھ چراغ دین کے گھر جا پہنچے۔ چراغ دین نے سائیکل اُٹھائی اور ہمارے ساتھ محلے کے پارک کا رُخ کیا۔ ابھی ہم چراغ دین کی گلی ہی میں تھے کہ ایک نامراد کالی بلّی دیوار کو د کر ہمارا راستہ کاٹتی ہوئی گذر گئی۔ چراغ دین کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ بولا "باؤ جی واپس چلیں۔ بلی راستہ کاٹ گئی ہے۔" جی میں آیا کہیں کہ بلّی نے راستے کو کاٹا ہے ہمیں یا تمہیں نہیں۔ مگر استاد کا احترام آڑے آگیا۔ بیگم نے ہمیں واپس آتے دیکھا تو یوں مسکرائیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ ؏ لوٹ کے بدّھو گھر کو آئے

اگلی صبح ہم اُستاد چراغ دین کے ساتھ محلّے کے پارک میں جا پہنچے۔ اُستاد نے سائیکل کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور ہمیں سائیکل پر سوار ہونے کو کہا۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح سوار ہوں۔ بچپن میں ایک بار گدھے پر سوار ہوئے تھے۔ لہٰذا اُسی تجربے کی روشنی میں ہم سائیکل پر اُچک کر سوار ہو گئے۔ ہمیں فوراً ہی احساس ہو گیا کہ گدھے کی سواری بہر حال سائیکل سے بہتر ہوتی ہے۔

اُستاد کے حکم پر ہم نے پیڈلوں پر پاؤں مارے تو لگا جیسے سائیکل ہمارے سینے پر چڑھی آ رہی ہے۔

"اُستاد یہ تو ہمارے سینے پر چڑھی آ رہی ہے۔" ہم پکارے

"کوئی بات نہیں! آپ بھی تو سائیکل کے سینے پر چڑھے ہوئے ہیں"، استاد نے الف لیلیٰ کے جن کی طرح قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ یکایک ہماری نظر اُن بچوں پر پڑی جو اسکول جا رہے تھے۔ اور ہمیں سائیکل چلاتا دیکھ کر تماشہ دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔ بچوں پر نظر پڑتے ہی ہم نے پیڈلوں پر پاؤں مارنا بند کر دیئے۔ بچوں نے یہ دیکھا تو قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور تالیاں بجانے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہم بھول گئے

کہ ہم اِس وقت بستر پر نہیں بلکہ سائیکل پر بیٹھے ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ آسمان نیچے اور زمین اوپر ہوگئی۔ ہم نے بچوں کو وہ سلواتیں سنائیں کہ انہیں وہاں سے بھاگتے ہی بنی۔ اُستاد نے نہایت عقیدت سے ہماری خراشوں پر کریم لگائی اور ہم نے طے کیا کہ کل سے پارک کے بجائے اُس سڑک پر سائیکل چلانا سیکھیں گے جس پر ٹریفک کم ہوتا ہے۔

دوپہر کو ہمارا بڑا بیٹا اسکول سے آتے ہی اپنی ماں سے لپٹ کر رونے لگا۔ معلوم ہوا کہ اُس کے کئی دوستوں نے صبح کے وقت ہمیں سائیکل سیکھتے دیکھ لیا تھا اور انہوں نے آج سارا دن اُس کا خوب مذاق اُڑایا۔ ہمارے بیٹے نے دھمکی دی کہ اگر ہم نے سائیکل سیکھنے کا عمل ترک نہ کیا تو وہ کل سے اسکول جانا بند کر دے گا۔

دوسری طرف ہماری سائیکل سیکھنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے محلّے میں پھیل گئی۔ شام کو جب ہم سبزی لینے کے لئے گھر سے نکلے تو ایک محلّے دار ملے، سلام کے بعد بولے۔

"بھائی صاحب سنا ہے آپ سائیکل چلانا سیکھ رہے ہیں۔" انہوں نے یہ جملہ کچھ اس طرح کہا جیسے ہم سائیکل چلانا نہیں بلکہ جیب کاٹنا سیکھ رہے ہوں

"جی ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔" ہم نے جواب دیا۔ انہوں نے منہ سے تو کچھ نہ کہا صرف ہمیں سر سے پیر تک مسکرا کر دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔

اگلے روز اُستاد نے ہمیں تین ہی گھنٹے میں اس قابل کر دیا کہ ہم استاد کی پکڑ دھکڑ کے بغیر سائیکل چلانے لگے مگر ہمیں ابھی سائیکل پر خود سوار ہونا اور اُترنا نہیں آیا تھا۔ چنانچہ یا تو اُستاد سائیکل پکڑ کر اُتارتے چڑھاتے تھے۔ یا پھر ہم خود کسی اونچے سے پتھر وغیرہ کا سہارا لے کر یہ ضروری فرض انجام دیتے تھے۔

پانچویں روز اُستاد نے ہمیں سائیکل پر بٹھا کر زور دار دھکا دیا اور بولے "مبارک ہو باؤ جی آپ سائیکل سیکھ گئے ہیں۔" اُستاد کی اِس حوصلہ افزائی نے ہمارے اندر ہوا بھر دی اور ہم تابڑ توڑ سائیکل چلاتے ہوئے روانہ ہو گئے ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ہمیں سامنے سے مرزا آتے دکھائی دیئے۔ مرزا ہمارے بچپن کے دوست اور محلّے دار تھے۔ سُود خوری نے اُنہیں موٹا کر دیا تھا۔ وہ شاید اس وقت وزن کم کرنے کے لیے ہواخوری کر رہے تھے۔

ہم نے مرزا کو دور سے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "ایک طرف کو ہو جاؤ مرزا ہم ابھی اناڑی ہیں ٹکر لگ گئی تو ہمیں مت کہنا" مرزا نے ہمیں سائیکل چلاتے دیکھا تو حیرت سے ہمیں یوں گھورا جیسے ہم انسان سے مرغ بن گئے ہوں۔

"اماں ٹھہرو تو......" مرزا ہمارے قریب آتے ہوئے بولے۔

"ابھی ٹھہر نہیں سکتے مرزا،" ہم نے گھنٹی بجاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں ٹھہر سکتے۔ کیا پولیس پیچھے لگی ہے،" مرزا ہمارے ساتھ دوڑتے ہوئے بولے۔

"ٹھہر گئے تو ہمیں سائیکل پر کون بٹھائے گا۔ ابھی ہمیں سائیکل پر خود سوار ہونا اور اُترنا نہیں آیا ہے۔" ہم نے سائیکل کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ مرزا پاؤں پٹخ کر رُک گئے۔

اِس کے اگلے روز استاد نے ہمیں اکیلے ہی پریکٹس کرنے کو کہا۔ ہم سائیکل لے کر سڑک پر پہنچ گئے اور ایک اونچے پتھر کے ساتھ سائیکل کھڑی کر کے اُس پر سوار ہو گئے اور لگے زور سے پیڈل چلانے۔ اناڑی ہونے کے باعث ابھی ہم میں اعتماد کی کمی تھی چنانچہ جیسے ہی کوئی بس یا کار وغیرہ آدھے میل پرے بھی نظر آتی۔ فوراً اپنی سائیکل کو سڑک کے کنارے کر لیتے اور گھنٹیاں بجا بجا کر اُس گاڑی کے ڈرائیور کو بتاتے کہ ابھی ہم اناڑی ہیں۔ ذرا دھیان سے۔

ایک میل کا چکر لگا کر ہم گھر واپس جانے کے لئے مڑے ہی تھے کہ سامنے سے ایک رکشہ آتا نظر آیا۔ ہم نے حفظِ ماتقدّم کے طور پر زور زور سے چیخ کر رکشہ ڈرائیور کو ضروری ہدایات جاری کیں اور فوراً اپنی سائیکل کو سڑک کے کنارے کر لیا۔

تبھی نہ جانے کہاں سے ایک منی بس ہمارے پیچھے سے نمودار ہوئی اور دھوئیں کا ایک بادل چھوڑتی ہوئی نکل گئی۔ معلوم نہیں راستہ نظر نہ آنے کے باعث ہم دوبارہ سڑک کے بیچ آ گئے تھے۔ یا سامنے سے آتے ہوئے رکشے کا ڈرائیور مذاقاً ہماری طرف نکل آیا تھا۔ ہمیں یہ بھی یاد نہیں کہ ہماری سائیکل رکشہ سے ٹکرائی تھی۔ یا رکشہ ہماری سائیکل سے ٹکرایا تھا۔ یا بیک وقت دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔

ہمیں ہوش آیا تو ہم بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ ہمیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ ہمارے ہاتھوں، پیروں اور چہرے کا وزن بڑھا ہوا ہے۔

بعد میں ہمیں بیگم نے بتایا کہ وہ خود اُس رکشہ پر سوار ہو کر ہمیں سائیکل چلاتے ہوئے دیکھنے آئیں تھیں ہم نے کئی بار بیگم کے سامنے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اُس ٹکراؤ کی ساری ذمہ داری رکشہ ڈرائیور اور اُس کمبخت منی بس والے کی تھی۔ ہم تو نہایت اطمینان اور اعتماد کے ساتھ سائیکل چلا رہے تھے۔ بیگم ہماری یہ بات سنتیں اور مسکرا دیتیں، اور کہتیں۔

"بہر حال جو کچھ بھی ہو خود کی حفاظت خودی کی حفاظت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔" شاید حادثے کے بعد ہم اچانک بیگم کے لئے اہم ہو گئے تھے۔

اب ہم دوبارہ منی بس میں سفر کرنے لگے ہیں۔ البتہ ہم منی بس میں سوار ہوتے ہی اپنی خودی کو کلوروفارم سنگھا دیتے ہیں۔ اور جھک کر ۸ کا ہندسہ بن جاتے ہیں۔

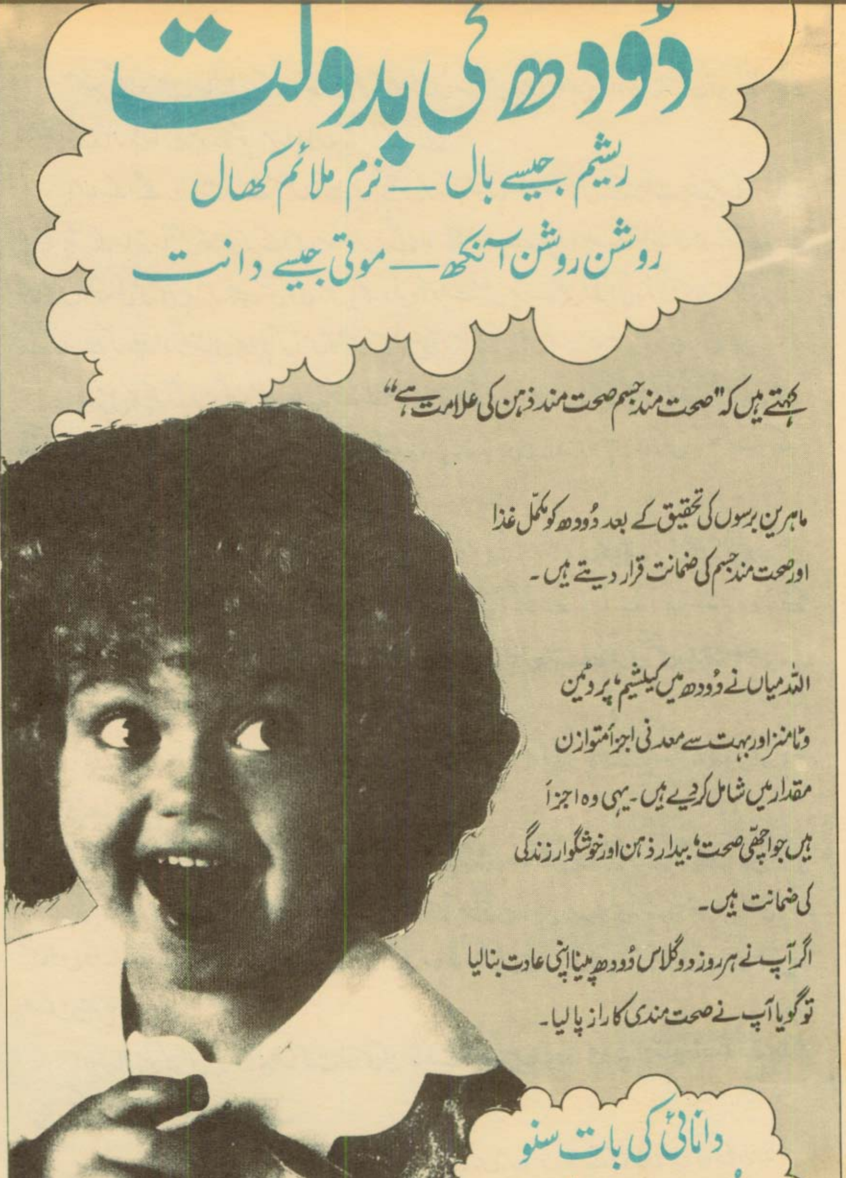
دُودھ کی بدولت
ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال
روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت
کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"
ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمّل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔
اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزاً ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔
اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔
دانائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو
اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

منتخب شوخ لکیریں

ایسے دلچسپ کارٹونز جنہیں سمجھنے کے لیے
کسی وضاحت کی ضرورت نہیں... بس ذرا سی ذہانت شرط ہے

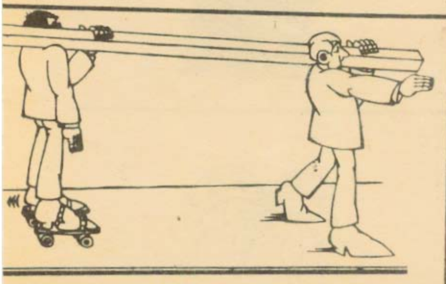

TOLET

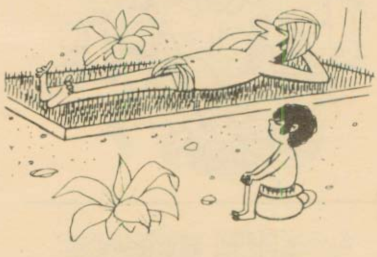

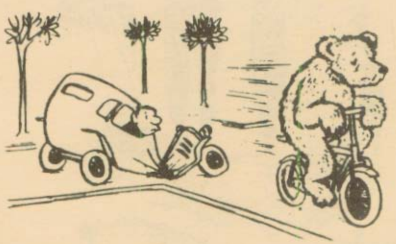

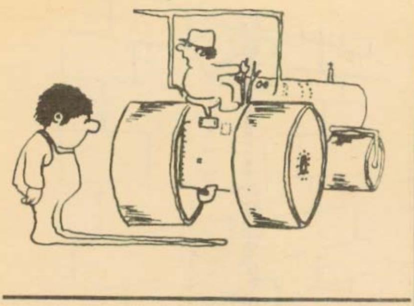

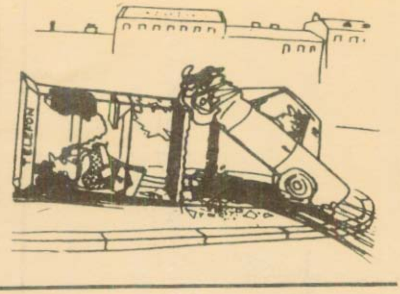
TELEFON

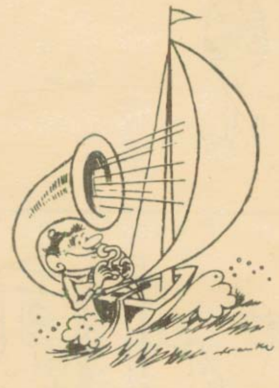

V.I.P. CLUB

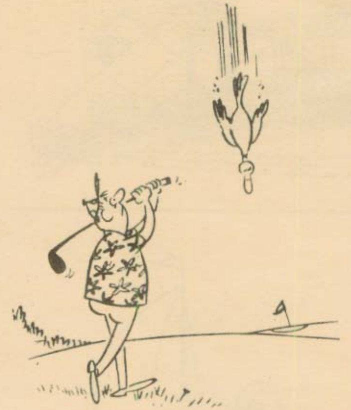

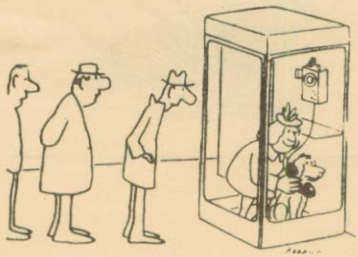

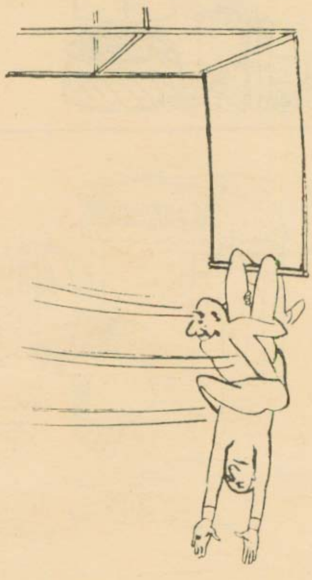

ملا نصیرالدین

جس کے لطیفے ہر ملک اور قوم میں مشہور ہیں

مرسلہ :۔ مجیب ظفر انوار

گول ٹوپی اور اونچے سے کُرتے والے بڑے پائنچوں والا پاجامہ پہنے مُلّا نصرالدین سے آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ مُلّا عربی ادب کے لافانی کردار ہیں۔ جن کے لطائف سن سن کر آج بھی لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ آج ہم آپ کو انہی مُلّا نصرالدین کی زندگی کے چند دلچسپ واقعات سنا رہے ہیں۔

ایک افطار پارٹی

رمضان کے مہینے میں شہر کے قاضی نے مُلّا نصرالدین کو افطار کی دعوت دی۔ مُلّا بہت خوش ہوئے اور حامی بھر لی۔ انہوں نے روزوں کی گنتی کرنے کے لئے بازار سے ایک مٹکا خریدا۔ ہر روز سحری کے وقت اُٹھ کر وہ مٹکے میں ایک کنکر ڈال دیتے۔ مُلّا نے سولہویں روزے کی حامی بھری تھی اور ابھی مٹکے میں کل چودہ کنکر پڑے تھے قسمت کی خرابی دیکھئے کہ ایک رات مُلّا نصرالدین کی شریر نواسی نے انہیں مٹکے میں کنکر ڈالتے دیکھ لیا۔ لہٰذا وہ صبح ہی صبح باہر گئی اور گلی میں سے ڈھیر سارے کنکر لاکر مٹکے میں ڈال دیئے۔

اگلے دن جب مُلّا جی نے کنکر گنے تو اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مٹکے میں کل ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) کنکر تھے۔ خیر ـــــ اُنہیں اتنا تو یاد تھا کہ آج قاضی کے ہاں افطار پارٹی ہے۔ لہٰذا مُلّا نصرالدین خوب بن ٹھن کر روانہ ہو گئے۔

قاضی کے ہاں پہنچے تو وہاں دوسرے بہت سے مہمان بھی موجود تھے۔ مُلّا جی کی نگاہیں کھانوں پر جمی تھیں۔ قاضی نے یہ دیکھا تو مسکرانے لگے اور ہنس ہنس کر بولا! "مُلّا جی ..... روزے تو پورے جا رہے ہیں نا ؟" مُلّا چونک کر بولے! "الحمد اللہ ......"

"آج بھلا کونسا روزہ ہے ..... ؟" قاضی نے انجان بن کر پوچھا۔ مُلّا کی نگاہوں میں مٹکے کے کنکر گھوم گئے۔ جو انہوں نے دوپہر کو گنے تھے۔ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے! "ایک سو اٹھارہواں !" یہ سن کر

قاضی اور دستر خوان پر موجود ہر شخص کے قہقہے ضبط کے باوجود بلند ہو گئے ۔

تمہارا نام پڑھا

عید کے دِن مُلّا نصرالدین صبح ہی سے گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ تاکہ دوستوں کی خاطر مدارت نہ کرنی پڑے۔ وہ پچھلے دروازے سے نکلے اور سامنے کے دروازے پر تالا ڈال دیا۔ عید کی نماز کے بعد جب دوست احباب اُن سے ملنے آئے تو دروازے پر تالا سب کا منہ چڑا رہا تھا۔ مُلّا کا ایک ہوشیار دوست زید اُن کی اس حرکت کو سمجھ گیا۔ لہٰذا اُس نے کوئلے سے دروازے پر "احمق ۔ پاجی" اور نہ جانے کیا کیا لکھ دیا۔ مُلّا نے کھڑکی سے زید کی یہ حرکت دیکھ لی۔ وہ باہر نکلے اور دروازے پہ لکھی عبارت کو پڑھ کر فوراً زید کے ہاں آ پہنچے۔ زید نے انہیں دیکھ کر ہنس کر پوچھا۔

"کیوں نصرالدین —— خیر تو ہے کہیے کیسے آنا ہوا ؟"

مُلّا جھٹ سے بولے ! "بندۂ خدا —— اپنے دروازے پر تمہارا نام لکھا دیکھا۔ میں سمجھ گیا تم ملنے آئے تھے۔ بس جھٹ چلا آیا۔"

میری رضائی کے لئے

رات کا وقت تھا۔ مُلّا نصرالدین محوِ خواب تھے۔ اچانک باہر گلی میں زور دار شور کی آوازیں آنے لگیں مُلّا کی بیوی نے اُنہیں جھنجھوڑ کر اُٹھایا کہ ذرا باہر کی سُن گن تو لے کر آؤ۔ مُلّا بیوی سے بہت ڈرتے تھے۔ چار و ناچار اُٹھے۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ رضائی لپیٹ کر باہر آئے۔ دو آدمی آپس میں لڑ رہے تھے۔ انہوں نے جو مُلّا کو رضائی میں لپٹا دیکھا تو جھٹ لڑائی روک اُن کی رضائی اتار کر بھاگ لیے۔ مُلّا اول فول بکتے اندر آئے۔

بیوی نے بے تاب ہو کر پوچھا "دونوں کس لئے لڑ رہے تھے ؟"

"میری رضائی کے لئے۔" مُلّا بے بسی سے بولے ۔

انصاف

ایک شام مُلّا نصرالدّین نہا دھو کر خوب سج سنور کر اپنے دوست زید کے ہاں روانہ ہوئے آج اُن کا ارادہ

زید کے ہاں رات کا کھانا کھانے کا تھا۔

زید نے مُلّا کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور فوراً موٹا تازہ مرغا بھون کر اِن کے آگے رکھ دیا۔ زید کے تین بچے اور بیوی بھی دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ بچوں میں دو لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔

زید بولا، "مُلّا جی...... آپ کا انصاف مشہور ہے۔ یہ بھُنا مرغا ہم سب گھر والوں میں برابر تقسیم کر دیجئے! مگر کسی کی حق تلفی نہ ہو"۔ مُلّا نصر الدین نے کچھ دیر سوچا پھر حامی بھر کر قاب اُٹھالی۔

سب سے پہلے انہوں نے مرغے کا سر کاٹا اور زید کو دیتے ہوئے بولے! "تم اِس کے گھر کے سربراہ ہو، لہذا یہ سر تمہارا ہے"۔ پھر دونوں پر والی جگہوں کا تھوڑا سا گوشت نوچ کر دونوں لڑکیوں کو دیتے ہوئے بولے! "تم ایک نہ ایک دِن بیاہ کر اِس گھر سے پروں کی طرح اُڑ جاؤ گی، اِس لئے یہ پَر تمہارے ہوتے"۔ اب مُلّا نے بازو اُٹھایا اور لڑکے کے حوالے کر کے بولے! "تم اپنے باپ کے دست راست (مضبوط سہارا) ہو۔ اِس لئے یہ بازو کھاؤ......"۔ اب مُلّا نے مرغ کے پنجے اُٹھائے اور زید کی بیوی کو دے کر بولے! "آپ کے بغیر یہ گھر چل نہیں سکتا۔ لہذا آپ یہ پیر کھائیے"۔ اتنا کہہ کر مُلّا نے باقی مرغ اُٹھا لیا اور مزے لے لے کر کھانے لگے۔

میں اتنا امیر ہو جاؤں گا!......

ایک دِن مُلّا نصر الدین گھومتے گھماتے ایک اجنبی آبادی میں جا پہنچے۔ وہاں دیکھا کہ ناریل کے درخت قطار اندر قطار تھے۔ جن پر بڑے بڑے ناریل لگے ہوئے تھے۔ مُلّا کی تو رال ٹپک پڑی جھٹ سے ایک درخت پر جا چڑھے اور لگے ناریل توڑنے۔ لیکن ناریل بہت مضبوطی سے لگا تھا۔ مُلّا نے جو زور لگایا تو پھسل گئے اور ناریل سے لٹک گئے اب عالم یہ تھا کہ کئی فٹ بلند درخت کے اوپر مُلّا کسی ناریل کی طرح پتوں کو مضبوطی سے پکڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ اور مدد کے لئے واویلا کر رہے تھے۔ اُن کی ٹانگیں ہوا میں معلّق لہرا رہی تھیں۔

اتنے میں ادھر سے ایک اونٹ والا گذرا۔ اُس نے جو مُلّا کو اِس حال میں دیکھا تو اُس نے اُونٹ کو درخت کے نیچے کیا اور اونٹ کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر مُلّا کی ٹانگیں پکڑنا چاہیں۔ اچانک اونٹ کو تازہ گھاس نظر آئی۔ اور وہ اُدھر چل دیا۔ اونٹ والا بے چارہ مُلّا کی ٹانگوں کو پکڑے لٹکا رہ گیا۔ اور شور مچانے لگا اور سب سے اوپر ناریل، ناریل سے چمٹے ہوئے مُلّا اور مُلّا کے پیروں سے لٹکتا اونٹ والا۔ دونوں مل کر خوب شور مچانے لگے۔ اور "مدد مدد" پکارنے لگے۔

ذرا دیر بعد ایک ہاتھی سوار ادھر سے گذرا۔ مُلّا نے اِسے مدد کے لئے پکارا۔ ہاتھی والا بھی ہاتھی لے کر

درخت کے نیچے آیا اور احتیاط سے اونٹ والے کی ٹانگیں پکڑ کر نیچے کھینچیں۔ اتنے میں ہاتھی نیچے سے نکل گیا۔ اب تو عالم یہ تھا کہ مُلّا اور اونٹ والے کے ساتھ ہاتھی والا بھی اس ناگہانی میں مبتلا ہو گیا۔ وہ چیخ کر مُلّا سے بولا! "اے شخص ناریل مت چھوڑنا نیچے آ کر میں تمہیں ایک ہزار اشرفیاں دوں گا۔" ملا یہ سن کر بڑے خوش ہوتے۔ اونٹ والا بولا، "جناب ناریل کو مضبوطی سے پکڑے رہیئے گا، نیچے اُتر کر میں آپ کو شہد کے مرتبان اور تین ہزار اشرفیاں انعام میں دوں گا ......" یہ سُن کر ہاتھی والا بولا!

"میں چار دوں گا۔"

"پانچ ہزار۔" اونٹ والے نے کہا۔

"چھ ہزار۔" ہاتھی والے نے کہا۔

"سات ہزار۔"

"آٹھ ہزار۔"

"نو ہزار۔"

بحث بڑھ گئی تو مُلّا کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ انہوں نے ناریل چھوڑتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا، "پھر تو میں اتنا امیر ہو جاؤں گا۔" ہاتھ چھوڑ کر بازو لہراتے ہی شاخ ہاتھ سے چھوٹی اور سب کے سب "پٹا پٹ" پکے آم کی طرح نیچے آ رہے۔

پھر تم کہاں ہو ......؟

ایک دِن مُلّا نصیر الدّین کا جی تِکّے کھانے کو چاہا۔ وہ بازار سے دو سیر تِکّے بوٹی بنوا کر لے آئے اور گھر لا کر بیگم کے حوالے کر دیئے۔ بیوی نے تِکّے بنائے اور سینکتے وقت جو چکھے تو بڑے مزے دار تھے۔ چکھنے چکھنے ہی میں وہ ذرا ہی دیر بعد آدھے سے زیادہ تِکّے کھا گئی۔ رات کے کھانے کا وقت ہوا تو مُلّا دستر خوان پر آ کر بیٹھے۔ تِکّے دیکھے تو دُو چار ہی تھے۔ وہ حیرت سے بولے! "بیگم دو سیر گوشت کہاں گیا؟"

بیوی ڈر گئی۔ اچانک ایک بلّی اِدھر سے گذری۔ بیوی فوراً بولی! "بلّی کھا گئی۔" تڑپ کر اُٹھے۔ اُسے دبوچا، ترازو کے پلڑے میں رکھا۔ دوسرے پلڑے میں دو سیر کا باٹ رکھا۔ بلّی خوب موٹی تازی تھی۔ وہ بھی دو سیر کی نکلی۔ مُلّا حیران ہو کر بیوی سے بولے! "بیگم اگر یہ بلّی ہے؟ تو پھر گوشت کہاں ہے اور اگر یہ گوشت ہے تو پھر بلّی کہاں ہے؟ اور اگر یہ دونوں ہیں تو پھر تم کہاں ہو؟"

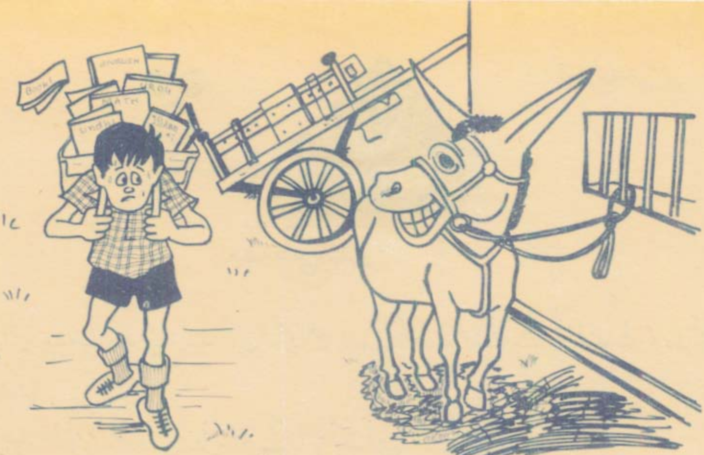

میرا اسکول

محمد امان خان دل

اب تو اُٹھتا نہیں اسکول کا بستہ مجھ سے
ہے گدھا شہر کے دھوبی کا بھی اچھا مجھ سے
صرف جھاڑو ہی لگانے پہ یہ موقوف نہیں
مِس تو منگواتی ہیں گھر بار کا سودا مجھ سے
دینا پڑتا ہے نیا جیب سے اپنی لاکر
ٹوٹ جاتا ہے جب اسکول کا مٹکا مجھ سے
یہ روش جلد نہ بدلے گی تو کچھ روز کے بعد
علم کا ٹوٹ نہ جائے کہیں رشتہ مجھ سے
گھر پہ امّی کی تو اسکول میں میڈم کی تڑی
کیسا تقدیر کا روٹھا ہے ستارہ مجھ سے
"این" سے ہوتا ہے شروع مِس نے کہا تھا نالج
میں نے بتلا دیا میڈم نے جو پوچھا مجھ سے
حل کراتا رہا ابّو سے سوالوں کے جواب
مِس تو کھاتی رہیں ہر گام پہ دھوکا مجھ سے
میڈیم یوں تو ہے اسکول کا انگلش لیکن
پار لگتا نہیں اُردو کا بھی پڑھنا مجھ سے
خستہ دیوار ہے ٹوٹی ہوئی چھت بوسیدہ
حال اسکول کا پوچھو نہ خدارا مجھ سے
یہ مرا حال وہ خود دیکھ رہے ہیں پھر بھی!
میرے ابّو کو توقع نہیں کیا کیا مجھ سے
کیسے ہوگا بھلا دُنیا میں اُجالا اے دلؔ
دُور ہوتا نہیں جب گھر کا اندھیرا مجھ سے

آخری حصّہ

قسمت گھر

مصطفیٰ چاند

پروفیسر کے، کے، آہ اکیلے بیٹھے آڑھی ترچھی لکیروں میں کھوئے ہوئے تھے کہ حسنات نے اندر داخل ہوکر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، برخوردار!" پروفیسر آہ نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"جناب!" حسنات نے کہنا شروع کیا: "نہ تو میرا پڑھائی میں دل لگتا ہے نہ کھیل میں، تمام دن طبیعت بے چین رہتی ہے اور بعض اوقات تو میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ ایک جنگلی بھینسا میرے پیچھے بھاگ رہا ہے پھر اچانک ہی ایک گھوڑا جس کے منہ کی جگہ انسانی چہرہ ہے، ہاتھ میں تیر لے کر بھینسے پر حملہ کر دیتا ہے۔

بھینسا مر جاتا ہے ۔ میں کچھ دُور جاتا ہوں کہ ایک اور بھینسا میرے پیچھے لگ جاتا ہے ۔ پھر ویسے ہی ایک گھوڑا عقب سے نمودار ہوتا ہے اور بھینسے پر تیر چھوڑ کر اُسے ہلاک کر دیتا ہے ۔ میں کچھ اور آگے نکلتا ہوں کہ اچانک پھر ایک بھینسا میرے پیچھے بھاگنے لگتا ہے، وہی گھوڑا پھر نکلتا ہے اور تیر سے بھینسے کو مار ڈالتا ہے میں ابھی چند قدم ہی چلتا ہوں کہ پھر وہی بھینسا ۔۔۔!"

"اوہ ۔۔۔ ہو ۔ خدا کے لیے بس کرو! میں جانتا ہوں، سارے بھینسے ایسے ہی مرے ہوں گے ۔۔۔" پروفیسر آہ شاید اس خواب سے جھلا گیا ۔

"لیکن پروفیسر صاحب! یہی تو آپ نہیں جانتے کہ آخری بھینسے کا کیا بنا ۔۔۔؟" حسنات نے بلا کی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا ۔

"کیا بنا ۔۔۔؟" پروفیسر کے ۔ کے ۔ آہ نے غصے سے کہا ۔

"جناب! جُوں ہی میں نے تیسرا قدم آگے بڑھایا کہ درختوں کی اوٹ سے وہی بھینسا نکلا اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح مجھ غریب کے پیچھے لگ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ جنگلی بھینسا میری کمر پر ٹکر مار کر مجھے ریڑھ کی ہڈی کا مالک ہونے سے محروم کر دیتا ۔۔۔!"

"وہی گھوڑا نکلا ہوگا، اُس نے تیر چھوڑا ہوگا اور بھینسا مر گیا ہوگا ۔۔" پروفیسر کے ۔ کے ۔ آہ نے چیخ کر اُس کی گفتگو میں مداخلت کی ۔

"ہرگز نہیں ۔۔۔!" حسنات نے حیران ہوتے ہوئے بیان کیا ۔ "جُوں ہی بھینسا میری کمر پر ٹکر مارنے آیا، اُسی وقت میری آنکھ کھُل گئی ۔۔۔"

"شکر خدا کا، کہ وہ انسانی شکل والا گھوڑا نمودار نہیں ہوا ۔۔" پروفیسر آہ نے سخت برہمی سے کہا ۔ "ورنہ وہ بے چارہ کب تک تیر چلاتا رہتا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے پاس تیر ہی ختم ہو جاتے ۔"

"بہرحال پروفیسر صاحب! یہ صورتحال ہے میرے ساتھ ۔" حسنات نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا ۔

"تمھارا تعلق کس سے ہے ۔۔۔" پروفیسر آہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا ۔

"جناب! پشاور سے ہے ۔۔" حسنات نے دھیرے سے بتایا ۔

"میں ستارے کی بات کر رہا ہوں ۔" پروفیسر آہ غصے سے بولا ۔

"جی ٹارس (TAURUS) ہے ۔۔۔"

"کیا یہ کوئی تیرھواں ستارہ دریافت ہوا ہے ۔۔۔" پروفیسر آہ نے یک لخت چشمہ اُتار کر سوال کیا ۔

"نہیں جی! ثور سے تعلق ہے، انگلش میں اسے ...!"

"اچھا اچھا... میں سمجھتا ہوں، میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا ..." پروفیسر آہ نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کہا اور زائچوں میں کھو گئے۔ تقریباً دس منٹ کے بعد انھوں نے سر اُٹھایا اور بولے "برخوردار! تمھارے خواب اور تمھارے ستارے کے حوالے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ تمھارے حلقۂ احباب میں قوس ستارے کے حامل افراد تمھیں مسلسل نقصان پہنچانے کے درپے ہیں ..."

"آپ کا ستارہ کون سا ہے ...؟" حسنات نے اچانک پروفیسر آہ سے سوال کر دیا۔

"اتفاق سے قوس ...!" پروفیسر آہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں، پھر تو آپ کی پیش گوئی درست لگتی ہے ..."

"کیا مطلب ...؟" پروفیسر آہ ایک دم چونک گئے

"جی ... جی ... کچھ نہیں ... میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب بھلا مجھے کیا کرنا ہوگا؟" حسنات نے بات بدلی۔

"وہ بھی بتائیں گے ... ذرا دم تو لینے دو ...!" پروفیسر کے، کے، آہ نے طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا اور حسنات ناگواری کے ساتھ میز پر بکھری کتابوں کو گھورنے لگا۔

"مجھے بھی وہی ہدایات دی ہیں جو تمھیں دی تھیں" حسنات نے طویل انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "مگر تم دیکھ لینا، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ نہ تو منگل میرے لیے خطرناک ثابت ہوگا، نہ جمعرات کو مجھے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کم ازکم میں تو اس پروفیسر آہ کی باتوں میں تو آنے سے رہا۔"

"تم یقیناً نقصان اُٹھاؤ گے" طاہر نے یقین سے کہا۔

"ہاں بلکہ خاصا بڑا نقصان، پروفیسر آہ کی پیش گوئیاں سو فیصد درست نکلتی ہیں بھول گئے تم میرے سارے واقعات ...!" ارشاد نے بھی طاہر کی حمایت کی۔

"ہمارا مستقبل، قدرت نے چھپا دیا ہے۔ ہم نہ تو آنے والے لمحے کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہیں، نہ آنے والے کل کے بارے میں۔ پھر یہ پروفیسر آہ جیسے لوگ جنھیں اپنی قسمت کا علم نہیں، وہ بھلا ہمارے آنے والے کل کو کیونکر دیکھ سکتے ہیں" حسنات نے اٹل لہجے میں کہا۔

"بہرحال! تم اپنا بُرا بھلا خود سمجھتے ہو ..." طاہر نے سنجیدگی سے کہا۔

"یار! تم یوں ہی مفت میں مارے جاؤ گے ..." ارشاد نے بھی اُسے نصیحت کی۔

"تو تمھارا کیا خیال ہے، مارا بھی جاؤں اور پیسے بھی دوں" حسنات نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جیسے تمھاری مرضی ---!" دونوں بُڑبُڑاتے ہوئے چلے گئے۔

حسنات کے ہاتھ تو گویا کوئی کھیل آ گیا تھا۔ وہ ہر ایک سے پروفیسر آہ کی پیش گوئیاں اور اپنے ردِّ عمل کے تذکرے کرتا پھرتا۔

پھر وہ دن بھی آ ہی گیا جس دن کو پروفیسر آہ نے خطرناک قرار دیا تھا۔

منگل کو حسنات صاف ستھرے کپڑے پہن کر تیار ہوا اور بازار کی طرف نکل گیا۔

شام کو گلی میں کرکٹ کا میچ اپنے زوروں پر تھا۔ اشتیاق کی گیندوں پر آصف دھڑا دھڑ چھکے لگا رہا تھا۔ باؤنڈری پر تو احتشام دوڑ دوڑ کر تھک گیا۔ اُسی وقت خبر آئی کہ حسنات کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ آن کی آن میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ارشاد اور طاہر کو جب حسنات کے حادثے کا علم ہوا تو وہ ایک طرف نکل کر باتیں کرنے لگے۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا، اس کا یہی انجام ہوگا۔ پروفیسر آہ نے اُسے پہلے سے خبردار بھی کیا تھا، مگر پتا نہیں، خود کو کیا سمجھتا تھا۔" ارشاد نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"ہاں! وہ تو پروفیسر آہ اور ستاروں کی چال کو مذاق سمجھتا تھا۔" طاہر نے بھی اپنی رائے دینا ضروری سمجھا۔

چند ہی گھنٹوں بعد حسنات کو ایمبولینس گاڑی گھر چھوڑ گئی۔ اُس کی دائیں کہنی پر چوٹ آئی تھی۔ چوٹ معمولی نوعیت کی تھی مگر پھر بھی احتیاط لازم تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس کے اطراف تمام دوست کھڑے اُس کا حال پوچھ رہے تھے۔

"دیکھ لیا تم نے!" طاہر نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ "پروفیسر آہ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ منگل کے دن احتیاط کرنا، مگر تم تو انھیں فراڈ سمجھ رہے تھے۔"

"اب تو آگیا یقین، کہ ستارے سچ کہتے ہیں۔ دراصل اس میں تمھارا قصور نہیں، اس ستارے کے لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں۔" ارشاد نے بھی تبصرہ کیا۔

"تم لوگ بھی خوب ہو، ایک تو بے چارہ زخمی پڑا ہے اوپر سے تم لوگ کوسنے دے رہے ہو۔" شمیم نے غصّے سے کہا۔

"کہنے دو انھیں شمیم! یہ لوگ تو بہت معصوم ہیں۔ بے چارے تاروں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔" حسنات نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اونہہ...!" طاہر نے غصّے سے ہنکارا بھرا۔

"ابھی تم مجھے ٹھیک ہونے دو، پھر پروفیسر آہ کو میں ایسے تارے دکھاؤں گا کہ سب نانیچے بھول جائیں گے" حسنات نے طاہر کے ناگوار رویے پر مسکراتے ہوئے کہا۔
"دیکھو... دیکھو حسنات! تم پھر ستاروں کے خلاف بات کر رہے ہو، کہیں ایسا نہ ہو..." ارشاد بولتے بولتے چُپ ہوگیا۔
"اچھا اب خدا کے لیے اس کی جان چھوڑو، اسے کچھ دیر تو آرام کر لینے دو..." حسنات کی امّی نے سب کو مخاطب کر کے کہا چند ہی لمحوں بعد سارے کمرے سے جا چکے تھے۔
ٹھیک ہونے کے بعد حسنات نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عمران انکل کو اس حادثے سے آگاہ کیا۔ اس دوران پروفیسر کے، کے، آہ بڑی شہرت پا چکا تھا۔ لوگ دور دور سے اس سے اپنے ستاروں کے متعلق پوچھنے آتے تھے اور پروفیسر کے، کے، آہ کی فیس اسی رفتار سے بڑھتی جا رہی تھی

شام سات بجے کے قریب پروفیسر کے، کے، آہ کے کمرے میں کافی تعداد میں لوگ بیٹھے اپنی باری کے منتظر تھے۔ سب سے آگے بیٹھا ہوا آدمی تقریباً تیس سال کا تھا۔
"ہاں برخوردار!" پروفیسر آہ نے اُسے مخاطب کیا۔
"جناب! زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ پریشانیاں نہیں گھٹتیں" اُس نے گڑگڑانے کے انداز میں کہا۔
"کون سا ستارہ ہے، تمھارا...؟" پروفیسر آہ نے چشمے کے شیشے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔
"جناب! ستارہ بہت بُرا ہے"
"کیا مطلب...؟" پروفیسر آہ نے چونکتے ہوئے کہا۔
"جناب، صرف ایک ستارہ ملا ہے۔ میں اے، ایس، آئی عمران ہوں..."
"اے... اے... ایس..." پروفیسر آہ ہکلاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔
"جی ہاں! اے، ایس، آئی، عمران! بس سوچا پروفیسر کے، کے، آہ کا کیک بنانا چاہیئے۔ سو حاضر ہوا ہوں" عمران انکل نے ہنستے ہوئے کہا۔
"م... م... مگر..." پروفیسر کے، کے، آہ نے ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔
"بس کرو جیون! تم نے بہت ڈرامہ کر لیا" یہ کہتے ہی عمران انکل نے اُس کے چہرے سے نقلی مونچھوں اور وِگ کا گچھا کھینچ لیا۔

"اوہ..." سارے لڑکے جو اپنی باری کے منتظر تھے، حیران نظروں سے تمام منظر دیکھ رہے تھے۔

"یہ دیکھئے! آپ کی قسمت بہت اچھی ہے کہ آپ کے مزید پیسے ضائع ہونے سے بچ گئے۔ عمران انکل نے پروفیسر کے، کے، آہ کی چمکتی چندیا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو انکل! کیا یہ سب...؟"

"ہاں، ہاں۔ بھئی، یہ تو عادی مجرم ہے۔ کئی مرتبہ پکڑا جا چکا ہے، ہر بار یہ نیک بننے کا عہد کرکے جیل سے چھوٹتا ہے اور ہر بار پکڑا جاتا ہے" عمران انکل نے وضاحت کی۔

"پھر تو انھوں نے نام بالکل غلط لکھا..." وقار نے گفتگو میں پہلی بار حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "کے، کے، آہ کی جگہ یہ کے، کے، ایم کر لیتے..."

"کے، کے، ایم... کیا مطلب...؟" حسن نے فوراً پوچھا۔

"بھئی، قسمت کا مارا..." وقار نے وضاحت کی تو سب نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

"نہیں بھئی! یہ بھی کچھ بُرا تو نہیں کیونکہ آہیں تو یہ بھر ہی رہے ہیں کچھ آہیں ہم ان کی تھانے میں نکلوائیں گے" عمران انکل نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"دیکھ لو طاہر! یہ ہیں پروفیسر آہ، جن کے ستارے نے ان کے لیے آج کا دن خوش قسمتی کی علامت قرار دیا تھا اور آج یہ پکڑے گئے..." حسنات کی بات پر ارشاد اور طاہر نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

"انکل! ان کی حادثے والی تمام پیش گوئیاں درست کیسے ثابت ہوئیں" بدر نے سوال کیا۔

"دراصل یہ تنہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ چند اور ساتھی بھی ہیں اب یہ جس جس کو مخصوص دنوں میں گھر میں روکتا تھا اُس میں سے اگر کوئی باہر نکل جاتا تو اس کے کارندے خود ہی اُس کو ٹکر مار کر حادثے کا نام دے دیتے۔ یوں اس کی شہرت بھی خوب ہو گئی..." عمران انکل نے وضاحت کی۔ سب حیران رہ گئے...

"اچھا بھئی، ہم پروفیسر آہ کو لے جا رہے ہیں اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج سے آپ سب کی قسمتیں پھر سے آزاد ہیں" عمران انکل نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ پروفیسر آہ کو لیے باہر نکل گئے۔

موٹاپا کم کرنے کے لئے ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ کم از کم تیس دن
گھڑ سواری کریں۔ تیس دن بعد افاقہ ہوا مگر کس کو ــــــــ؟

جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا... بتادو نا!
ناز
پان مصالحہ
ASHRAF PRODUCTS.
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE

مکی ماؤس سے
خیالی انٹرویو

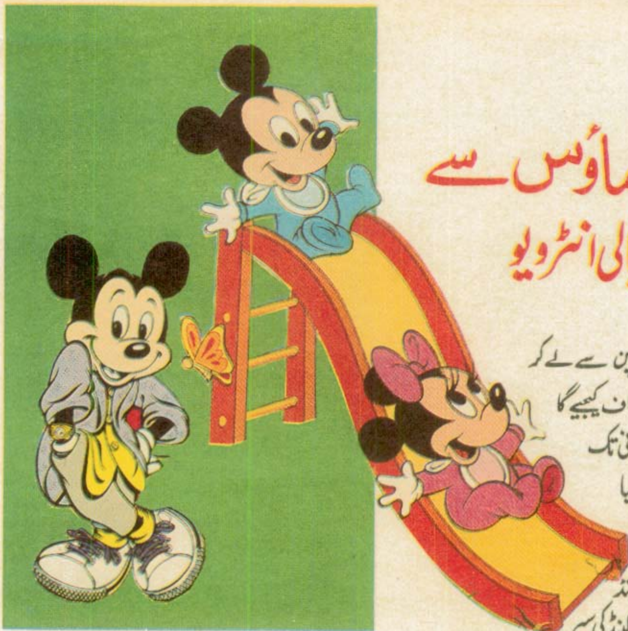

اپنے بچپن سے لے کر
بڑھاپے تک، معاف کیجیے گا
جوانی تک بلکہ نوجوانی تک
ہم نے کئی بار ارادہ کیا
کہ کبھی امریکہ جائیں
اور وہاں جاکر ڈزنی لینڈ
کی سیر کریں۔ ڈزنی لینڈ کی سیر
کا خیال ہمیں ٹی وی کے بعض پروگراموں میں چوہے
کے ہم شکل ایک اُچھلتے کُودتے اور پھُدکتے ہُوئے
کردار کو دیکھ کر آیا تھا... اس کردار کا نام اگر میں
بھول نہیں رہا تو مکی چوہا۔ یا شاید مکی ماؤس
ہے۔ ایک ہی بات ہے، ماؤس بھی تو
چوہے ہی کو کہتے ہیں۔ مکی ماؤس کسے اچھّا
نہیں لگتا ؟ خاص طور پر بچّے تو دیوانے ہیں
اس شوخ اور شریر کے، اور کیوں نہ ہوں ؟
ہے بھی تو کیسا اسمارٹ چوہا۔

ہم بھی مکی ماؤس کی محبّت میں ایسے گرفتار
ہوئے کہ ہر وقت اُس سے ملاقات کے خواب
دیکھنے لگے۔
مکی ماؤس سے ہماری ملاقات ہُوئی تو
مگر کب، کہاں اور کیسے، اس کی بابت آپ وعدہ

کریں کچھ نہیں پوچھیں گے ؟ بس آپ کو ہم اتنا بتا دیں کہ شارع کتابیات سے ہوتے ہوئے فوٹو بستی پہنچے، یہاں سے ہم نے خیال پور کا تانگہ کرائے پہ لیا اور اُس پہ بیٹھ کر تصور نگر چلے گئے، ڈزنی لینڈ اُس کے بہت قریب ہے، بس پھر کیا تھا پلک جھپکتے ہی ہم ڈزنی لینڈ میں تھے، مکی ماؤس ہمارے سامنے تھا اور ہمیں دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

ہمیں یہ خوش فہمی تھی کہ شاید مکی ماؤس کی نظر میں ہم کوئی اہم ترین آدمی ہیں، اسی لیے وہ خوشی سے پھُولے نہیں سمار رہا مگر صاحب مکی ماؤس نے تو یہ کہہ کر ہمارے سارے ارمانوں پر اوس ڈال دی کہ "آپ کو زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی آپ کوئی ایسی توپ چیز تو ہیں نہیں۔ میں تو اس لیے خوش ہو رہا ہوں کہ مجھے میرے بنانے والے نے اس لیے بنایا تھا کہ میں سب کو خوش رکھ سکوں۔ خاص طور پر بچوّں کو"

توکس نے بنایا تھا... تمہیں ذرا بتاؤ تو...؟

پہلے آپ اپنی زبان درست کریں پھر مجھ سے سوال کریں، مکی ماؤس مجھ پر خفا ہونے لگا۔

بھئی میں نے ایسی کیا غلطی کر دی... کچھ بتاؤ تو...؟

تمہیں پتا نہیں ہے کہ بڑوں کو "آپ" کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے!

ارے تو تم بڑے کب ہو مجھ سے... تم تو چھوٹے سے ہو بھئی، میں نے مکی ماؤس کو منانے کی کوشش کی...

جی نہیں میں خاصا بڑا ہوں... تو سُنو مجھے سب سے پہلے میرے خالق والٹ ڈزنی نے ۱۹۲۷ء میں سوچا اور پھر میری تیاری کا عمل شروع ہو گیا۔ یوں گویا میں اکسٹھ سال کا ہو گیا ہوں۔ ۱۹، ستمبر ۱۹۲۸ء کو والٹ ڈزنی نے مجھے مینیسٹن کالونی تھیٹر امریکہ میں متعارف کروایا۔

پھر کیا ہُوا؟ میں نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

پھر کیا ہُوا... پھر وہی ہوا جو ہونا تھا، میں اس قدر پسند کیا گیا کہ تھوڑے عرصے میں ہی شہرت کے آسمان پہ جا پہنچا۔ میرے متعلق اس طرح کی پیش گوئیاں کی جانے لگیں کہ مکی ماؤس عنقریب دُنیا کا مشہور ترین کردار بن جائے گا۔ اور وہی ہُوا۔

آپ کو تخلیق کرنے کی وجہ کیا تھی؟ آپ نہ بنائے جاتے تو ایسی کون سی قیامت آجاتی...؟

یہ سوال تو میں آپ کے متعلق بھی کر سکتا ہوں، آپ نے دُنیا میں آکر کون سا تیر مار لیا...؟

میں نے تو بچّوں کے لیے کہانیاں اور مضامین لکھے، آنکھ مچولی شروع کیا۔ اتنا خوبصورت رسالہ شائع کرنا آپ کے خیال میں یہ معمولی کام ہے؟

اگر آپ کے نزدیک یہ سب کچھ اہم کام ہے تو پھر میں تو آپ سے بہت آگے ہوں، میں نے دُنیا کے لاکھوں کروڑوں بچّوں کو خوش کیا ہے۔ اُن کے تھکے ہوئے چہروں کو رونق بخشی ہے۔ جو بچّے پڑھتے لکھتے ہیں اور پڑھ پڑھ کر تھک جاتے ہیں، وہ مجھے دیکھ لیں تو اُن کی ساری تھکاوٹ دُور ہو جاتی ہے۔ بچّے میرے دیوانے ہیں اور میں بچّوں کا دیوانہ کچھ آیا سمجھ میں آپ کی... ؟

جی ہاں جی ہاں سمجھ میں آگیا... میں دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہُوا مجھے اقبالؒ کا وہ مصرعہ بڑی شدّت سے یاد آنے لگا... نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں۔

اچھا مکی ماؤس... اب ایسا کرو کہ تم اس عظیم آرٹسٹ کا تعارف کروا دو جس نے تمہیں سوچا اور بنایا۔

بھئی دیکھو ویسے تو ہر چیز کا خالق اللہ ہے مگر اللہ نے بعض چیزیں اپنی مخلوق کے ہاتھوں بنوائی ہیں۔ جیسے مجھے میرے آرٹسٹ والٹ ڈزنی نے تخلیق کیا۔ والٹ ڈزنی امریکہ کا رہنے والا عظیم آرٹسٹ تھا۔ اس کا تعلق ہالی وُڈ اسٹوڈیوز سے بھی رہا۔ والٹ ڈزنی کو کارٹون اور اینی میشن فلم کا خالق بھی کہا جاتا ہے۔ مجھے تخلیق کرنا والٹ ڈزنی کا سب سے عظیم کام قرار پایا اور اُس کے اعتراف کے طور پر انہیں ۱۹۳۲ء میں اسپیشل اکیڈمی ایوارڈ بھی ملا۔ جو یقیناً بہت بڑا اعزاز ہے۔ ڈزنی لینڈ جسے بچّوں کی جنّت بھی کہا جاتا ہے اُسے بھی والٹ ڈزنی کے نام پر رکھا گیا ہے۔

کوئی اور کردار جو والٹ ڈزنی نے تخلیق کیا ہو... ؟

ہاں میرے علاوہ مشہور ترین کردار ڈونلڈک بھی انہی کی تخلیق ہے۔ اس کے علاوہ گوفی، رُوفی پلوٹو دی ڈاگ، اور چند اور بھی ہیں

بتا کیوں نہیں رہے... اور کون سے کردار ہیں اور اس قدر شرمانے کی کیا ضرورت ہے؟

بس کیا بتاؤں اور وہ بھی ہیں نا... (شرماتے ہوئے) منی ماؤس،

منی ماؤس سے آپ کا کیا رشتہ ہے... کچھ بتائیں گے؟

بھئی منگیتر ہیں ہماری اور کیا رشتہ ہے... آپ نے تو گھریلو معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا... جائیے ہم نہیں بولتے آپ سے...

والٹ ڈزنی نے جو مکی ماؤس تیار کیا تھا، کیا آج بھی وہی مکی ماؤس ہے، یا کچھ فرق آگیا ہے؟

یقیناً بہت فرق آگیا ہے... لیکن اتنا نہیں کہ مجھے پہچانا ہی نہ جا سکے، اب دیکھیے نا، والٹ ڈزنی نے میری آنکھیں بیضوی بنائی تھیں جواب گول ہو کر رہ گئی ہیں۔ دُم چھوٹی ہوگئی ہے۔ کان بھی گول ہو گئے ہیں، چلنے کے انداز میں فرق آگیا ہے لیکن مجھے ان ساری تبدیلیوں سے خوشی نہیں ہوئی۔ میں تو چاہتا ہوں، مجھے میرے خالق نے جیسا بنایا ویسا ہی رہوں۔ یہ تو آپ انسان ہیں جو خالق کے منشا کے خلاف کام کر کے خوش ہوتے ہیں۔

اتنی شہرت، اتنے چرچے مکی ماؤس کے حصے میں آسکتے ہیں۔ ہم نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا... کہیں ایسا تو نہیں اتنی شہرت سے دماغ خراب ہو کر رہ گیا ہو...؟

شہرت سے گھٹیا لوگوں کا دماغ خراب ہوتا ہے... میرا تو خیال ہے کہ میں مشہور ہوا ہی اسی لیے ہوں کہ میں ہمیشہ چھوٹا بن کر رہا... اتنی شہرت کے باوجود اپنے فرض سے غافل نہ ہُوا۔ ہر آنے والے کو ہنساتا رہا۔ سردی ہو کہ گرمی، دن ہو کہ رات، میرا کام آپ کو خوش رکھنا ہے اور میں اس کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ ہاں شہرت پسند لوگ مجھ سے حسد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کاش ہم اتنے مشہور چوہے بھی ہوتے تو کیا بُرا تھا۔ ایسے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اللہ نے اُنہیں اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ مگر یہ لوگ شہرت کی خاطر چوہا تک بننے کو تیار ہیں۔

مکی ماؤس، تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم بہت عظیم چوہے ہو، یقیناً پوری چوہا برادری کو تم پر فخر ہوگا۔ تم چاہو تو یہ بھی کر سکتے ہو کہ ایک چوہا ایسوسی ایشن بنا کر اس کے تاحیات صدر بن جاؤ۔

دیکھیں جی... اپنی غلط فہمی دُور کرلیں میرا نام ماؤس ضرور ہے مگر میں کوئی ایسا ویسا چوہا نہیں ہوں۔ اور نہ ہی میرا تعلق اس برادری سے ہے، چوہے بِل میں رہتے ہیں اور میں ڈزنی لینڈ جیسے حسین و جمیل علاقے میں، چوہے کھانے پینے کا سامان خراب کرتے ہیں، میں ایسا نہیں کرتا... میری سواری تک اتنی شاہانہ ہے کہ آپ ایسی سواری انسانوں میں نہیں ڈھونڈ سکتے۔ اب آپ خود ہی بتائیے... آنکھ مچولی جون ۱۹۸۹ء کے شمارے میں آپ نے میری کار لیموزائن سے متعلق رنگین تصویریں اور معلومات فراہم کی ہیں، کیا ایسی کار کسی انسان کے پاس ہے...؟

مکی ماؤس اپنی شہرت سے متعلق کچھ باتیں ہمارے ساتھیوں کو بتانا پسند کریں گے؟

اپنی شہرت سے متعلق اپنے منہ سے کوئی بات بتانا ہے تو بُری بات لیکن چلیں معلومات کی خاطر بتائے دیتا ہوں، میری شہرت کا نقطۂ آغاز جیسا کہ میں نے بتایا ۱۹۲۸ء میں مینیٹن کا یونی تھیٹر نیو یارک میں دکھایا جانے والا ایک شو بنا، اس شو کا نام مکی ماؤس کارٹون شو تھا۔ آہستہ آہستہ میں امریکہ اور پھر امریکہ سے باہر بھی مشہور ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ مزاح کی دُنیا کا لافانی کردار بن گیا۔

۱۹۶۸ء میں ایک امریکی ادارے نے ایک سروے کروایا تھا۔ اُس کے مطابق چالیس سال کی عمر تک مجھ پر ایک سو چالیس فلمیں بن چکی تھیں، ۵، ہزار سے زیادہ مصنوعات پر میری تصاویر اور نام شائع ہو چکے تھے۔ ۳۰، کروڑ کتابیں دُنیا بھر میں میرے نام کی فروخت ہو چکی تھیں۔ میری کامکس ۵۰، ہزار سے زائد لوگ پڑھ چکے تھے جبکہ یہ ساری معلومات ۱۹۶۸ء تک کی تھیں۔ ۶۸ء سے ۸۸ء تک ان بیس سالوں میں تو یہ تعداد چار گُنا سے بھی کہیں بڑھ چکی ہے۔ میرے لیے سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ میں میڈم تساؤ کے میوزیم میں جہاں دنیا بھر کے معروف اور مشہور لوگوں کے مجسّمے رکھے گئے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ میرا مجسّمہ بھی رکھا گیا ہے۔

ابتدائی دور کی جن مصنوعات پر میری تصاویر چھپی تھیں اب امریکہ میں اُنہیں انٹیک سمجھا جاتا ہے۔ اور منہ مانگے داموں فروخت کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگوں نے میری تصویروں والی چیزیں اور کتابیں جمع کرنے کے مشاغل اختیار کیے ہوئے ہیں سینٹ لوئی کے مسٹر ارنسٹ نے میری تصویر والی دو ہزار گھڑیاں جمع کی ہیں۔ جبکہ ان کے پاس سو سے زائد ڈبے میری کتابوں اور کامکس کے ہیں۔ دنیا بھر میں میرے متعلق سب سے زیادہ مواد انفرادی سطح پر انہی نے جمع کیا ہے۔

شہرت کا کوئی ایسا واقعہ جس پر خود مکی ماؤس کو حیرت ہوئی ہو؟

ہاں میں ویٹ نام کی جنگ میں امریکہ کے مخالف فوجوں کے جسم پر بنیان کی صورت میں موجود تھا... ایک ویٹ نامی مورچے سے ۳۰۰ شرٹس نکلیں جن پر میری تصویر تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ ایک امریکی کردار مخالفین کے کیمپ اور مورچوں میں کیسے پہنچ گیا۔ نہ صرف پہنچ گیا بلکہ اپنا لیا گیا۔ اسی طرح سب سے بڑی حیرت کی بات جس پر آپ کی آنکھیں بھی پھٹ جائیں گی وہ یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم میں جب جاپان پر ایٹم بم گرایا جانا تھا تو اس روز میرا نام خفیہ کوڈ کے طور سے استعمال ہوا...جب امریکی فوجیوں کو یہ کہنا ہوتا کہ کل ایٹم بم گرایا جائے گا تو وہ یہ کہتے کہ کل مکی ماؤس آئے گا... آپ سوچیں تاریخ پر اتنے گہرے نقش چھوڑنے والا اور لاکھوں لوگوں کو موت کی نیند سُلانے والا واقعہ بھی مجھ مظلوم سے منسوب

کیا گیا ... ہیں کہ جسے صرف اور صرف مُسکرانے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے ۔ مجھے امریکیوں کی اس حرکت پر آج تک غصہ آتا ہے ۔

ملکی ماؤس ایک بات بتاؤ ... اس دنیا میں لاکھوں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر روٹی کھانا بھی نصیب نہیں ہے اور دوسری طرف تمہارے عیش و عشرت کا عالم یہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں ڈالر تم پر خرچ کیے جا رہے ہیں ... یہ فضول خرچی نہیں تو پھر اور کیا ہے ؟

دیکھیں جی ... سچی بات یہ ہے کہ مجھ پر یا ڈزنی لینڈ پر جو کروڑوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں وہ اسی لیے ہوتے ہیں کہ تھکے ہوئے مایوس، افسردہ اور غمگین لوگوں کو خوشیاں بخشی جا سکیں ۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ پیسہ بالواسطہ انہی لوگوں پر خرچ ہوتا ہے ۔

اچھا اگر یہ بات اس طرح ہے تو پھر یہ بتاؤ کہ کتنے غریب اور افسردہ لوگ ڈزنی لینڈ میں تم سے ملنے آئے ہیں اور کتنے صاحبِ ثروت اور خوش باش لوگ ؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ تمہاری شوخیاں بھوک اور افلاس کے ستائے ہوئے لوگوں کے چہروں پر بھی خوشی کے رنگ بکھیر سکتی ہیں ؟

اس سوال کے بعد ... عجیب واقعہ ہُوا مکی ماؤس پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا ۔

مکی ماؤس ! مکی ماؤس ! رہے نا چوہے کے چوہے ۔ میں نے بہت آوازیں دیں مگر پھر کہیں اُس کا سُراغ نہ ملا ۔

گیراج میں آٹومیٹک دروازہ لگوانے کا انجام !

نوّے سال کے بچّے کی شادی

دلاور فگار

دیکھو یہ اک دولھا ہے
منہ میں اُس کے دانت نہیں
عمر ہے اُس کی نوّے سال
ہلکے ہلکے چلتا ہے
اس کی دسویں شادی ہے
خوب ہے یہ ہریالا بنا

سہرا منہ پر بکھرا ہے
برسوں کا بیمار ہے یہ
شادی اس کی ہابا ہے
سر چڑھ کر اس بوڑھے کے
خنداں ہیں یہ پھول مگر
سہرا ہے یہ فرسٹ کلاس
نام ہے سہرے کا بدنام
چہرے کا دشمن سہرا

چہرہ جیسے بوری دیگ
ساس نے دولھا سے یہ کہا
دیکھ کے دولھا کی صورت
دولھا جو ہے دق کا شکار
شادی ہوتے ہی اس سال

ٹیڑھا تن کا کولھا ہے
پیٹ میں چھوٹی آنت نہیں
سر پر بگلے جیسے بال
منہ پر پوڈر ملتا ہے
لڑکی سیدھی سادی ہے
کھاتا ہے جو گرم چنا

جس سے چہرہ نکھرا ہے
شادی کو تیار ہے یہ
اس کا سبب بے خوابی ہے
پھول کھلے ہیں سہرے کے
ہنستے ہیں اس دولھے پر
جس کو سب نے کر دیا پاس
بوڑھی گھوڑی لال لگام
کالا منہ روشن سہرا

چھوٹا سا بچپن سہرا
باندھ نہ لے ویرن سہرا
ہو گیا سندرہ بن سہرا
سہرا باندھے آخری بار
ہو جائے دولھا کا وصال

چیکو کا رسالہ

طاہر مسعود

ارسلان احمد عرف چیکو میاں اپنے خیال میں بہت بڑے ادیب تھے۔ لیکن پڑھنے والوں کی خوش قسمتی سے اب تک ان کی کوئی تحریر کسی رسالے کی زینت نہ بن سکی تھی۔ جس کی وجہ چیکو میاں یہ بیان کرتے تھے کہ رسالے کے ایڈیٹر حضرات ان سے جلتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ جس دن چیکو میاں کی کہانیاں چھپنے لگیں وہ سب کو پیچھے چھوڑ جائیں گے یہاں تک کہ ایڈیٹروں کو بھی۔ چیکو میاں اب درجنوں کہانیاں، بے شمار نظمیں، ڈھیروں مضامین لکھ چکے تھے۔ لیکن دوسروں کو چھوڑیئے انہیں ان کے اپنے گھر میں کوئی ادیب ماننے کو تیار نہ تھا۔ کیونکہ گھر والوں کو شبہ نہیں بلکہ یقین تھا کہ چیکو میاں پرانے

رسالوں سے کہانیاں اور نظمیں وغیرہ اُڑاتے ہیں اور پھر ان پر اس ڈھٹائی سے اتراتے ہیں جیسے یہ فن پارے انہوں نے اپنے خونِ جگر سے تخلیق کئے ہوں۔ حالانکہ آپ کئی بار چیکو میاں کو پرانے رسالوں سے جلدی جلدی کہانیاں نقل کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ چکی تھیں۔ اور ان کی اچھی بھلی بے عزتی بھی ہو چکی تھی۔ لیکن ہر بار وہ کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر اپنی جان چھڑاتے تھے کہ میں تو خوش خطی کی مشق کر رہا تھا وغیرہ۔ بالآخر ایک دن چیکو میاں کے اندر کی خودداری جاگ پڑی اور انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اب وہ ادب کے میدان میں اپنی قوّت بازو پر بھروسہ کریں گے اور جو لکھیں گے خود سے لکھیں گے چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا۔ جلدی ہی انہوں نے اس ارادے پر عمل کر دکھایا انہوں نے ایک نہایت دلخراش کہانی لکھی۔ جو بیک وقت جاسوسی اور دردناک کہانی تھی۔ اس میں مار دھاڑ سے بھرپور مناظر بھی تھے اور آنسوؤں اور آہوں اور ہچکیوں کا سماں بھی۔ سنسنی خیزی اور تجسّس نے کہانی کو دوآتشہ بنا دیا تھا۔

کہانی کا عنوان تھا! "فومی کا فرار"۔

اصل میں یہ کہانی ان کے ایک بدتمیز قسم کے دوست فومی کی تھی۔ چونکہ فومی میاں اپنے ڈیڈی کے ہاتھوں آئے دن پٹتے رہتے تھے۔ اس لئے چیکو میاں کو ان سے شدید قسم کی ہمدردی تھی۔ اس کہانی میں انہوں نے فومی پر ان کے ڈیڈی کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مظالم کی داستان بیان کی تھی کہ کس طرح ڈیڈی فومی کی پٹائی کر کر کے جب تھک جاتے ہیں تو اسے تہہ خانے میں بند کر دیتے ہیں جہاں سے فومی جیمز بانڈ کی طرح سلاخیں توڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ یوں تو کہانی بہت طویل تھی اور اس میں ڈھیر سارے واقعات تھے۔ لیکن سارے واقعات اسی قسم کے تھے۔ چیکو نے کہانی کا آخری سطر لکھنے کے بعد قلم ایک طرف رکھ کر طویل جمائی لی جس سے وہ صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ آخر کار دنیا کی سب سے اچھی کہانی قلمبند کر لی گئی۔ انہوں نے سوچا کہ یہ کہانی چونکہ فومی کے بارے میں ہے اس لئے اس کو پڑھنے کا سب سے پہلا حق بھی اسی کا بنتا ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ فومی بھی عین اسی وقت آدھمکا۔

چیکو نے کہا: "فومی! آج میں نے تمہارے بارے میں ایک کہانی لکھی ہے۔ کیا تم اسے پڑھنا پسند کرو گے۔ سناؤں؟"

"کیا واقعی" فومی نے مسرت سے چلا کر کہا۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو گیا! "کوئی گڑبڑ بات تو نہیں لکھی ہے؟"

"نہیں تم پڑھو تو سہی!" چیکو نے اطمینان سے کہا۔

نومی نے اپنے کندھے سے لٹکا ہوا گٹار ایک طرف اُچھال دیا اور کہانی پڑھنے لگا۔ جب وہ کہانی پڑھ چکا تو چیکو نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے اب نومی "واہ، واہ"، "سبحان اللہ" "قلم توڑ دیا"، کا حشر برپا کر دے گا۔ لیکن نومی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا: "پیارے چیکو۔ تم نے کہانی تو خیر لکھی ہی ہے۔ میں کیا اور میری رائے کیا۔ لیکن دو تین باتیں اپنی طرف سے کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور کہو۔" چیکو کی آواز میں کم سے کم گرمجوشی تو نہیں تھی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کہانی میں دہشت گردی ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اسے کم کر دو۔"

"نومی، اصل میں ......"، چیکو نے وضاحت کرنا چاہی۔ لیکن نومی نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "پوری بات سُن لو۔ دوسرے اپنی ہینڈ رائٹنگ پر توجہ دو۔ پلّے نہیں پڑتی ہے اور تیسری اور سب سے ضروری بات یہ ہے چیکو کے بچّے!"

نومی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا: "آئندہ تم نے اپنی کسی کہانی میں میرے ڈیڈی کو بدنام کرنے کی کوشش کی تو میں گھونسہ مار کر تمہاری ناک کا بھُرتہ بنا دوں گا۔"

"دیکھو نومی۔ یہ بڑی بدتمیزی ہے بلکہ یہ کھلی غنڈہ گردی ہے ایک تو میں نے تم پر کہانی لکھی اور اوپر سے تم مجھ پر دھونس جما رہے ہو۔" چیکو نے گڑبڑا کر کہا۔ افسوس کہ نومی اس سے زیادہ بہادر اور مضبوط تھا ورنہ چیکو اس کی کھال کھینچ کر بھس بھر دیتا۔ بھلا اتنی شاندار کہانی کے متعلق اس کے خیالات کتنے گھٹیا تھے۔ چیکو کو اس کے روّیہ سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

"اصل بات یہ ہے کہ نومی جلتا ہے کہ میں اتنا اچھا کیوں لکھتا ہوں اور وہ کیوں نہیں لکھ پاتا۔ ہاں، ہاں اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ باگڑ بلّا کہیں کا۔" اس نے بدمزگی سے سوچا۔

چیکو بڑا دل رکھنے والا ادیب تھا۔ اس وقت تو غصّے میں اس نے نومی کو سخت بُرا بھلا کہا لیکن رات بستر پر دراز جب وہ اپنی کہانی کے متعلق سوچ رہا تھا تو اسے لگا کہ کہانی میں واقعی جھول ہے۔ مثلاً پوری کہانی میں یہی نہیں بتلایا گیا تھا کہ آخر نومی کے ڈیڈی اس پر اتنا ظلم کیوں ڈھاتے ہیں۔ وہ بستر سے اُٹھا اور اپنی میز پر گیا۔ کہانی کا مسوّدہ نکال کر اس نے کہانی کے ایک مناسب سے موڑ پر یہ وضاحت لکھ دی!

"نومی کے ڈیڈی نومی کی ایک لمبی بید سے اس لئے پٹائی کرتے تھے۔ کیونکہ نومی اپنے ڈیڈی کو پاکٹ منی (جیب خرچ) نہیں دیتا تھا۔ نومی کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ڈیڈی نے نومی کو پیدا کیا تھا۔ اس لئے وہ ہر طرح سے پاکٹ منی کے مستحق تھے۔"

پھر ایک دم چیکو کو یاد آگیا کہ فومی نے اپنا نام کہانی میں سے ہٹانے کے لئے کہا تھا ورنہ وہ اس کی ناک کا بھرتہ بنا دے گا۔ فومی میں یہ بڑی خرابی تھی کہ وہ جو کہتا تھا وہ کر دکھاتا تھا۔ اس لئے چیکو نے فومی کا نام کاٹ کر ہر جگہ ڈبّو کا نام لکھ دیا۔ ڈبّو بے چارہ شریف سا لڑکا تھا۔ اس کی شرافت کا یہ ثبوت تھا کہ وہ چیکو کے قابو میں تھا۔

اگلے دن چیکو نے کہانی ماہنامہ "بلبل"، کو بھجوا دی اس کا اندازہ تھا کہ اگلے پندرہ بیس دنوں میں ایڈیٹر صاحب کا جواب آجائے گا۔ کچھ اس قسم کا:

جناب ارسلان احمد عرف چیکو صاحب،

آپ کی بے مثال، شاہکار، معرکہ آرا کہانی ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے پہلی کہانی ہی ایسی لکھ دی ہے کہ اگر آپ کچھ بھی نہ لکھیں تو بھی ادب میں آپ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے ماہنامہ بلبل کو اپنی کہانی کے لائق لکھا۔"

افسوس کہ چیکو کو ایسا کوئی خط نہیں ملا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ ایڈیٹر نے جواب ضرور دیا ہے۔ اسے ڈاکیے پر شک تھا کہ ہو نہ ہو اس نے خط غائب کیا ہے۔ کیونکہ چیکو نے پچھلے سال اس کی سائیکل کی ہوا نکال دی تھی۔ ایک روز وہ پوسٹ ماسٹر صاحب کے پاس ڈاکیے کی شکایت کے لئے پہنچ گیا۔ جہاں اسے بتایا گیا کہ ڈاکیے کو ریٹائر ہوئے چھ مہینے سے اوپر ہو چکے ہیں۔

"کہیں یہ سازش فومی کی ......"، یونہی اسے خیال آیا، مگر فومی کو کیا پتہ کہ اس نے کہانی کہاں بھیجی ہے"

غرضیکہ انہی شکوک وشبہات میں چیکو کو یقین ہوگیا کہ اسکی کہانی اب نہیں چھپے گی۔ بہت غور و فکر کے بعد چیکو نے کہانی نہ چھپنے کی وجہ تلاش کر ہی لی: "ایسا لگتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب کو کہانی کچھ زیادہ ہی پسند آگئی ہے۔ اور یہ ایڈیٹر لوگ ہوتے بھی تو بہت چالاک ہیں، کہانی کو اپنی فائل میں چھپا لیا ہوگا۔ تاکہ جب میں بھول بھال جاؤں تو وہ اسی شاہکار کہانی کو اپنے نام سے چھپوا دیں۔"

وجہ کچھ بھی ہو اصل حقیقت تو بس یہی تھی ناکہ چیکو کی یہ کہانی جو قطعی طور پر اس کی اور صرف اسی کی لکھی ہوئی تھی دوسری کہانیوں کی طرح ردّی کی ٹوکری میں بے دردی سے پھینک دی گئی تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کیں اور تصوّر کی مدد سے دیکھا کہ ایڈیٹر صاحب اس کی بے مثال کہانی کو پورا پڑھے بغیر محض ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد ناگواری سے موڑ تروڑ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال رہے ہیں۔ اُف غصّے سے چیکو کے دونوں کان سرخ ہو گئے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کسی سے موٹر سائیکل چھین کر ماہنامہ بلبل کے دفتر کی طرف

بھاگے۔ اور جو دفتر کا گیٹ بند ہو تو موٹر سائیکل سے گیٹ کو جمپ لگا کر عبور کرے اور موٹر سائیکل پر ہی سیڑھیاں عبور کرتا، ایڈیٹر کے کمرے کا دروازہ توڑتا ہوا (جیسا کہ اس نے فلموں میں دیکھا تھا) اندر گھس پڑے اور پستول نکال کر دھاڑے:

"اے دنیائے صحافت کے حاسد اور بدماغ ایڈیٹر! چیکو آ چکا ہے ۔ لے اور دیکھ اپنا حشر!!"

اور پھر ڈز، ڈز، ڈز۔ (اس کے بعد چیکو کی آنکھ کھل جاتی تھی)

کہانی نہ چھپنے سے چیکو کے بہت سے خواب ادھورے اور بے رنگ ہو گئے تھے۔ وہ اُداس ہو گیا لیکن وہ باہمت ادیب تھا۔ اسکول میں اردو کے اُستاد نے عظیم شاعر مرزا غالب کے حوالے سے بتایا تھا کہ بہت سے ادیب اور شاعر اپنے زمانے سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انہیں زمانہ پہچان نہیں پاتا ہے اور ایسے ادیب ناقدری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیا پتہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔ اس لئے مجھے ہمت نہیں ہارنا چاہیئے۔ اور اپنے قلم کی نب صاف کر کے ایک اور کہانی لکھنی چاہیئے۔ اور کہانی لے کر ایڈیٹر سے خود ملاقات کرنی چاہیئے۔ چیکو نے جب دوسری کہانی کے متعلق سوچنا شروع کیا تو اس کے ذہن میں عجیب و غریب کہانیاں آئیں۔ مثلاً ایک کہانی "دادا ابا کا عصا" تھی۔ یہ چھڑی جس کے دستے کو پکڑ کر وہ ٹیک ٹیک کر راستہ چلتے تھے، ایک دن اچانک خود بخود بڑھنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نوک آسمان میں کھب جاتی ہے۔ جس کے بعد پورا آسمان دادا ابا کی چھتری دکھائی دینے لگتا ہے لیکن چیکو نے اس قسم کی کہانیوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور ایک سراغ رساں کی کہانی لکھی۔ یہ مسٹر فوکس ہیں۔ جو اصل میں تو سراغ رساں تھے۔ لیکن مجرموں کو دھوکا دینے کیلئے چنا جور گرم بیچتے تھے۔ ایک روز رستے میں انہیں نیلے رنگ کی پُراسرار کار نظر آجاتی ہے۔ جس کا وہ پیچھا کرنے لگتے ہیں۔ لیکن کار فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ تب مسٹر فوکس کو احساس ہوتا ہے کہ وہ تو ایک کھٹیچر سی بس میں سوار ہو کر کار کا پیچھا کر رہے تھے اس کہانی کا عنوان چیکو نے "غائب دماغ سراغ رساں" رکھا تھا۔

اس نے یہ کہانی ڈیڑھ دو گھنٹے میں لکھ لی تھی۔ اور چونکہ وہ لکھتے لکھتے تھک گیا تھا۔ اس لئے چہل قدمی کرنے کے لئے ذرا دیر کے لئے سڑک پر نکل گیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو میز سے کہانی غائب تھی، تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ امی جان کو کاغذ کی فوری ضرورت پڑ گئی تھی اس لئے انہوں نے کہانی کے صفحات پھاڑ کر سودا سلف کے استعمال کر ڈالا۔ چیکو کا جی چاہا کہ اپنا سر کاٹ کر ڈائننگ ٹیبل پر سجا دے۔

میرا خیال ہے مجھے لکھنا ترک کر دینا چاہیئے۔ چیکو نے اپنے آپ سے کہا۔

چیکو نے مہینوں کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اس کے دل میں اب بھی یہ کسک زندہ تھی کہ وہ ایک بڑا ادیب ہے۔ موسم سرما گزرا تو اس نے ایک بڑا سا رجسٹر خریدا۔ تاکہ اس پر وہ جو بھی لکھے صاف پڑھا جا سکے۔ رجسٹر کے اندرونی صفحات پر بھی وہ خاموشی سے لکھتا رہا۔ جب سارے صفحات بھر گئے تو اس نے رجسٹر کی جلد پر مارکر سے نمایاں حروف میں لکھا۔

"چیکو کا رسالہ"

"اس ماہنامے میں صرف چیکو کی کہانیاں چیکو کے مضامین اور چیکو کی نظمیں چھپتی ہیں"

اسکے بعد سے چیکو نے اپنے دل سے رسالوں میں چھپنے کی خواہش نکال دی تھی۔ شاید اب اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ "چیکو کا رسالہ" ہر مہینے اس کے اسکول اور محلّے کے دوستوں کے درمیان گردش کرتا تھا۔ سب چیکو کی دلچسپ اور عجیب کہانیاں پڑھ کر خوش ہوتے تھے۔ کچھ مذاق بھی اُڑاتے تھے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ کامیاب اور مقبول رسالہ تھا۔ اگر آپ کو کبھی "چیکو کا رسالہ" پڑھنے کو ملے تو آپ ان جملوں کو پڑھنا نہ بھولیئے گا۔ جو رجسٹر کے پہلے ہی صفحے پر خوب موٹے موٹے حروف میں درج ہیں۔

"ماہنامہ چیکو کا رسالہ میں چیکو کی جتنی کہانیاں، نظمیں اور مضامین چھپتے ہیں۔ انہیں کوئی رسالہ نقل نہ کرے اور نہ شائع کرے ورنہ چیکو قانونی کاروائی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔!"

بلا عنوان

اوور رائیٹنگ

محمد جاوید خان۔

فاروقی صاحب ہمارے اُستاد تھے اور ہم ان سے بہت خوفزدہ رہتے تھے۔ اور ایک ہم ہی کیا پوری جماعت بلکہ سارا اسکول اُن سے خوفزدہ رہتا تھا۔ فاروقی صاحب کی جھلک دیکھتے ہی کمرۂ جماعت سے باہر مٹرگشت کرنے والے لڑکے کمروں میں بھاگتے اور کمروں میں موجود لڑکے فوراً اپنی اپنی سیٹ سنبھالتے اور سیٹوں پر بیٹھے ہوئے، کوئی کتاب، کاپی وغیرہ سامنے رکھ کر زور زور سے سر ہلانا شروع کر دیتے جیسے سر نہ ہو کوئی مرتبان ہو جس میں مختلف چیزیں ڈالنے کے بعد ہلا کر ہلا کر ان کو ملایا جا رہا ہو۔ اُدھر فاروقی صاحب کمرۂ جماعت میں داخل ہوئے اُدھر سب ایسے خاموش ہوئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ گمان یہی ہے کہ

لڑکے اُس وقت سانس بھی روک لیا کرتے تھے۔ وہ تو خدا بھلا کرے فاروقی صاحب کا کہ جلد ہی کوئی نہ کوئی سوال پوچھ لیا کرتے تھے۔ اور جماعت کی سانس بحال ہوجاتی تھی۔ ورنہ ڈر یہی تھا کہ ان کے گھورتے ہی یار لوگ سانس لینا بھول کر ایک ایک کرکے بنچوں سے نیچے۔

فاروقی صاحب کو کھلکھلا کر ہنستے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ البتہ کچھ ایسے خوش نصیب ضرور تھے جنھوں نے کسی اچھی گھڑی میں اُنھیں مسکراتے دیکھا تھا۔ ایک دن شیرازی بھی اُن خوش نصیبوں میں شامل ہوگئے۔ فاروقی صاحب کے کمرے سے نکلتے ہی ہم نے شیرازی کو پکڑ لیا۔ ہم نے کہا "کیا بات ہے چہرہ جوش سے سُرخ ہو رہا ہے۔ کیا کسی علاقائی پارٹی میں شامل ہوگئے ہو؟" شیرازی ایک لمحے کو جھینپے پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "لاحول ولا۔" شیرازی نے کہا: "اصل میں فاروقی صاحب مسکرا رہے تھے۔"

"ارے! فاروقی صاحب مسکرا رہے تھے۔" ہم نے جوش سے اُچھلتے ہوئے کہا اور تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر ساری کلاس میں پھیل گئی کہ "شیرازی نے فاروقی صاحب کو مسکراتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔"

خبر اتنی دھماکا خیز تھی کہ پرویز، متین، ساجد، ایوب سب نے گھیرا ڈال لیا۔ شیرازی کے بقول واقعہ کچھ یُوں ہوا کہ فاروقی صاحب کسی کتاب کی مدد سے لکھا ہوا ایک مضمون چیک کر رہے تھے۔ شیرازی اُدھر سے گزرے تو اُنھوں نے آواز دے کر کتاب اُن کے ہاتھ میں تھما دی اور فرمایا کہ پڑھو۔ خود مضمون دیکھنے لگے۔ شیرازی سارا مضمون پڑھ چکے تو آخر میں غالب کا ایک مصرع درج تھا

ع ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

اب اسے شیرازی کا بھول پن کہا جائے یا بے خبری کہ "دَم" پہ انہوں نے پیش کرکے پڑھا یعنی

ع ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ "دُم" نکلے

فاروقی صاحب کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور انہوں نے کہا۔

"کیا کہا؟" شیرازی کے خاموش ہوتے ہی سب ایک ساتھ بولے۔ شیرازی کہتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ مگر دوستوں کے اصرار پر انھوں نے بتا ہی دیا۔ کہنے لگے فاروقی صاحب نے کہا

"شیرازی!! تم تو بالکل ہی بانگڑو ہو۔"

دوستوں کا ایک بلند قہقہہ بلند ہوا۔ مگر ہم سنجیدہ رہے اور جب یہ قہقہہ اپنے آخری مراحل میں داخل ہُوا تو ہم نے کہا "شیرازی۔ فاروقی صاحب بہت قابل آدمی ہیں۔ ان کی بات پر شک کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" اس پر ایک اور قہقہہ پڑا۔ اور شیرازی کا چہرہ کچھ اور سُرخ ہوگیا۔

ایک روز ہم خود فاروقی صاحب کی مسکراہٹ دیکھنے والے خوش نصیبوں میں شامل ہو گئے۔ ہماری کاپی چیک ہو رہی تھی اور ہم فاروقی صاحب سے کچھ فاصلے پر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اور یہ کچھ فاصلہ اتنا تھا کہ ہمیں کاپی تو دکھائی دے رہی تھی، کاپی پر کیا لکھا ہے؟ یہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کاپی دیکھتے دیکھتے فاروقی صاحب نے ایک جگہ انگلی رکھ دی: "یہ کیا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔ اب سچی بات یہ ہے کہ جس جگہ انہوں نے انگلی رکھی تھی اُس جگہ ہمیں صرف ان کی انگلی ہی نظر آ رہی تھی۔ کچھ اور دیکھنا محال تھا۔ ہم نے کاپی سے قدرے قریب ہونے کی کوشش کی مگر پاؤں اڑ گئے۔ ذرا ہلنے کو تیار نہ ہوئے، ہمیں جواب میں کچھ نہ کچھ کہنا ضروری تھا۔ اس لیے گڑبڑا کر کہا: "آپ کی اُنگلی!"

ہماری بوکھلاہٹ پر وہ بے ساختہ مُسکرا دیے۔ ہماری گویا جان میں جان آئی۔ کمال شفقت سے انہوں نے کہا: "اوور رائٹنگ" (OVER WRITING) مت کیا کرو۔" اس وقت ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یہ "اوور رائٹنگ" کیا بلا ہوتی ہے مگر ہم نے نہایت سعادت مندی سے سر ہلا کر کہا: "جی سر!" انھوں نے اپنا بھاری سر ہلاتے ہوئے مزید فرمایا۔ اوور رائٹنگ سے مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے پھر پڑھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ اس لیے جو الفاظ غلط ہو جائیں یا تم چاہو کہ نہ پڑھے جائیں اُنھیں کاٹ کر باقی اس سے آگے لکھ دو۔" ہم نے ایک دفعہ پھر کہا: "جی سر!"

وہ ایک لمحہ رُکے، کچھ سوچتے رہے پھر ہم سے مخاطب ہوئے "اوور رائٹنگ کو اُردو میں کیا کہتے ہیں؟"

سچ پوچھیے تو اُس وقت ہمارے دِل میں فخر سے زیادہ فاروقی صاحب کی عظمت کا احساس پیدا ہوا کہ کتنی سادہ طبیعت کے ہیں کہ جو بات انہیں معلوم نہیں ہے بغیر کسی تکلف کے مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ ذہن پر بہت بوجھ ڈالا۔ لیکن یاد نہیں آیا۔ یاد تو اُس وقت آتا جب اس کے معنیٰ معلوم ہوتے۔ بہرکیف، فاروقی صاحب کے سامنے سرخرو ہونے کا آخری موقع تھا جو ضائع ہو گیا، پھر فاروقی صاحب ہی نے اوور رائٹنگ کا مطلب سمجھا دیا اور کاپی ہمارے حوالے کر دی۔

اس کے بعد سے ہم نے ہمیشہ اوور رائٹنگ سے پرہیز کیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اوور رائٹنگ کے کئی نقصانات ہوتے ہیں۔ ایک نقصان تو یہی ہوتا ہے کہ جیسے کسی ولایتی افسر کے پاس ایک دیسی خانساماں ملازم ہُوا۔ ایک صبح صاحب کا اُبلا ہُوا انڈا کھانے کو جی چاہا۔ بیٹھے کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہے تھے۔ خانساماں دُور تھا۔ کاغذ سنبھالا اور لکھا: "انڈے کا بوائل لے آؤ" پھر خیال کیا "بوائل" خانساماں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ چنانچہ دوبارہ لکھا: "انڈے کا بیل لے آؤ" کاغذ بھجوا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد بدحواس

خانساماں حاضر ہُوا۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی: "صاحب! اِدھر تو بیل کا بھی انڈا نہیں ملتا۔ پھر انڈے سے بیل کہاں سے نکال لاؤں۔"

ہمارے ہاں سب سے زیادہ اوور رائٹنگ بسّوں اور دیواروں پر ہوتی ہے۔ بلکہ اوور رائٹنگ سے زیادہ کٹ رائٹنگ ہوتی ہے، یعنی لکھّے ہوئے کسی لفظ کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ بسوں کے اندر شیشوں سے کچھ اُوپر لکھے ہوئے چند جُملے ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ ایک روپے سے زیادہ ریزگاری ـــــ ملے گی

۲۔ سیٹوں پر پاؤں ـــــ رکھیں

۳۔ گیٹ پر کھڑے ہونا ـــــ ہے

۴۔ غیر شائستہ گفتگو ـــــ کریں۔

شروع شروع میں دورانِ سفر ان ہدایات کو پڑھ کر ہم بہت چکرائے مگر بعد میں پتا چلا کہ ان جُملوں میں سے کٹ رائٹنگ کر کے "نہیں"، "نہ"، "منع"، "مت" کے الفاظ نکال دیے گئے ہیں

لیکن بہت سی تحریریں ایسی بھی تو ہوتی ہیں اوور رائٹنگ اور کٹ رائٹنگ کے بغیر بھی جن کا پڑھنا تقریبًا ناممکن ہوتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک لطیفہ سُن لیجیے۔ کسی بُڑھیا کا لڑکا ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں دوسرے شہر گیا۔ بوڑھی ماں کو لڑکے کا خط ملا۔ تو اُسے پڑھوانے کے لیے وہ محلّے کے ایک لکھّے پڑھے آدمی کے پاس گئی۔ وہ غریب دیر تک اُسے پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر ناکام رہا۔ آخر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ رقم نکال کر بُڑھیا کے ہاتھ پر رکھ دی۔ بُڑھیا سخت حیران، پوچھنے لگی کیا میرے بیٹے نے خط میں لکھا ہے کہ مجھے یہ پیسے دے دیے جائیں؟ "نہیں امّاں" اُس نے جواب دیا۔ "یہ اُس کے پاس جانے کا کرایہ ہے۔ یہ پڑھوانے کے لیے آپ کو وہیں جانا پڑے گا۔"

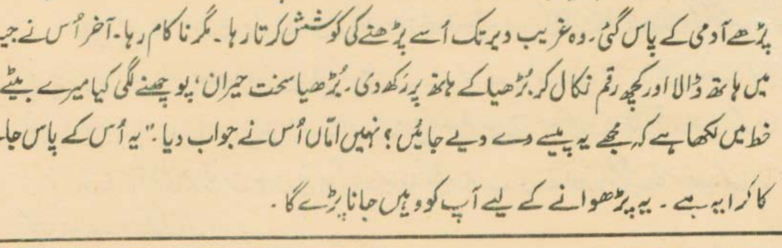

قد پانچ فٹ کے قریب، آنکھیں بھینگی، ایک مونچھ چھوٹی اور دوسری بڑی۔ اُڑی اُڑی رنگت، سر بالکل ایئر پورٹ کی طرح صاف یعنی مکمل گنجے پن کا شکار، کان ٹیڑھے اور دانت میلے۔ چلتے ہیں تو یُوں جیسے سَر پر منوں بوجھ اُٹھایا ہُوا ہو۔ ہنستے ہیں تو منہ سے ایسی آواز نکلتی ہے جو بہر حال کسی انسان کی نہیں ہو سکتی، روتے ہیں تو دنیا ہنس پڑتی ہے۔ جی ہاں... ابھی ہم آپ سے اپنے دوست بشیر عرف بشیر ابنِ ٹربل کا تعارف کروا رہے تھے۔ ہماری دوستی خاصی قدیم اور پُرانی ہے۔

جب ہم ہائی اسکول میں پڑھا کرتے تھے تو موصوف یعنی بشیر ابنِ ٹربل نے اسکول کی چار دیواری کے باہر ہی بھلے بیچنے والے شیدے بلیڈ سے دوستی کر رکھی تھی۔ چنانچہ ان کی تربیت میں مکتب کی کرامت کے ساتھ ساتھ شیدے بلیڈ کا فیضانِ نظر بھی مُفت میں شامل ہوتا رہا۔ موصوف زمانۂ طالب علمی میں خاصے مہم جُو واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ اکثر جمعرات کو اپنے کسی محلّے دار کا مُرغا اُٹھا لاتے تھے۔ اور اپنے چاروں دوستوں یعنی

ابنِ آدم پسروری

بس ریڈی پلیز

ہمارے علاوہ حمید بیڑیاں والا۔ خالد عرف سائیکل پنکچر اور محترم بہادر بے وقوف کو مدعو کرتے تھے۔
بہادر اکثر کہا کرتا تھا کہ اس طرح دوسروں کا مال چوری کرکے کھانا غیر اخلاقی فعل ہے لیکن خالد عرف سائیکل پنکچر اُسے یہ کہہ کر چُپ کروا دیتا تھا کہ اس دُنیا میں تو انسان، انسان کا خون چوستا ہے اور ہم تو پھر بھی جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں۔
جیسے بہار کے دن جلد گزر جاتے ہیں اُسی طرح ہمارا طالبعلمی کا دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے بیت گیا۔ نتیجتاً بشیر نے فوٹو اسٹوڈیو کھول لیا۔ حمید نے بٹیر پکڑ پکڑ کر بیچنے شروع کر دیے۔ بہادر بے وقوف کا بیوقوف ہی رہا اور خالد سائیکلوں کو پنکچر لگانے میں ماہر ہو گیا۔ جبکہ ہم... ہم شاعر بن گئے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب ہم نے اپنے شاعر بننے کے متعلق ابّا حضور کو بتایا تو انہوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے نہایت حسرت سے کہا تھا "یا اللہ! میرے دونوں بیٹوں کو لمبی عمر عطا کر۔"
امّی جان قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ تڑپ کر کہہ اُٹھیں "آپ کو یقیناً مالیخولیا ہو گیا ہے کہ دو بیٹوں کے لیے درازیٔ عمر کی دُعا مانگ رہے ہو۔ کیا بھول گئے ہو کہ ہمارے ماشاءاللہ تین بیٹے ہیں؟"
ابّا حضور نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے امّی سے کہا "لیکن یہ تو اب شاعر بن گیا ہے نا۔ اس لیے اب تو ہمیں دو بیٹوں کی ہی فکر کرنی چاہیئے۔ بلکہ یہ سمجھ لو کہ اللہ نے ہمیں دیے ہی دو بیٹے تھے۔"
بہرحال بشیر عرف بشیراں ٹرمل ہمارا سب سے قابلِ اعتماد دوست تھا۔ ابھی ہم نے ذکر کیا تھا کہ بشیر نے ایک فوٹو اسٹوڈیو کھول لیا تھا۔ اُس فوٹو اسٹوڈیو کا نام تھا "ڈسکو فوٹو اسٹوڈیو۔" بشیر کا کام چل نکلا لیکن بدقسمتی سے جس نے ایک دفعہ تصویر بنوائی اُس نے دوبارہ اِدھر کا رُخ نہ کیا۔ خود ہم نے بھی ایک تصویر بشیر سے بنوائی تھی۔ ہمیں یاد ہے کہ بشیر نے ہمیں کیمرے کے سامنے کھڑا کیا تھا۔ پھر ایک لائٹ آن کی تھی ابھی ہم کھڑے ہی تھے کہ موصوف بولے "باہر آجائیے۔"
"کیا مطلب تصویر نہیں کھینچو گے؟"
بشیر مُسکراتے ہوئے بولا "ارے بھئی تم بھی بھولے ہی ہو۔ تصویر تو کب کی بن چکی ہے۔"
"لیکن ہم تو ابھی اسٹول پر بیٹھے بھی نہ تھے۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بہرحال تم کل شام پانچ بجے اپنی تصویریں لے جانا۔"
اگلے روز ہم بروقت ڈسکو فوٹو اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ بشیر نے ایک چھوٹا سا لفافہ ہماری طرف بڑھایا "یہ لو اپنی شکل مبارک ملاحظہ کرو۔"

ہم نے جلدی سے لفافہ کھولا اور تصویریں نکالیں جنہیں دیکھتے ہی ہمارے منہ سے جھاگ بہہ نکلا۔ تصویر میں ہم سر جھکائے دُکان کے فرش کی سمت دیکھ رہے تھے اور ہمارے چہرے پر پھانسی پانے والے مجرم کی سی حسرت برس رہی تھی۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ ہماری تصویر اور ایک غمزدہ بکری میں کوئی فرق نہ تھا۔

ایک دفعہ ایک دیہاتی اپنے گدھے پر سوار ڈسکو فوٹو اسٹوڈیو پہنچا وہ اپنے گدھے کے ساتھ تصویر کھنچوانا چاہتا تھا۔ بشیر نے تصویر کھینچی اور ہمیں یاد ہے کہ دو دن بعد جب دیہاتی تصویر لینے آیا تو تصویر دیکھ کر التجا کرنے لگا "مجھے بتاؤ کہ اس فوٹو میں گدھا کون سا ہے؟"

ابھی چند روز قبل ڈسکو فوٹو اسٹوڈیو میں جب بشیر نے ہمارے ساتھ شرط باندھی ہوئی تھی کہ جو چائے کا کپ پہلے پیئے گا اُسے فریقِ ثانی مزید ایک کپ چائے منگوا کر دے گا۔ چنانچہ ہم نے پچیس دفعہ شرط ہاری اور بشیر نے پچیس کپ چائے نوشِ جاں کی مگر مجال ہے کہ ذرا سا ڈکار بھی لیا ہو۔ جب وہ چائے کا چھبیسواں کپ پی رہا تھا۔ کہ اسی اثنا میں ایک پریشان حال صاحب اسٹوڈیو میں داخل ہوئے انہوں نے بشیر کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

"خیریت تو ہے بھائی صاحب!؟" ہم نے ازراہِ ہمدردی پوچھا۔

"نسیم یعنی میری بیوی فوت ہو گئی ہے۔ اُس کے آخری دیدار کی تصویر بنوانی ہے۔" آنے والے شخص نے جواباً کہا۔

بشیر نے آن ہی آن میں کیمرہ سنبھالا اور اُس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم بھی یوُں ہی اُن کے ہمراہ چل دیے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔ مرنے والی کی میّت صحن کے درمیان رکھی ہوئی تھی اور عورتیں اِرد گرد بیٹھ کر بَین کر رہی تھیں۔ بشیر نے کیمرہ سنبھالا اور مرحومہ کے شوہر سے کہا "ان کے چہرے سے کپڑا ہٹا دیجیے۔"

کپڑا ہٹا دیا گیا۔ بشیر نے کیمرہ مرحومہ کی طرف کرتے ہوئے کہا "ذرا مُسکرائیے۔"

اتنا سُننا تھا کہ مرنے والی کا خاوند غصّے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ایک زور کا مُکا بشیر کے منہ پر مارا۔ بشیر اچانک جُھک گیا اور وہ مکّا سیدھا ہمارے جبڑے پر پڑا۔ اور پھر بشیر کے سوری کہنے پر اُس شخص نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ ورنہ اُس دن ہماری خیر نہ تھی۔

بشیر نے تصویر بنائی اور مرحومہ کے خاوند سے کہا کہ وہ کل اسٹوڈیو آ کر تصویر لے جائے، لیکن افسوس کہ اُس دن بشیر کیمرے میں فلم (ریل) ڈالنا بھول گیا تھا۔ اگلے دن جب وہ شخص تصویر لینے آیا تو بشیر نے اپنی کوتاہی پر پردہ ڈالنے کے لیے بڑی ماہرانہ اور شاطرانہ گفتگو کرتے ہوئے کہا "بھائی صاحب! آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ایک سعادت مند اور خوبصورت بیوی آپ کو ملی تھی اور وہ بھی عین جوانی میں آپ کا ساتھ چھوڑ گئی۔"

"خوش قسمت ہوں میں؟" اُس نے غصّے سے کہا۔

"نہیں جی وہ... میرا مطلب ہے آپ بڑے بدنصیب ہیں۔ ویسے سُنا ہے کہ مرنے والی ایک نیک دل عورت تھی۔"

"کیا بکواس ہے۔" وہ غصّے سے لال پیلا ہو گیا۔

"دراصل بھائی صاحب۔ وہ اُس دن میرا مطلب ہے میں کیمرے میں رِیل ڈالنا بھول گیا تھا۔" بشیر نے جلدی جلدی کہہ دیا۔

"کیا؟" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

بشیر نے جواباً کہا "لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ مجھ سے یہ غلطی نہ ہوگی۔ انشاءاللہ جلد ہی آپ کا کوئی اور عزیز فوت ہوگا تو آپ خود دیکھ لیجیے گا کہ میں اپنے وعدے کا کتنا پکّا تھا۔"

اتنا سُننا تھا کہ اُس شخص نے لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ جن میں سے میرے اور بشیر کے حصّے میں بالترتیب اٹھارہ اور بائیس گھونسے آئے۔

اسے ضرور پڑھ لیجیے!

بعض کُتب اور رسائل میں اکثر ایسی بہت سی معلومات یا معلومات پر مبنی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن کا کوئی مُستند یا مُعتبر حوالہ نہیں ہوتا اور تحقیق پر پتا چلتا ہے کہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان معلومات یا واقعات کو محض کُتب یا رسائل میں شائع ہو جانے کی وجہ سے مستند سمجھ لیا جاتا ہے اور یہ ایک سے دوسرے تک اس طرح منتقل ہوتی رہتی ہیں کہ غلط ہونے کے باوجود ان کے علم کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ "آنکھ مچولی" نے معلومات کو اُن کی مکمل صحت کے ساتھ اپنے قارئین تک پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ وہ ایسی معلومات کی اشاعت سے گریز کرے گا، جن کا کوئی مستند حوالہ نہیں ہوگا۔ ہمیں اپنے ساتھیوں سے بھی یہی کہنا ہے کہ وہ جب بھی کوئی معلوماتی تحریر، معلوماتِ عامّہ یا تراشے کی شکل میں کوئی معلومات بھیجیں تو اُس کے ساتھ اُن کُتب یا رسائل کا حوالہ ضرور دیں، جہاں سے ان معلومات کو اخذ کیا گیا ہے۔ غیر مستند معلومات "آنکھ مچولی" میں شائع نہیں کی جا سکیں گی۔

مضمون لکھنے کے 420 طریقے

اگر آپ کوئی مضمون نہ لکھنا چاہیں تو اسے ضرور پڑھیں

عمر شریف

تجادو وہ جو سر چڑھ کے بولے" "خوبصورت بننے کے طریقے" "صحت کا راز" ایسی چند کتابیں ہیں جنہیں کوئی نہیں پڑھتا، یہاں تک کہ مصنف خود بھی نہیں پڑھتا۔ جاننا تو چاہیے کہ آخر کیا چیز انہیں ناقابلِ مطالعہ بنا دیتی ہے۔

فرض کیجیے آپ ایک کتاب لیتے ہیں جس کا نام " فنِ مضمون نویسی " ہے ۔ آپ کتاب کے سرورق کو غور سے دیکھیے ۔اس پر ایک تین سالہ بچہ بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے ۔ اُس کے ہاتھ میں مغل عہد کے کاتبوں والا ایک کبوتر کا پَر ہے ۔اس نے اعلیٰ سوٹ پہن رکھا ہے ۔ پاس ہی چند اعلیٰ نسل کے قلم اور پنسلیں بے کار پڑی ہیں ۔ جن کی طرف وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ۔ اُس کے سامنے پڑا کاغذ آدھے سے زائد بھر چکا ہے ۔ یعنی سیاہی کے دھبّوں سے ۔ لڑکے کے پیچھے ، فرض کیجیے شاعرِ مشرق کھڑے ہیں جو وقفے وقفے سے اُسے سمجھاتے ہیں کہ مضمون کیسے لکھتے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتا ۔ پھر اچانک بچّے کو ایک کتاب نظر آجاتی ہے " فنِ مضمون نویسی " وہ اُسے پڑھتا ہے اور پھر فٹا فٹ مضمون لکھنے لگتا ہے ۔ شاعرِ مشرق کتاب اُٹھا کر دیکھتے ہیں اور ماتھے پر ہاتھ مار کر کہتے ہیں

" افسوس ! یہ کتاب مجھے کیوں نہ ملی ۔ بے شک مضمون نویسی سیکھنے کے لیے یہ ایک بہترین کتاب ہے " ۔ اب آپ آگے بڑھیے ، کتاب کھولیے ۔ یہ مصنّف کا انتساب ہے ۔

" مصنّف کے نام جن کی کاوشوں سے یہ بلند پایہ کتاب رقم ہوئی اور نوجوانانِ قوم کو ادب کی ایک نئی منزل سے آشنائی ملی "

بھلا یہ کیا بات ہوئی ۔ خیر آپ آگے بڑھیے ۔ اگلے صفحے پر ایک تصویر ہے غور فرمائیے آپ نے انہیں کہیں دیکھا ہے ۔ ان کی صورت کچھ جانی پہچانی سی ہے ۔ شاید انہیں بچوں کی پسندیدہ جگہ پر دیکھا ہے ۔
اُف ، لاحول ولاقوۃ یہ تو حضرت مصنّف ہیں لیکن اس میں آپ کا بھلا کیا قصور ۔ ان کی صورت ہی ایسی ہے ۔ اب اگلا صفحہ دیکھیے ۔ ان ممتاز اور مشہورِ زمانہ اُردو کے ادیبوں کے نام یہاں درج ہیں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں مدد دی ۔ یہ قریباً دس نام ہیں ان میں سے کسی کو بھی کوئی نہیں جانتا ۔

اگلا صفحہ بھی اسی قسم کا ہے ۔ اس سے اگلا بھی ایسا اور اس سے اگلا بھی ایسا ۔ یعنی ایک چوتھائی کتاب ایسے ہی گزر جاتی ہے ۔ کہیں مصنّف کا تعارف ہے تو کہیں کتاب کا اور کہیں ادارے کا ۔

اب کتاب کا اصل آغاز ہے ۔ دیکھیے سب سے پہلا سبق کیا ہے ۔ یہ سبق تو نہیں یہ تو کچھ اور ہی لکھا ہے ۔

" فنِ مضمون نویسی کا تعارف "

آپ زیرِ لب لاحول پڑھیے ۔ اس کے بعد ایک اور سرخی ہے " فنِ مضمون نویسی کی ابتدا " اس کے بعد فنِ مضمون نویسی کی تاریخ " اور پھر ایسے کئی مراحل سے گزر کر وہاں پہنچتے ہیں جہاں مضمون لکھنے کی ترکیب

درج ہے۔ ترکیب یہ ہے۔

"سب سے پہلے ایک کاغذ لیجیے۔ کاغذ کورا ہو۔ کاغذ سفید ہو، اگر بھُورا بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کاغذ پر دھبّے نہ ہوں، کاغذ کو ہاتھ پر مت رکھیے، کاغذ پر جُھکیے مت۔ کاغذ کا انتخاب احتیاط سے کریں۔ کاغذ پھٹا ہُوا نہ ہو، کاغذ پر لکیریں لگی ہوں وغیرہ وغیرہ۔"

اس کے بعد احتیاط نہ کرنے کے نقصانات بتائے گئے ہیں پھلانگ جائیے۔

"اب ایک قلم لیجیے احتیاط کیجیے کہ (آپ ان احتیاطوں کو بھی احتیاط سے پھلانگ جائیے۔)

"اب قلم کو کاغذ پر رکھیے اور کاغذ کو گتّے پر اور گتّے کو میز پہ اور میز کو زمین پر رکھیے اور خود بھی ایک کرسی پر تشریف رکھیے۔ اب آپ لکھنے کے لیے تیار ہیں۔ لکھنا شروع کر دیجیے۔ سوچیے مت کہ کیا لکھیں۔ بس آپ لکھیے۔ جو جی میں آتا ہے لکھیے۔ جو سمجھ میں آتا ہے لکھیے، جو نظر آتا ہے لکھیے۔ جو سنائی دیتا ہے لکھیے۔ اُس وقت تک لکھیے جب تک کاغذ نہ ختم ہو جائیں یا قلم میں سیاہی ختم نہ ہو جائے۔ اب آپ اپنے لکھے ہوئے کو پڑھیے۔ رونے کی کوشش نہ کیجیے۔ جذبات کو قابو میں رکھیے۔ دل کو مضبوط کیجیے۔ لکھے ہوئے کاغذ کو سر پر دے مارنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ یہ آپ کے دشمن نے نہیں آپ نے لکھی ہے۔ آپ اپنی ہی تحریر پڑھیے۔ جہاں غلط محسوس ہو وہاں درست کیجیے۔ جہاں درست معلوم ہو وہاں بھی درست کیجیے۔ اب اسے دوبارہ پڑھیے سہ بارہ پڑھیے۔ اتنی پڑھیے کہ خود آپ تنگ آ جائیں جب آپ اُکتا جائیں گے تو آپ محسوس کر سکیں گے کہ ایسی تحریریں پڑھ کر عام لوگوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔" آئیے دیکھیے آپ نے کیا لکھا ہے۔

"صاحب صدر اور عزیزانِ محترم! میری آج کی تقریر کا موضوع ' انڈے دس روپے درجن، بادام نایید، سگریٹ کی چھ ڈبیا۔ آپ تو جانتے ہیں مہنگائی کس قدر بڑھ گئی ہے۔ بازار میں جائیے تو سیب بیس روپے تولہ، کیڑا نو روپے لیٹر، سونف تین روپے درجن۔

کل رات سورج کیوں نہیں نکلا؟ یہ بادلوں کو تاروں نے کیوں ڈھانپ رکھا ہے۔ امّی کے لیے سگریٹ لانے ہیں۔ ابو نے میک اپ بکس کا آرڈر دے رکھا ہے۔ یہ گانا کون گا رہا ہے۔

ویسے اُن صاحب کا نام مجھے بالکل یاد نہیں رہتا۔ اسی لیے میں اُن کا نام بھُول جاتا ہوں۔ وہ صاحب ہیں بہت اچھے لیکن صرف نیت کے۔ اُن کے سر پر بال نہیں اور کبھی اس شدّت کے ساتھ نہیں کہ میل بھر دُور سے سورج کی شعاعیں اُن کی کھوپڑی سے منعکس ہو کر آنکھوں میں پڑتی ہیں۔ تیل کس قدر لگاتے ہیں چکنے لگتے ہیں۔ وہ تو خود اپنے سر میں دیکھ کر کنگھی کر لیتے ہوں گے۔ اور وہ جو میاں صاحب۔ وہ سوتے میں بھی عینک

نہیں اُتارتے۔ کہتے ہیں خواب صاف دکھائی نہیں دیتے۔ اِنچ بھر موٹی عینک پہن پہن کر اُن کی آنکھوں کے گرد نشان بن گئے ہیں۔ چنانچہ اگر عینک اُتار بھی دیں تو لگتا ہے پہن رکھی ہے۔

کل اسکول بھی جانا ہے، رات خواب میں ماسٹر صاحب سے چھٹی لے لوں گا، یہ بلّی کس سے لڑ رہی ہے۔ شاید اپنے میاں بلّے سے۔ بے وقوف ہے بھلا لڑنا بھی کوئی اچھی بات ہے بھلا محلّے والے کیا سوچیں گے۔ کہ ان کو محلّے میں رہنے کی بھی تمیز نہیں۔ دوسروں کے آرام کا خیال نہیں کرتے۔ محلّے کے بچّوں پر بُرا اثر پڑے گا۔ یہ امّی کسے آواز دے رہی ہیں شاید مجھے لیکن میں تو سُن ہی نہیں رہا۔ اُف لکھتے ہوئے کتنی دیر ہوگئی۔ اب بس کرنا چاہیے۔ لیکن کمبخت قلم میں سیاہی ختم نہیں ہوتی۔ یہ کاغذ بھی کمبخت ختم ہوتے میں نہیں آتے۔ اس کتاب میں تو لکھا ہے کہ یہ کتابیں لوگ نہ جانے کیوں لکھتے ہیں شاید پیسہ کمانے کے لیے مگر پیسے سب دکاندار کھا جاتے ہیں۔ یہ تو علی کی آواز ہے "حسن کہاں ہو" آوازیں دیتا ہے کمبخت۔ یہ کمبخت کمبخت میں اتنی بار کیوں لکھتا ہوں۔ گھڑی میں کیا بجا ہے؟ یہ گھڑی کیوں رُک گئی شاید تھک گئی ہے۔ کھاتی بھی تو کچھ نہیں۔۔۔"

اب آپ ہانپنے لگے، آپ کا سَر گھومنے لگا۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اُٹھیے۔ کاغذ اور کتاب اُٹھا کر آتش دان میں پھینکیے۔ اور سرہانے میں سر دبا کر آہستہ سے آرام سے سو جائیے۔

آپ نے دیکھا کتاب پڑھ کر مضمون نویسی سیکھنے کا۔ دوسروں کے مشوروں پر چلنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ہمارے پیر بابا ہی کو لیجیے۔ آپ انہیں جانتے ہیں۔؟ نہیں جانتے! ہائے آپ کتنے خوش نصیب ہیں۔ یہ پیر بابا کبھی ماسٹر پیر الٰہی بخش تھے۔ پھر اُن کے ہاتھ کالے جادُو کی ایک ایسی ہی کتاب لگ گئی۔ حضرت نے اس کتاب کو ہفتہ میں کوئی دس پندرہ مرتبہ پڑھ ڈالا۔ چنانچہ نہ جانے کون کون سے وظائف انہیں یاد ہوگئے پھر اُن کی دُنیا ہی بدل گئی۔ وہ رات کے بارہ بجے مُردہ ہڈی لیے قبرستان میں پھرتے پائے گئے۔ انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے گرد مرچیں جھڑکتے دیکھا گیا۔ ہڈیاں جما دینے والی سَردی میں ندی میں کپڑے اُتار کر کھڑے وظیفہ پڑھتے دیکھا گیا۔ کئی بار انہیں سردی لگ گئی۔ بیمار ہوئے۔ موت کے منہ سے نکل آئے۔ مگر ان حرکتوں سے باز نہ آئے۔ انجام بُرا ہوا آج وہ سادھو ہیں۔ محلّے کی بوڑھیاں اُن کا احترام کرتی ہیں۔ مانتی ہیں کہ حضرت کے پاس بڑے بڑے جن قید ہیں۔

مگر کافی خوشحال ہوگئے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں ہر روز تحفے تحائف نذرانے وغیرہ اپنی ماسٹری کی تنخواہ سے زائد کما لیتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ سب اُس کتاب کا کمال ہے یا اُن کا اپنا؟

فکری ماموں

احمد حاطب صدیقی

سیکنڈ ڈی کلاسوں میں پڑھنے والے سبھی بچوں کو بُلا کر چھوٹے چچا نے سمجھا دیا تھا کہ :

" دیکھو بھئی تمہارے فکری ماموں چھٹیاں گزارنے کے لیئے کراچی آرہے ہیں اُن کے سامنے خدا کے واسطے غلط اردو مت بولنا، ورنہ قیامت آجائے گی۔ پنجاب یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے ہیں۔ وہ شاید گالی تو برداشت کرلیں، مگر غلط اردو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے!"

" چھوٹے چچا!" کاشف نے سعادت مند طالب علموں کی طرح ہاتھ اُٹھا کر سوال کیا کہ :

" اُن کے سامنے اگر ہماری اردو غلط ہونے لگے تو کیا ہم لوگ کوئی چھوٹی موٹی گالی بک دیا کریں مثلاً اُلو ــــ پاجی ــــ گدھے ....."

"احمق"

"ہاں احمق بھی ......"

"میں تمہیں احمق کہہ رہا ہوں۔ بدتمیز کہیں کے۔ ادب نہ لحاظ۔ جو تم سے کہا جا رہا ہے سُنو اور اُس پر عمل کرو۔ تمہارے فکری ماموں صرف اردو کے پروفیسر ہی نہیں ہیں وہ ایک مشہور ادیب اور اچھے شاعر بھی ہیں۔ جناب مفکّر فکری۔ بہت عمدہ طبیعت اور سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک ہیں اُن کے سامنے اپنی جہالت کا ثبوت دینے مت بیٹھ جانا۔"

کاشف کا دل تو بہت چاہا کہ وہ چھوٹے چچا سے یہ بھی پوچھ لے کہ:

"چھوٹے چچا! کیا جہالت بھی سائنس کا کوئی اصول ہے جس کا ثبوت دیا جاتا ہو؟"

لیکن ابھی ابھی جو زبردست ڈانٹ پڑی تھی اُس کی کپکپی ابھی تک طاری تھی۔ اور چھوٹے چچا کی پیشانی سے تو ابھی سلوٹیں بھی دور نہیں ہوئیں تھیں۔

عمران کا خیال تھا کہ فکری ماموں یعنی جناب مفکّر فکری کوئی بہت فکرمند قسم کے آدمی ہوں گے اور ہر وقت پریشان ہی رہتے ہوں گے۔ کوئی بچّہ عمران کے اس خیال سے اختلاف نہ کر سکا۔ اِس لئے کہ وہ نویں جماعت پاس کر کے میٹرک میں چلا گیا تھا۔

جب فکری ماموں تشریف لے آئے تو سب بچّوں نے تائید کی۔ کہ عمران کا خیال کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ چھوٹے چچا نے تو یہ بتایا تھا کہ فکری ماموں بہت عمدہ طبیعت اور سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک ہیں۔ لیکن اُن کے اُلجھے ہوئے کھچڑی سے بالوں اور اُن کی چڑھی ہوئی تیوریوں کو دیکھ کر تو ایسا لگتا تھا کہ اُن کی طبیعت ابھی ابھی خراب ہو گئی ہے۔ البتہ اُن کو بولتے اور بات کرتے دیکھ کر اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ________ شخصیت زندہ ہے!

غلط تو کیا دو چار دنوں تک، بچّے اُن کے سامنے صحیح اردو بھی بولنے سے کتراتے رہے، بلکہ یوں کہیئے کہ بولنے ہی سے شرماتے رہے۔ مگر یہ تو صرف بچّوں کی احتیاطی تدبیر تھی نا! یہ ساری احتیاطیں اُس وقت دھری کی دھری رہ گئیں جب فکری ماموں نے بچّوں سے بولنا شروع کر دیا۔ اور یہ سب سے خطرناک مرحلہ تھا۔ ایک دِن انہوں نے نومی میاں کو اپنے قریب بُلایا اور اُن کے سر پہ ہاتھ پھیر کر پوچھا:

"نومی میاں! آپ کس جماعت میں پڑھتے ہیں؟"

نومی میاں کچھ دیر تو زیرِ لب جلدی جلدی بڑبڑاتے رہے۔ غالباً اپنی اردو درست کرنے کی کوشش کر رہے

تھے۔ پھر ڈرتے ڈرتے ادب سے جواب دیا کہ:

"جناب! میں ششم الف میں پڑھتا ہوں!"

فکری ماموں مسکرانے لگے اُسی دِن تمام بچّوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ فکری ماموں مسکراتے بھی ہیں۔ اُن کے مسکرانے کی خوشی میں عاصم نے فوراً "بابو جنرل اسٹور" سے لولی پاپ منگوا کر تقسیم کئے۔ مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ کیونکہ انہوں نے اگلے ہی روز کاشف سے پوچھ لیا کہ:

"کیا آپ کے محلّے میں کوئی کتب خانہ ہے؟"

اور یہ عقلمند اُنہیں "امیر علی، کبیر علی سوداگرانِ کتب" کی دکان پر پہنچا آئے۔ دکان سے گھر تک سارے راستے اور گھر میں آدھے گھنٹے تک جو انہیں فکری ماموں کا لیکچر سننا پڑا تو اُس سے اُن کو یہ اندازہ ہوا کہ "کتب خانہ" غالباً لائبریری کو کہتے ہیں۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ کاشف میاں اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے انہیں "آپ کی اپنی لائبریری" نہیں لے پہنچے جہاں سے ایک روپیہ یومیہ کرائے پر بچّوں کے ناول ملتے ہیں، ورنہ اُنہیں "کتب خانوں کی اقسام" پر بھی اتنی ہی لمبی تقریر سننی پڑتی۔

اِس کے بعد کئی ایسے واقعات ہو گئے کہ رفتہ رفتہ بچّوں کے دل سے فکری ماموں کا خوف دور ہو گیا اور وہ اُن سے الفاظ، محاروں اور ضرب الامثال کے معنی سیکھنے لگے۔ مگر سب سے دلچسپ واقعہ ننّھی ماریہ کے ساتھ پیش آیا۔

ماریہ بچاری کو تو بھی پوری طرح بولنا بھی نہیں آیا تھا۔ مگر فکری ماموں نے اُس کی اردو بھی درست کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

ایک روز وہ فکری ماموں سے چھپ کر فیصل کو آواز دے رہی تھی۔

"فیصل ادھر آؤ!"

فکری ماموں نے لپک کر اُسے گود میں اُٹھا لیا اور کہا:

"فیصل نہیں ـــــ فیصل بھائی کہو۔"

"فیصل بھائی کیوں؟"، ننّھی ماریہ نے اپنی دونوں بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

"اِس لئے کہ وہ تم سے بڑا ہے"، فکری ماموں نے پیار سے سمجھایا۔

"مجھ سے کیوں بڑا ہے؟"، ماریہ نے پھر سوال کیا اور فکری ماموں کچھ دیر کو ہکلا کر رہ گئے مگر فوراً ہی سنبھل کر جواب دیا کہ:

"تم سے اس لئے بڑا ہے کہ وہ تم سے پہلے پیدا ہوا ہے۔"
" اب ماریہ اُن کی گود میں بیٹھی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی کہ :
" کیا عاشی باجی مجھ سے بڑا ہے ؟ "
فکری ماموں اُس کا یہ سوال سن کر مسکرا دیئے۔ اور کہنے لگے :
" بڑا نہیں ـــــ بڑی ـــــ عاشی باجی بڑی ہیں "
ماریہ نے تعجب سے پوچھا کہ :
" کیوں ؟ فیصل بھائی بڑا ہے ـــ عاشی باجی بڑی ہے ـــ کیوں ؟"
فکری ماموں نے سمجھایا کہ :
" فیصل بھائی لڑکا ہے۔ اس لئے بڑا ہے۔ عاشی لڑکی ہے۔ اس لئے بڑی ہے۔"
شاید اُن کی یہ بات فوراً ہی ماریہ کی سمجھ میں آگئی۔ اس لئے اُس نے جھٹ سوال کیا کہ :
" کیا عاشی باجی بھی مجھ سے پہلے پیدی ہوئی تھی ؟ "
اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا اور فکری ماموں جھینپ کر رہ گئے شاید اُن کی سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ ماریہ کو "پیدا" اور "پیدی" کا فرق قائم کرنے سے کیسے باز رکھیں۔ لہذا وہ سب کے ساتھ ہنس پڑے مشہور محاورہ ہے کہ :
" ہنسے تو پھنسے "
بچے بھی اُن کے ساتھ خوب ہنسے مگر ماریہ کے علاوہ ـ اُسکے بعد بچوں اور فکری ماموں میں جو بھی اجنبیت تھی اور جو تکلف تھا وہ ختم ہو گیا اُن کے حوصلے بڑھنے لگے اور وہ فکری ماموں کے ساتھ بھی شوخ ہو گئے۔ بچوں کو شوخ ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔
ہاں تو اُس روز فکری ماموں نے سب بڑے بچوں کو جمع کیا اور کہا کہ :
" آج میں دیکھوں گا کہ تم لوگ کتنے پانی میں ہو ؟ "
کاشف نے جلدی سے خوشی کا اظہار کیا اور اپنے دانت لکالتے ہوئے پوچھا کہ :
" فکری ماموں کیا آج آپ ہم لوگوں کو کلفٹن لے جائیں گے ؟ "
" کلفٹن کا بھلا کیا ذکر ؟ " فکری ماموں نے ذرا ڈانٹ کر پوچھا۔
کاشف نے سہمے ہوئے لہجے میں وضاحت کی کہ :

"یہ تو آپ ہمیں وہیں لے جا کر دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کتنے پانی میں ہیں"۔

فکری ماموں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ کہنے لگے کہ :

"غضب خدا کا ——— تم میٹرک میں پہنچ چکے ہو اور محاروں کے استعمال سے ناواقف ہو۔ ٹھہرو۔ میں کچھ اور سوالات پوچھتا ہوں اس سے فوراً دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا!"

اب عمران کی شامت آئی جھٹ بول پڑا کہ :

"فکری ماموں! یہ "دودھ کا دودھ" کیا ہوتا ہے؟ ہم نے بھینس کا دودھ، گائے کا دودھ، بکری کا دودھ یہاں تک کہ ڈبّے کا دودھ بھی سنا ہے مگر "دودھ کا دودھ"، کبھی سنا نہ دیکھا"۔

"ابھی فکری ماموں کا پارہ چڑھنا شروع ہی ہوا تھا کہ نومی بول پڑا :

"فکری ماموں "پانی کا پانی"، بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دریا کا پانی، سمندر کا پانی، تالاب کا پانی، بارش کا پانی اور نل کا پانی تو ہوتا ہے۔ مگر یہ۔ "پانی کا پانی"؟!!!"

"اُفوہ"! فکری ماموں کو باقاعدہ غصّہ آگیا۔ کہنے لگے کہ :

"ارے بھئی یہ ایک ضرب المثل ہے۔ مشہور ہے کہ ایک گوالا دودھ میں پانی ملا کر بیچتا تھا۔ وہ دودھ بیچ کر آرہا تھا کہ اس کے روپوں کی تھیلی نہر میں گر گئی۔ اس نے جلدی سے غوطہ لگا کر روپے نکالے۔ مگر کچھ رقم ہاتھ آئی اور باقی نہر میں گم ہو گئی۔ اُس نے روپے گنے تو معلوم ہوا کہ جتنا دودھ تھا اتنے روپے اس کے پاس رہ گئے اور جتنا پانی ملایا تھا۔ اُس کی قیمت نہر میں بہہ گئی۔ گوالا بولا کہ "یہ تو دودھ کا دودھ۔ اور پانی کا پانی ہو گیا"۔ بس اُسی دن سے یہ ضرب المثل ہر ایسے موقع پر کہی جاتی ہے، جب غلط اور صحیح الگ الگ ہو جائے"

بچّے حیران رہ گئے۔ تو فکری ماموں کہانیاں بھی سناتے ہیں؟

"فکری ماموں۔ کوئی اور کہانی سنائیں!"، فیصل نے فرمائش کی۔ فکری ماموں نے اُسے گھور کر دیکھا اور کہا کہ :

"بھئی تم لوگ بڑے کام چور ہو۔ میں تو تم سے محاورے اور ضرب الامثال استعمال کروانا چاہتا تھا، اور تم مجھے کہانیوں کے چکر میں اُلجھا دینا چاہتے ہو۔ اس طرح کام چوری نہیں چلے گی!"

نومی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ :

"فکری ماموں! کام چوری ..... کیا ہوتی ہے ....."

فکری ماموں نے سر پکڑ لیا

"اُف ۔ اُف ۔ کام چوری کرتے ہو اور یہ نہیں معلوم کہ کام چوری کیا ہوتی ہے ؟ اُف ۔ چلو عائشہ تم "کام چوری" کو جملے میں استعمال کرو !"

عاشی نے گھبرا کر دوپٹہ سر پر رکھ لیا اور آنکھیں موند کر پڑھنے والے انداز میں بولی کہ:

"چھوٹی پھوپھی نے مجھے دوپٹے پر کڑھائی کا کام دیا تھا۔ لیکن سُمیّہ نے میرا کام چوری کر لیا اور ساری کڑھائی خود کر دی !"

اب تو فکری ماموں اپنے بال نوچنے لگے، بولے کہ:

"ہرگز نہیں ۔ ہرگز نہیں ۔ اگر سُمیّہ نے ساری کڑھائی خود کر دی تو یہ "کام چوری" ہرگز نہیں کہی جاسکتی کہ دوسروں کا کام بھی اپنے سر لے لینا، کام چوری کے اصولوں کے خلاف ہے۔"

عاشی بے چاری تو اس طرح سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ جیسے ہوم ورک نہ کرنے پر کلاس میں مس کے سامنے سر جھکا کر بیٹھتی ہے۔ مگر فیصل نے ذرا ہمت کی اور فکری ماموں سے پوچھا کہ:

"فکری ماموں کام چوری کے اصول کیا ہیں ؟"

"خود کوئی کام نہ کرنا اور اپنا کام بھی دوسروں سے کروانا !"

"فکری ماموں اِس اصول کے لحاظ سے عاشی کام چور ہوئی نا ؟"

"کام چور ہو گے تم خود ۔۔ ابھی ابّی جان سے کہہ کر تمہاری مار پٹواتی ہوں !"، عاشی نے غصّے میں لال بھبھوکا ہوتے ہوئے کہا۔ مگر اُس سے زیادہ لال بھبھوکا تو فکری ماموں ہو چکے تھے۔ کہنے لگے کہ:

"یہ "مار پٹوانا"، کیا ہوتا ہے ؟ بالکل فضول ۔ مہمل ۔ اور بے معنی سی بات ہے ۔ صحیح ترکیب ہے ۔ "مار پڑوانا" ـــــ "مار پڑوانا" ـــــ "کیا سمجھے فیصل ؟"

"جی ۔ جی ۔ مار پڑوانا"، فیصل میاں ہکلائے۔ کیوں کہ ابّی جان کے ہاتھوں چاہے ان کی "مار پٹے"، یا "مار پڑے"، بدن میں درد تو دونوں صورتوں میں ہو گا۔ اُسے فکری ماموں پر غصّہ بھی آ رہا تھا۔ کہ وہ عاشی کو "صحیح ترکیبیں"، کیوں بتا رہے ہیں ۔ عاشی کی غلط ترکیبیں ہی کیا کم تھیں۔ صحیح ترکیبوں سے تو اُس کی شامت آنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جائے گی۔ اُس نے فکری ماموں کے ڈر سے غلط اردو میں تو کچھ کہنے سے پرہیز کیا۔ مگر منہ چڑاتی عاشی کو دیکھ کر بے ساختہ اُس کے منہ سے نکلا:

"اُمّی"

اور اگلے ہی دن فکری ماموں اپنا بوریا بستر باندھے، واپس جا رہے تھے کہ:

"انتہائی نالائق بچے ہیں۔ انہیں سکھانا پڑھانا فضول ہے۔ بالکل فضول۔ اُف۔"

چھوٹے چچا نے ہر ایک سے انکوائری کی تو معلوم کہ وہ آخری بات جس سے فکری ماموں بھڑک اُٹھے تھے، فیصل کی تھی۔ فیصل سے جواب طلبی کی گئی تو اُس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا کہ:

"چھوٹے چچا! آپ نے تو خود کہا تھا کہ فکری ماموں شاید گالی تو برداشت کر لیں۔ مگر غلط اردو برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے تو عاشی کے بہت سارے جواب آتے تھے۔ مگر میں نے ڈر کے مارے ایک بھی جواب نہیں دیا۔ کہ کہیں میری اردو غلط نہ ہو جائے۔ بس میرے منہ سے گالی نکل گئی! لیکن فکری ماموں تو اُسے بھی برداشت نہ کر سکے۔"

"بیٹے — بیٹے —" چھوٹے چچا نے چمکار کر کہا — "آپ نے گالی بھی تو غلط اردو میں دی تھی۔ اُلو کا مونث بھی اُلو ہی ہے۔"

حق اسکواڈ

ماہنامہ آنکھ مچولی کا
مقبول ترین سلسلۂ تحریر
اخلاق احمد کی مہماتی کہانیوں کا

دلچسپ مجموعہ

برائیوں سے برسرِپیکار
۴ کمسن مجاہدوں کے کارنامے
حسین سرورق۔ اعلیٰ طباعت
حق اسکواڈ کے حصول کے لیے
دس روپے کے
ڈاک ٹکٹ ارسال کیجیے،

ڈاک ٹکٹ ارسال کرنے کے لیے ہمارا پتہ

گرین گائیڈ اکیڈمی

ڈی، ۱۱۲ نورس روڈ، سائٹ، کراچی ۱۶

ہندسوں کا ہیرو

شاہنواز فاروقی

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ دُنیا کا آغاز ہوں میں
اِسی لیے چھوٹا ہو کر بھی سب سے گہرا راز ہوں میں
ایک کے ساتھ کھڑا ہو کر میں ایک کو دس کر دیتا ہوں
نو۹ سے ایک زیادہ قوّت میں اُس میں بھر دیتا ہوں
ستّا کے آگے سے ہٹ جاؤں تو وہ دس رہ جاتا ہے
اُس کا سارا رُعب دبدبہ پل بھر میں ڈھ جاتا ہے
اچھّے اچھّے طلبہ میرے نام سے تھر تھر کانپتے ہیں
آجاؤں میں پرچے میں تو شرم سے منہ کو ڈھانپتے ہیں
مجھ سے چِڑنے والے طلبہ مجھ کو انڈا کہتے ہیں
کچھ اس سے بھی آگے بڑھ کر گولا گنڈا کہتے ہیں
دائیں جانب رہتا ہوں میں ہر دم مالا مال!
ہو جاتا ہوں لیکن بائیں جانب میں کنگال
دنیا والوں کی نظروں میں گول گول اِک زیرو ہوں
لیکن سچّی بات تو یہ ہے میں ہندسوں کا ہیرو ہوں

اپنے دانتوں کو
مزے سے صاف کیجئے
کرسٹل کے تین ذائقے، تینوں مزے دار
کرسٹل ریڈ جیل میں چیری، گرین جیل میں
منٹ اور کرسٹل وہائٹ میں منٹ فریش۔
کرسٹل سے برش کیجئے، ٹوتھ پیسٹ کا مزا
لیجئے دانت ہمیشہ صاف، چمکدار اور کیڑا
لگنے سے محفوظ۔
Crystal
سانس خوشگوار، دانت چمکدار
Crystal
Crystal
Crystal
white

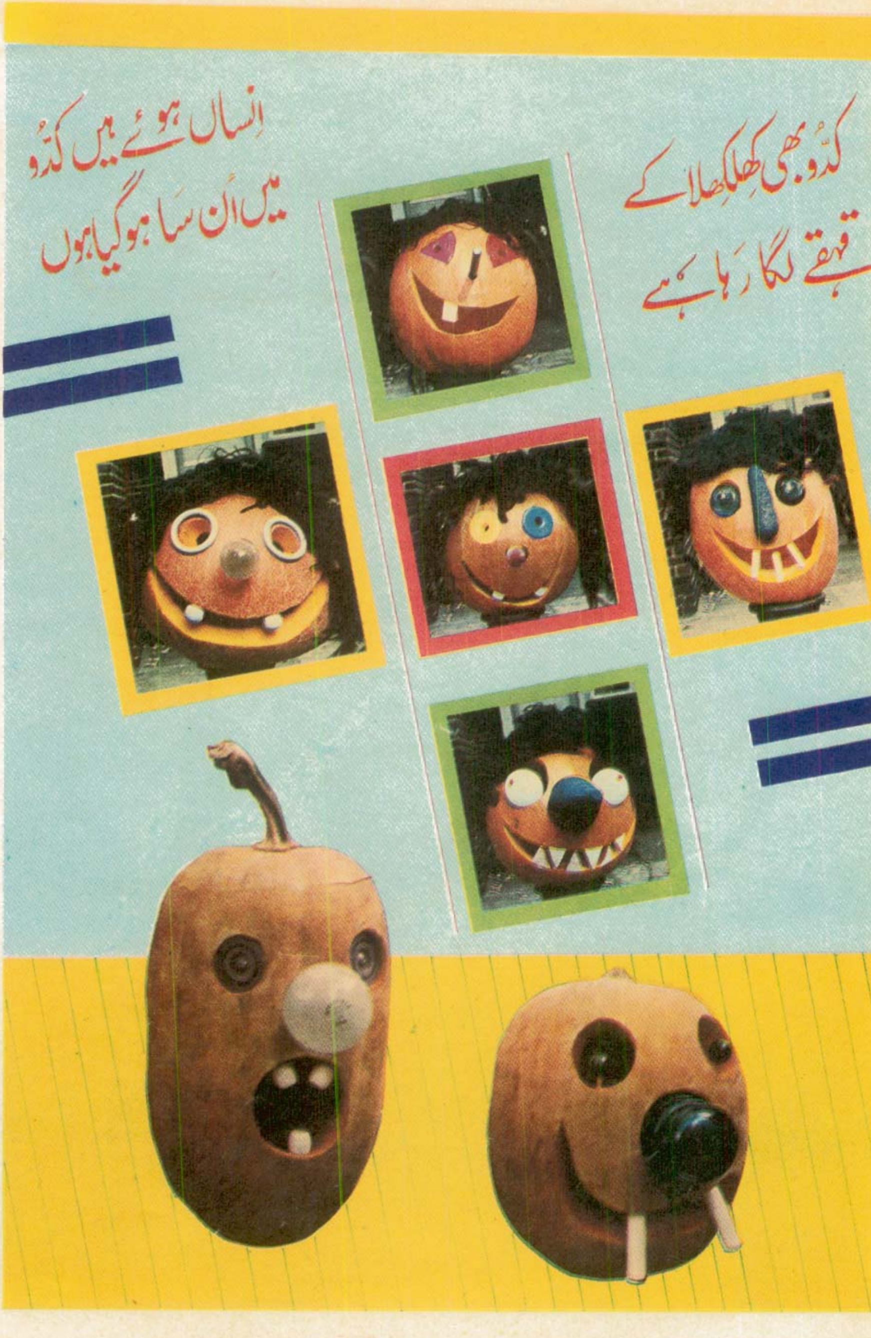
کدو بھی کھلکھلا کے
قہقہے لگا رہا ہے
انساں ہوئے ہیں کدو
میں اُن سا ہو گیا ہوں

"کدّوؤں" کی کمی نہیں غالبؔ
ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

اللہ میاں نے ہزاروں سبزیاں پیدا کیں لیکن کدّو کا جواب نہیں، کھانے میں اچھا بھی ہے اور مفید بھی، لیکن پتا نہیں اس کی شکل و صورت میں کوئی ایسی بات ہے یا اس کے نام میں کہ لفظ کدّو بولتے ہی گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ اچھا تو آپ کو یقین نہیں آرہا ہے۔ ذرا زور سے بولیے۔

"کدّو..."

ہے نا عجیب کھلکھلاتا سا لفظ۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں، گول اور لمبے، لیکن ہوتے دونوں کدّو ہی ہیں۔ کچھ بے وقوف بے وقوف سے۔ اسی لیے تو جب کوئی احمقانہ بات کرتا ہے تو اُسے فوراً ہی جواب ملتا ہے۔

"تم تو نرے کدّو ہو" یا "تم کدّو کے کدّو ہی رہے"

کدّو ڈاکٹروں میں بہت مقبول ہے۔ جبھی اکثر بیماروں کو وہ کدّو کھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ چونکہ یہ بے ضرر سی سبزی ہے اس لیے اسے کھانے میں وہی مزہ آتا ہے جو نہ کھانے میں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بے مزہ ہوتا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ کدّوؤں کا صرف ایک ہی پرچۂ ترکیبِ استعمال ہے۔ یعنی یہ کہ اسے کبھی گوشت کے ساتھ پکا لیا جائے، کبھی آلو کے ساتھ اور کبھی کسی اور چیز کے ساتھ، لیکن صاحب پتا چلا کہ دُنیا میں ایسے ایسے کدّو پڑے ہیں۔ کہ جنھیں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔

خاص طور پر امریکہ میں کدّوؤں کا استعمال تو نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ سامنے کے صفحے پر رنگین تصویروں میں دیکھیے۔ یہ سب کے سب کدّو ہیں۔ مُسکراتے ہوئے، قہقہہ لگاتے ہوئے شرماتے ہوئے کدّو... ایسا لگتا ہے جیسے یہ سارے پوز انہوں نے ہمارے قہقہہ نمبر کے لیے بنائے ہوں۔

اصل میں یہ سارا کمال امریکہ کے ڈاکٹر جیمس گولڈن کا ہے جنھیں کدّوؤں سے عشق ہے اور انہوں نے انہیں پینٹ کرکے ایسا بنا دیا ہے کہ اب یہ کدّو سے زیادہ جیتے جاگتے شریر بچّے لگ رہے ہیں۔

کیسے کیسے لگے آپ کو یہ کدّو بچّے!

ایک تھا بادشاہ

صوفیہ بٹ

بچّو! کسی زمانے میں ایک تھا بادشاہ بہت ہی نیک دل اور رحم دل" مگر اُس کے اولاد کوئی نہ تھی بادشاہ نے خُدا سے بہت دُعائیں کیں بالآخر ایک دن جب بادشاہ سلامت پائیں چمن میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ خادمِ خاص بھاگتا ہُوا آیا اور بولا " مبارک ہو بادشاہ سلامت خدا نے آپ کو چاند سا بیٹا عطا کیا ہے ..."

دوستو! یہ کہانی آپ میں سے اکثر نے پڑھی ہوگی ۔ مگر جس طرح یہ کہانی آپ کو جھُوٹی لگی ہمیں بھی ایسی ہی محسوس ہوئی ۔ ہم نے سوچا کیوں نہ بادشاہ سلامت کی ایک سچّی کہانی لکھی جائے ۔ سچّی کہانی پیشِ خدمت ہے ۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی ۔

نئے زمانے کی بات ہے ایک عالی شان محل میں ایک بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ رہتا تھا ۔ اُس بادشاہ کی کوئی اولاد نہ تھی ۔ بادشاہ اور ملکہ کو اس بات کا بہت غم تھا ۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ بادشاہ ڈھیلی ڈھالی عجیب وضع کی پینٹ اور رنگ برنگی جوکروں والی قمیض پہنے کانوں میں واک مین لگائے محل کے لان میں ٹہل رہا تھا

اچانک محل کے اندر سے ایک نوکر بھاگتا ہُوا آیا اور تقریباً چیختے ہوئے بولا " بادشاہ سلامت مبارک ہو ۔ آپ کے ہاں ولی عہد پیدا ہُوا ہے ۔"

" کیا! " بادشاہ سلامت بے ساختہ چلاّئے اور خوشی میں اپنا واک مین ملازم کو بخش دیا ۔ ولی عہد

کیا پیدا ہُوا بادشاہ سلامت کی زندگی میں بہار آ گئی۔ جب ولی عہد کی عمر ڈیڑھ مہینے کی ہو گئی تو ایک روز ملکۂ عالیہ نے کہا۔

"بادشاہ سلامت! کیا بیٹے کی خوشی میں آپ ہمیں ٹریٹ نہیں دیں گے؟"

بادشاہ نے مُسکراتے ہوئے کہا "WHY NOT -- WHY NOT -- کیوں نہیں، کیوں نہیں۔"

"تو پھر کب؟" ملکہ نے بیتابی سے پوچھا۔

"آپ کہیں گی تو ابھی اور اسی وقت" بادشاہ سلامت نے جواب دیا۔ "لیکن آپ کہاں دعوت کھانا پسند کریں گی؟"

"ریوالونگ ریسٹورنیٹ" ملکۂ عالیہ نے جھٹ سے جواب دیا۔ ملکۂ عالیہ نے بیگ کندھے پر لٹکایا اور چلنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ اور بچے کو گود میں اُٹھانے گئیں۔ مگر بادشاہ کو سوچتے دیکھا تو رُک گئیں اور حیرت سے بولیں

"کیا بات ہے۔ بادشاہ سلامت آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"دراصل ہم یہ سوچ رہے ہیں۔ مگر خیر چھوڑیئے ..."

"نہیں۔ آپ کچھ چھُپا رہے ہیں۔ جب تک آپ ہمیں شریکِ راز نہیں کریں گے ہم ٹریٹ نہیں لیں گے" ملکہ نے کہا۔

"بات یہ ہے ملکۂ عالیہ! ملک کا خزانہ دن بدن خالی ہوتا جا رہا ہے" بادشاہ سلامت نے ابھی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ ملکہ چیخ پڑی "جب ہمیں ٹریٹ دینے کا وقت آیا تو آپ کا خزانہ خالی ہو گیا۔ یہی ہے آپ کا انصاف۔ اور آپ کے وزیر دونوں ہاتھوں سے سارے ملک کی دولت لوٹ رہے ہیں۔ تو آپ نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ بہت خوب عالی جاہ۔ بہت خوب" ملکہ کی لعن طعن سے بادشاہ سلامت پریشان ہو گئے۔ اور انہوں نے فرمایا "آپ تو بلاوجہ ناراض ہو رہی ہیں ملکۂ عالیہ۔ ہم تو یونہی ایک بات کہہ رہے تھے۔ آئیے ریوالونگ ریسٹورنٹ چلتے ہیں"

بادشاہ اور ملکہ دونوں سالِ رواں کی بہترین کار میں روانہ ہوئے۔

"جی تو فرمائیے ملکہ عالیہ آپ کے لیے کیا منگواؤں؟" بادشاہ سلامت نے ریسٹورنیٹ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ خوب واقف ہیں حضور کہ ہمیں چینی کھانے بہت پسند ہیں" ملکۂ عالیہ نے جواب دیا۔

انواع و اقسام چینی کھانے میز پر سجا دیے گئے۔ ابھی ملکۂ عالیہ اور بادشاہ سلامت نے کھانے کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھایا تھا کہ شہزادے صاحب نے رونا شروع کر دیا۔ اب تو دونوں بہت پریشان

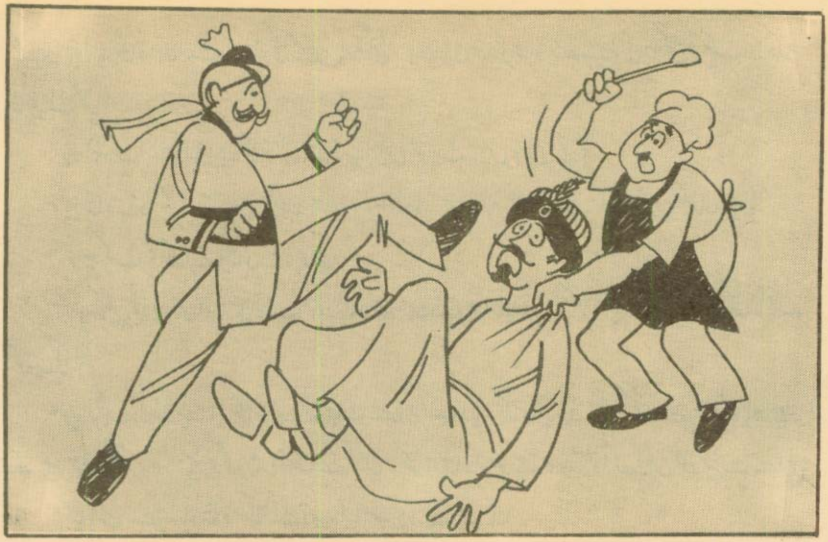

ہوئے۔ کیونکہ ملکۂ عالیہ جلدی میں فیڈر لانا بھول گئی تھیں۔ انہوں نے کافی کوشش کی کہ بچہ بہل جائے۔ مگر جناب شہزادے صاحب تو اور زیادہ چلا چلا کر رونے لگے۔

اچانک ایک بیرا دوڑتا ہُوا آیا اور کہنے لگا "جناب آپ کا بچّہ دودھ کی بوتل کے لیے رو رہا ہے نا۔ تو آپ ایسا کریں اسے کوئی سافٹ ڈرنک کی بوتل دے دیں۔ بچہ ہی تو ہے۔ اسے کیا معلوم کہ دُودھ کی بوتل میں اور اس بوتل میں کیا فرق ہے"۔ بیرے نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔

ملکۂ عالیہ کو مشورہ پسند آیا۔ انہوں نے مشورے کو شرفِ قبولیت بخشا اور ننھے شہزادے کو پیپسی کی ٹھنڈی بوتل پلادی۔ بادشاہ سلامت نے سکون کا سانس لیا اور کھانے کی طرف متوجہ ہوئے اور کھانے سے پورا پورا انصاف کیا جب دونوں کھانا کھا چکے تو بیرا بِل لے کر آیا۔ بادشاہ سلامت نے بِل دیکھا تو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ بیرے کی طرف متوجہ ہوئے۔ "بھائی بہرے"

"جی میں بہرہ نہیں ہوں بیرہ ہوں یعنی ویٹر"۔ بیرے نے وضاحت کی۔

"اچھا چلو جو کوئی بھی ہو۔ ہم بادشاہ سلامت ضرور ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ یہاں جتنے بھی لوگ ہیں سب کا بِل ہم ہی دیں گے"۔ بادشاہ سلامت نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

بیرے نے کہا "نہیں حضور! یہ صرف آپ کا ہی بِل ہے"۔

بادشاہ سلامت نے اس مرحلے پر بحث مناسب نہ سمجھی اپنی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالا - ایک دو تین، چار، پانچ غرضیکہ انہوں نے اپنی پینٹ کی نوکی نو جیبیں دیکھ ڈالیں جیسے جیسے وہ جیبیں دیکھتے جارہے تھے - اُن کے چہرے کی رنگت ہی بدلتی جارہی تھی - پھر سکتے کی حالت میں ملکہ سے بولے۔

" ملکۂ عالیہ لگتا ہے، ہمیں کسی نے لوٹ لیا ہے "

" کیا ؟ ملکۂ عالیہ حیرت سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور جلدی میں اُن کا گھٹنا ٹیبل سے ٹکرایا تو ایک چھناکے کے ساتھ چند برتن بھی گر کر ٹوٹ گئے - بادشاہ سلامت اس چھناکے سے ایک دم چونک گئے - انہوں نے بیرے کو عجیب نظروں سے دیکھا جس میں شرمندگی بھی تھی، رحم بھی تھا۔

" بھائی بیرے " انہوں نے کہا۔ " ہمیں کسی نے لوٹ لیا ہے - اب ہم بل نہیں دے سکتے - تم ... تم ہمارے محل چلے جاؤ - بل ادا ہو جائے گا "

بیرا، بادشاہ سلامت کی حیثیت کی پروا کیے بغیر جھگڑنے لگا - اتنے میں ہوٹل کا مینجر بھی آگیا - بادشاہ سلامت مینجر کی طرف مُڑے " شاید ہمیں کسی نے لوٹ لیا ہے - اور بل ادا کرنے کے لیے اب ہمارے پاس روپے نہیں ہیں - آپ اپنا بل صبح دربار میں پیش کریں - ہم شہنشاہ سلطنت ہیں - اور یہ بات اپنے بیرے کو بھی بتا دیں "

" بالکل حضور، جیسا آپ نے فرمایا ویسا ہی ہوگا - میں بیرے کو سمجھا دیتا ہوں " مینجر نے نہایت عاجزی سے کہا اور پھر بیرے کے کان میں کچھ کہا - بیرے نے اثبات میں سر ہلا دیا -

مینجر، بادشاہ سلامت سے مخاطب ہوا " ظلِّ الٰہی آپ سے بل لینا تو درکنار - اب آپ کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا - یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج شہنشاہِ اعظم نے ہمیں خدمت کا موقع دیا - اگر آپ واپس جانے کی خواہش رکھتے ہوں تو میرے بیرے آپ کو دروازے تک چھوڑ کر آئیں گے " بادشاہ سلامت شاہانہ وقار اور جاہ و جلال کے ساتھ چل دیے - ساتھ میں ملکۂ عالیہ تھیں اور پیچھے بیرے سر جھکائے ہاتھ باندھے باادب چل رہے تھے - جیسے ہی بادشاہ سلامت گیٹ سے باہر نکلنے لگے - گیٹ کیپر نے بادشاہ کو روک لیا اور مسکراتے ہوئے کہا " سر لیڈیز فرسٹ "

" یقیناً یقیناً " بادشاہ سلامت نے ملکہ کو رستہ دیتے ہوئے کہا -

ملکہ کے نکلنے کے بعد جیسے ہی بادشاہ سلامت نے باہر قدم رکھا کسی نے کالر سے پکڑ لیا " بادشاہ سلامت جان کی امان پائیں تو کچھ پیش کریں "

دوستو! اس کے بعد نہ پوچھو کہ بادشاہ سے بل کس طرح وصول کیا گیا۔ اُدھر ملکۂ عالیہ کار میں بیٹھی بادشاہ سلامت کا انتظار کر رہی تھیں۔ اُنہیں بہت کوفت ہو رہی تھی۔ کیونکہ ٹھنڈی بوتل پینے سے ننھے شہزادے کو ٹھنڈ لگ گئی تھی اور وہ کھانس رہا تھا۔

اچانک چند بیرے بادشاہ سلامت کی سواری لے کر پہنچے۔ کار کی پچھلی سیٹ پر زخمی بادشاہ سلامت کو پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے ایک بیرا بولا۔

"ملکۂ عالیہ سنبھالیے اپنے شہنشاہِ اعظم کو۔"

ملکہ پریشانی سے بولیں "عالی جاہ یہ کیا ہُوا!"

بادشاہ کراہتے ہوئے بولے "ان بے ادبوں نے ہماری بادشاہت کا بھی لحاظ نہ کیا بہت مارا۔ ہائے ... آہ ..."

اچانک مینیجر بھی آپہنچا اور کھڑکی سے جھانک کر مُسکراتے ہوئے بولا۔

"حضور یہ آپ کی بادشاہت کا لحاظ ہی تو ہے۔ جو آپ کو کار تک چھوڑنے آئے ہیں۔ آئندہ احتیاط کیجیے گا۔ تشریف لے جائیے۔ اب آپ کے دربار کا وقت ہو رہا ہوگا۔" ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مینیجر کے قہقہے نے اُن کا دُور تک پیچھا کیا۔

پس پیارے دوستو! اس کہانی سے یہ سبق ملا کہ کسی ریسٹورینٹ میں جاتے سے پہلے اپنا بٹوہ ٹٹول کر ضرور دیکھ لینا چاہیے۔ کیوں ٹھیک ہے نا...؟

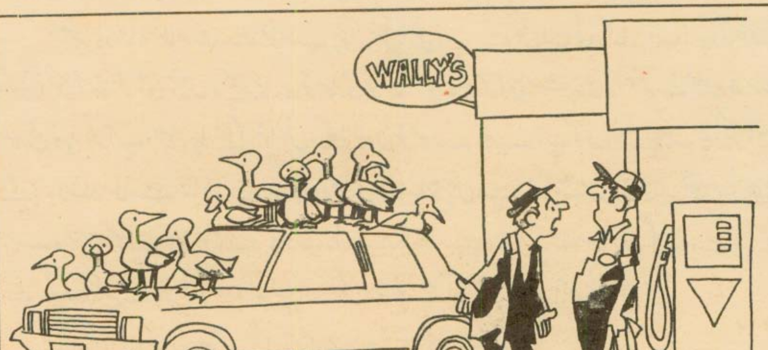

مشکل تو یہ ہے۔ کہ اب پرندے بھی لفٹ لے کر سفر کرنے لگے ہیں

رفعت ہمایوں

میرے بچپن کے دن

ہنستی مُسکراتی گُدگُداتی یادیں

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم چھوٹے تھے۔ اب اتنے بھی چھوٹے نہیں جتنا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ مگر تھے چھوٹے ہی۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ ہر انسان کو بڑا بننے کے لیے چھوٹا ضرور بننا پڑتا ہے۔ ہم کہنے کو تو سات بھائی بہن تھے۔ مختلف عمروں کے، مختلف رنگوں کے، سائز کے، مگر ہمارے حصّے کے بچّے اور ہمارے چچا کے بچے سب اتنا مل جُل کر رہتے تھے کہ لوگ ہم تیئیس چوبیس بچّوں کو سگا بہن بھائی سمجھتے تھے اگر انہیں کوئی کہتا بھی تھا کہ ہمیں الگ الگ کرو کہ ہم کس کے بچے ہیں تو انجان لوگ کالے کالے بچّوں کو الگ کرتے جن میں ہم بھی شامل تھے۔ اور گورے گورے بچّوں کو الگ کرتے۔ ملی جُلی رنگت والے بچّوں کی ایک ٹکڑی الگ تیار ہوتی۔ گورے بچّے خاں صاحب کے ہوتے کیونکہ چچا چچی دونوں گورے تھے یا بڑے چچا جان کے۔ کیونکہ وہ بھی گورے تھے اور کالے بچّے پاپا کے حصّے میں آتے اور ملی جُلی رنگت والے دوسروں کے بچّے ہوتے تھے۔ مگر ہم سارے بچّے اندر سے ایک ہی تھے۔ ایک ساتھ کھیلنا کودنا۔ ایک ساتھ کھانا کھانا۔ کبھی خان صاحب کی چچی (ان کی بیوی) نے ہمیں پکڑ کر اکٹھا کھلا دیا۔ کبھی ہماری امّی نے سب چھوٹے بچّوں کو (بڑوں کو نہیں) اکٹھا کھِلا دیا۔ ہم ایک ہی عمروں کے بچّے تقریباً دس بارہ تھے۔ تھوڑا تھوڑا سا فرق تھا۔ ہمارے گروپ کا ایک ہی مشترکہ دُشمن تھا۔ وہ تھے بھائی جان۔ وہ تو اتنے لڑاکا تھے کہ بے بی آپا جو ان کی پکّی دوست تھیں اکثر اُن سے لڑ کر ہمارے گروپ میں شامل ہو جاتی تھیں۔ ایک طرح سے وہ ہم سب کے

دادا ابرڑے بھائی تھے۔ ہر چیز میں وہ اپنا حصّہ الگ اور دُگنا مانگتے تھے۔ ہم چھوٹے بچّوں کو کین کی آرام کرسیاں اور صوفے اُلٹ کر جانور بنا دیتے اور پھر اپنے دوستوں کو اس چڑیا گھر کی سیر کراتے۔ ہمیں بندر بناتے، خالہ بھائی جان کو خرگوش۔ ثروت کو لومڑی، کیونکہ وہ چالاک تھی۔ ہر بچے کی کمر اس کرسی میں جُھکے جُھکے دوہری ہوجاتی مگر ان کے دوستوں کی سیر پوری نہیں ہوچکتی۔ ہم کین کی جھریوں سے ٹکر ٹکر بے بسی سے جھانکتے رہتے اور بھائی جان سمیت ان کے سارے دوست چڑیا گھر کی سیر کرتے رہتے۔ کبھی ہم آپا آپا کھیلتے تو بے بی آپا اور ہم سب مل جُل کر بڑی مشکلوں سے کچا پکا کھانا جو کہ عموماً کچا ہی رہتا تھا، دال چاول پکاتے اب اس میں سے آدھا کھانا وہ کھا جاتے اور تین تین چار چار دانے ہمارے حصّے میں آتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ہم ڈرامہ کھیلتے تو خود بادشاہ بن کر ہمیں غلام بچے بنا دیتے۔ ہم غبارے پھُلا پھُلا کر اُن کے آگے ڈالتے جاتے اور دو چار بچّے جلدی جلدی ان غباروں پر تولیہ ڈالتے جاتے اور پاپا کا باتھنگ ٹوول کندھے پر چپکا کر جسے دو بچّے پیچھے سے پکڑے ہوتے۔ وہ بڑی شان اور تمکنت سے تولیوں سے ڈھکے ہوئے غباروں پر پاؤں رکھتے، پھٹ پھٹ کرتے تخت پر جا کر بیٹھ جاتے۔ یہ کھیل ہم اکثر امّی پاپا کی غیر موجودگی میں کھیلا کرتے تھے۔ کیونکہ اس کھیل میں دھوبی کے دُھلے ہوئے کپڑے امّی پاپا کا سلیپنگ سوٹ، گاؤن، اُن کے کپڑے اور چادریں تکیے کے غلاف وغیرہ خوب گندے ہوتے تھے۔ جنہیں ہم ان کے آنے سے پہلے اسٹور میں میلے کپڑوں میں ڈال دیا کرتے تھے۔

تکیے کے غلاف تو اکثر پھٹ ہی جایا کرتے تھے۔ کیونکہ ہمیں تکیوں سے لڑنے میں بڑا مزا آتا تھا۔
خیر صاحب جب ہم ڈرامہ ڈرامہ کھیلتے تو بنگلہ دیش میں تو تمہیں پتا ہے پھل بہت مہنگے ہوتے تھے۔ خصوصاً سیب اور انگور ہمارے پاکستان سے جاتا تھا۔ ہمارا بچپن مشرقی پاکستان میں گزرا ہے جو اب بنگلہ دیش بن چکا ہے۔ ہاں تو ہم سب بچّے بڑی مشکلوں سے پیسے جمع کرتے۔ انگور خریدتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ آدھا پاؤ یا پاؤ بھر اور بادشاہ سلامت جب بھائی جان ہوتے تھے تو خوب وعدے کرتے تھے۔ کہ بادشاہ بن کر وہ صرف دکھاوے کے طور پر انگور کھائیں گے اور بس منہ تک لا کر جھوٹ موٹ منہ چلائیں گے۔ جب وہ غباروں پر چل رہے ہوتے تھے تو ہم غلام بچّے اشاروں ہی اشاروں میں اُن سے کہتے، بھائی جان ہمارا مطلب ہے، بادشاہ سلامت انگور مت کھائیے گا اور وہ بڑے وقار سے سَر ہلاتے کہ نہیں کھائیں گے، مگر تخت پر بیٹھتے ہی وہ سارے وعدے بھول جاتے اور غپ غپ سارے انگور چٹ کر جاتے۔ ہم تلملا کر رہ جاتے۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ کہ غلام بچّے جو ٹھہرے۔

جب ہم ہندوستان پاکستان کھیلتے تھے تو مار مار کر ہمیں ہندوستان بنا دیتے تھے۔ اور خود پاکستان بن جاتے۔ گھر کے سامنے جو بڑا میدان تھا۔ اُس کا آدھے سے زیادہ حصہ پاکستان بناتے اور تھوڑا سا حصہ ہندوستان بناتے۔ اُس وقت ہمیں انگریزوں کی اس بے ایمانی کا نہیں پتا تھا کہ وہ سب بھائی جان ہی تھے۔ زیادہ حصہ ہندوستان کو دے دیا۔ خیر صاحب ہندوستان پاکستان کی لڑائی ہوتی۔ ہم بچے جاسوس بنتے۔ کبھی آمنے سامنے لیٹ کر ہاتھوں کی بندوق سے لڑائی ہوتی۔ کبھی لکڑی کی تلواروں سے لڑائی ہوتی مگر ہارنا ہمیں ہی پڑتا تھا۔ کیونکہ ہم ہندوستان جو تھے۔ اس ہار کے بعد ہم بھائی جان کے سامنے جو کہ پاکستان کے سردار ہوتے تھے، ہتھیار ڈالتے تھے اور پھر وہ ہماری خوب پٹائی کرتے تھے۔ جو کہ جھوٹ موٹ کی ہوتی تھی۔ مگر پٹائی ضرور ہوتی تھی۔ اگر ہم پاپا سے اُن کی شکایت کر دیتے تو وہ ہمیں... چیونٹیوں (بھوری چیونٹیوں) کے بلوں پر کھڑا کر دیتے اور ہمیں جب پتا چلتا جب چیونٹیاں ہمیں کاٹنا شروع کر دیتیں۔

رمضانوں میں وہ ہمارا سارا پاکٹ منی (روزانہ کے پیسے) ہم سے لے لیتے اور ایک ہی کہانی سُناتے جو چاند رات کو اس وعدے پر ختم ہوتی کہ عیدی میں سے ہم بچے آدھے پیسے اُنہیں دیں گے۔ اس کہانی میں ایک بلی کندھے پر بندوق لٹکا کر شیر کے شکار کو نکلتی ہے۔ وہ گھڑ گھڑ کر واقعات سُناتے رہتے۔ اُس وقت تو بڑا مزہ آتا مگر جب ابا کے ہاں قرآن پڑھنے جاتے تو بھائی جان چیزیں خرید خرید کر کھاتے جاتے اور ہم اُن کا منہ تکتے، اور منہ میں پانی آتا رہتا۔

تمہیں تو پتا ہے کہ جب کوئی بادشاہ حد سے زیادہ ظلم کرنے لگتا ہے تو عوام اُس کے خلاف بغاوت کر دیتی ہے۔ ہمارے دادا ہمیں روز ایک سبق دیا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے ہمیں ایک کہانی پڑھائی "اتفاق میں برکت ہے۔" ہمیں وہ کہانی بہت پسند آئی اور ہم تیرہ چودہ بچوں نے مل کر یہ طے کیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ظلم کے خلاف آواز اُٹھائیں۔

اور یوں ایک دن جب امی پاپا فلم دیکھنے گئے ہوئے تھے ہم چودہ بچے بھائی جان سے لپٹ گئے۔ اُسی دن انہوں نے ماسٹر صاحب سے ہماری شکایت کر کے ہماری پٹائی کروائی تھی۔ ہم سب غصّے کا شکار تھے۔ دو بچوں نے اُن کی ٹانگ گھسیٹی۔ جب وہ قالین پر گر پڑے تو ہم نے خُوب اُن کی دھنائی کی۔ کوئی اُن کے پیٹ پر کُودا، کوئی اُن کے کندھے پر دانت جما کر چمٹ گیا۔ بھائی جان کی چیخیں اور غصّے کی غرّاہٹ دونوں نے عجیب سا سماں باندھ رکھا تھا۔ وہ حیران تھے اور غصّے کا شکار بھی تھے۔ کہ وہ بچے جو اُن کے سامنے بھیگی بلّی بنے رہتے تھے۔ چوں بھی نہیں کرتے تھے۔ اُن کا غنڈہ ٹیکس دیتے تھے۔ ہر چیز میں اُن کا حصّہ

تھا۔ اور اُن سے خاموشی سے پِٹ بھی لیتے تھے۔ آج کتنے شیر تھے، مگر آج لاوا پھٹ پڑا تھا۔

اس دھینگا مُشتی میں خبر ہی نہیں ہوئی کہ امی، پاپا واپس آگئے ہیں وہ حیران و پریشان یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ آخر پاپا نے زور سے چیخ کر ہمیں اس طوفانِ بدتمیزی کو روکنے کو کہا۔ ہم سب بھائی جان کو روک کر ہٹ گئے۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے سے پِٹ رہے تھے اور اب ساڑھے نو بج رہے تھے۔

پاپا نے غصّے میں پوچھا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم لوگ اپنے بھائی جان کو کیوں پیٹ رہے تھے"۔ پہلے تو ہم سب ڈر گئے۔ پھر ہم نے سوچا کہ سچ سچ بتا دیں "پاپا وہ آج آپا نے ہمیں ایک کہانی پڑھائی تھی کہ "اتفاق میں برکت ہے"۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کبھی ہماری ثروت سے لڑائی ہو جاتی تھی اور کبھی ڈولی کی پنیٹر سے مگر آج ہم سب کی دوستی ہے۔ بھائی جان روزانہ ہمیں تنگ کرتے تھے۔ آج ہم سب نے مل کر اِن سے بدلہ لیا ہے۔ پورا بدلہ"۔ پاپا کے چہرے پر ہلکی سی مُسکراہٹ آئی مگر وہ دبا گئے۔ امی ہنس پڑیں۔ پھر پاپا بولے۔ "بیٹا یہ ضرور ہے کہ "اتفاق میں برکت ہے" مگر وہ دشمنوں کے خلاف اتّفاق ہوتا ہے۔ یہ تو آپ کے اپنے بھائی جان ہیں"۔ "مگر یہ ہیں تو ہمارے دشمن ہی۔ روزانہ مارتے ہیں روزانہ تنگ کرتے ہیں"۔

"نہیں بیٹا! اتفاق میں برکت کا وہ مطلب نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ بھائی جان تو پھر بھائی جان ہیں۔ کہ آپ کا اپنا خون ہے۔ آپ سب مسلمان ہیں کہ نہیں؟"

"ہاں ہیں تو اور آپ سب بھائی بہن ہیں کہ نہیں۔ لوگ آپ کو الگ الگ امی، پاپا کے بچّے کہتے ہیں، مگر آپ سب اتفاق سے رہتے ہیں تو انہیں دھوکا ہوتا ہے کہ کون کس کا سگا بھائی ہے اور کون کس کا بھائی ہے۔ لوگ بالکل اندازہ نہیں کر پاتے حالانکہ سب کی شکلیں کتنی الگ الگ ہیں۔ تو بھائی جان بھی آپ کے بھائی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ذرا شریر ہیں مگر محبت تو وہ آپ سے کرتے ہیں۔ بھائی جان کو بھی چاہیے کہ وہ چھوٹوں سے عزّت سے پیش آئیں۔ تاکہ بچّے اُن کی عزّت کریں۔ اور آپ بچّوں کو بھی چاہیے کہ اپنے بھائی جان کی پٹائی نہ کریں بلکہ دُشمن کے خلاف یہ اتحاد کریں تو زیادہ بہتر ہے" اور پھر وہ دن اور آج کا دن نہ بھائی نے ہمیں چڑیا گھر کے جانوروں میں تبدیل کیا اور نہ ہی ہم نے مل کر مارا اور ہمیں احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنی جلدی دِن گزرے اور ہم بڑے بڑے ہو گئے۔ اب جب بچپن کی باتیں یاد آتی ہیں تو سب مل کر ہنستے ہیں۔ کہ اتفاق میں برکت کا ہم نے کتنا غلط مطلب لیا تھا۔ اتفاق یا اتحاد کوئی اپنوں کے خلاف تھوڑی ہوتا ہے۔ یہ تو اُن کے خلاف ہوتا ہے۔ جو آپ کا دشمن ہے۔ جو آپ کے ملک کا دشمن ہے۔

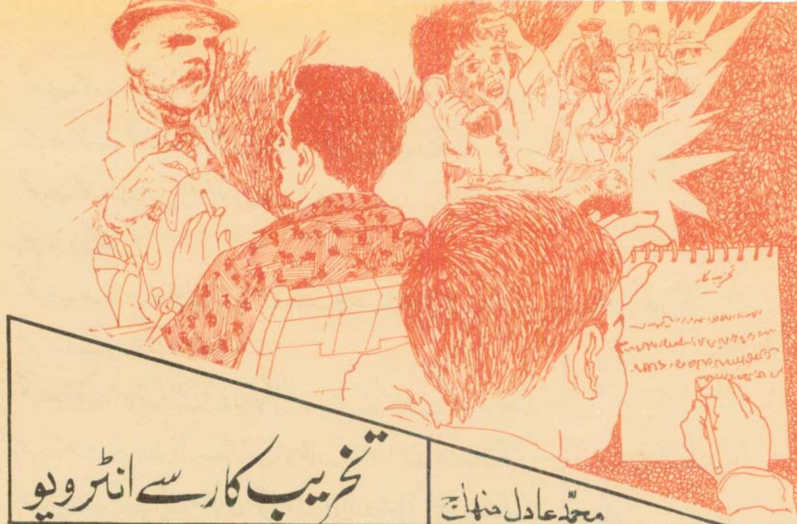

تخریب کار سے انٹرویو

محمّد عادل منہاج

آپ نے کھلاڑیوں، فنکاروں، سیاستدانوں وغیرہ کے انٹرویو تو پڑھے ہوں گے لیکن شاید کسی تخریب کار کا انٹرویو کبھی نہیں پڑھا ہوگا۔ پچھلے دنوں اتفاق سے ہماری ملاقات ایک تخریب کار شخصیت سے ہوگئی۔ ہم نے اُن سے انٹرویو کے لیے ملاقات کا وقت مانگا۔ بڑی مشکل سے تیار ہوئے۔ روزِ مقررہ ہم اُن کے پاس پہنچے اور جو گفتگو ہوئی من وعن آپ کے مطالعے کے لیے پیشِ خدمت ہے۔

ہم :۔ "السلام علیکم"

تخریب کار :۔ (پستول نکالتے ہوئے) "خبردار! جو بھاگنے کی کوشش کی۔"

ہم :۔ (گھبرا کر) "گک... کیا مطلب! ہم تو آپ کا انٹرویو کرنے آئے ہیں۔"

تخریب کار :۔ (چونک کر پستول جیب میں رکھتے ہوئے) "اوہ! ہاں، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ (مسکراتے ہوئے) ہمیں کافی چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ خیر بیٹھو۔"

ہم :۔ "آپ کا نام؟"

تخریب کار :۔ (گھورتے ہوئے) "تخریب کار۔"

ہم :۔ "تاریخِ پیدائش؟"

تخریب کار :۔ پیدا تو بہت پہلے ہو گیا تھا لیکن تخریب کار کی حیثیت سے اُس وقت جنم لیا جب افغانستان میں روسی فوجیں داخل ہوئیں۔

ہم :۔ آپ کے مشاغل؟

تخریب کار:۔ تباہی و بربادی پھیلانا، قتل و غارت گری کرنا وغیرہ وغیرہ۔
ہم:۔ بڑے خوفناک مشاغل ہیں خیر! آپ کی پسندیدہ جگہ؟
تخریب کار:۔ جہاں پُرامن لوگوں کی بُہتات ہو۔
ہم:۔ وہ کیوں؟
تخریب کار:۔ (سفاکانہ لہجے میں) اس لیے کہ تخریب کاری وہیں ہوتی ہے جہاں امن وسکون ہو۔
ہم:۔ آپ کی زندگی کا مقصد؟
تخریب کار:۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر انہیں تباہی کے کنارے تک پہنچانا۔
ہم:۔ (آہستہ سے) اللہ نہ کرے کہ آپ کا مقصد پورا ہو۔ (بلند آواز سے) خوشی کس وقت محسوس کرتے ہیں؟
تخریب کار:۔ جب ایک مسلمان قتل ہوتا ہے اور دوسرا آنکھیں بند کیے کھڑا رہتا ہے۔
ہم:۔ رونا کس وقت آتا ہے؟
تخریب کار:۔ جب مسلمان یہ کہنے لگتے ہیں کہ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
ہم:۔ غصّہ کس وقت آتا ہے؟
تخریب کار:۔ جب بم کے دھماکے کے زخمیوں کو خون دینے کے لیے اسپتال میں لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔
ہم:۔ اگر آپ کا ایک لاکھ کا بانڈ نکل آئے تو؟
تخریب کار:۔ میں لینے سے انکار کر دوں گا۔ میرے مالی حالات بہت اچھے ہو گئے ہیں۔
ہم:۔ کس قسم کے لوگ اچھے لگتے ہیں؟
تخریب کار:۔ جو چند پیسوں کے عوض ملک کی جڑیں کاٹنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔
ہم:۔ کس قسم کے لوگوں سے نفرت ہے؟
تخریب کار:۔ بیوقوفوں سے۔
ہم:۔ بیوقوف کی آپ کے نزدیک تعریف؟
تخریب کار:۔ جو اپنے ملک اور عوام سے بے لوث محبت کرتا ہو۔
ہم:۔ آپ کا بہترین دوست؟
تخریب کار:۔ پولیس۔
ہم:۔ کوئی ایسی خواہش جو پوری نہ ہوئی ہو؟

تخریب کار :۔ سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ لوگ ہمارے خوف سے اپنے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیں۔

ہم :۔ تین الفاظ میں اپنے گھر کی تعریف کریں ؟

تخریب کار :۔ کون سا گھر ؟

ہم :۔ عزّت، شہرت اور دولت میں آپ کا انتخاب !

تخریب کار :۔ دہشت۔

ہم :۔ آپ کی زندگی کا یادگار لمحہ ؟

تخریب کار :۔ جب ہم نے کراچی میں بھائی کو بھائی سے لڑوا دیا۔

ہم :۔ وہ لمحہ جب آپ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تخریب کار :۔ صرف اُس وقت جب مسلمان اپنی غلطیوں پر نادم ہو کر اپنے اللہ سے معافی مانگتے ہیں اور آنسو بہاتے ہیں۔

ہم :۔ آپ کس قسم کے خواب دیکھتے ہیں۔

تخریب کار :۔ کسی پنجابی فلم میں ولن بن گیا ہوں۔

ہم :۔ کوئی ایسی شخصیت جس سے آپ متاثر ہوئے ہوں ؟

تخریب کار :۔ چنگیز خان سے جس نے بغداد کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔

ہم :۔ کوئی ایسا واقعہ جس پر آپ کو پچھتاوا ہوا ہو ؟

تخریب کار :۔ پچھتاوا ؟ یہ لفظ میں نے پہلی بار سُنا ہے۔

ہم :۔ اگر دوبارہ زندگی ملے تو کیا بننا پسند کریں گے ؟

تخریب کار :۔ (سوچتے ہوئے) ایٹم بم۔

ہم :۔ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں ؟

تخریب کار :۔ مطمئن ہوتا تو تخریب کار کیوں بنتا۔

ہم :۔ آخر میں کوئی پیغام ؟

تخریب کار :۔ پاکستانیوں کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر اعتبار نہ کریں۔ آپس میں متحد نہ ہوں۔ ہر وقت اپنا حق مانگیں اور اپنا فرض بالکل نہ ادا کریں۔ اور شور مچائیں کہ فلاں میرا حق مار رہا ہے۔ چاہے کوئی بھی ان کا حق نہ مار رہا ہو۔ آپس میں گتھم گتھا رہیں۔ شکریہ !

بانا یخ کا قصّہ

دانت اکھاڑ لینے والی بلغاری ڈِش کا دلچسپ قصّہ

وفا علاؤالدّین

موسم گرما کی طویل چھٹیاں ہمارے سامنے تھیں۔ انہی چھٹیوں کے دوران اتفاقاً ہم آپی کی لائبریری میں چلے گئے۔ ہمارے معاملات میں اتّفاقات بہت دخل اندازی کرتے ہیں۔ یہ بھی اتّفاق ہی تھا کہ ہماری آپی چھٹیاں گزارنے خالہ جان کے ہاں حیدر آباد گئی ہوئی تھیں ورنہ اُن کے ہوتے کسی کی مجال نہ تھی کہ لائبریری کے پاس سے گزُر جائے۔ یک لخت ہماری نظر ایک الماری کی چھت پر جَم گئی، ہم دوڑ کر اس تک پہنچے اور جھٹ الماری کھولی۔ مارے خوشی کے، ہماری چیخ نکل گئی: "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں" بس ہمیں اپنی چھٹیاں گزُارنے کا نسخہ مل چُکا تھا۔ یہ آپی کی مختلف کھانے پکانے کی ترکیبوں کی کتابیں تھیں۔ آپی ہر ہفتے نئی ڈشیں تیار کرتی تھیں اور سب سے داد وصول کرتی تھیں۔ ہمیں کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کھانا

پکانے کی نت نئی ترکیبیں کہاں سے حاصل کرتی ہیں، مگر آج یہ راز کھُل چکا تھا۔ ہم نے سوچا کیوں نہ خود پر چسپاں۔ بدسلیقہ، پھوہڑ اور احمق کے لیبل ہٹائے جائیں اور ساری چھٹیاں گھر والوں کو اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلانے میں گزاری جائیں۔

دوسرے ہی لمحے ہم کچن میں تھے۔ امی اپنے کسی رشتے دار کا حال احوال پوچھنے اور ابّو دفتر گئے ہوئے تھے۔ بھیا سو رہے تھے۔ یعنی ہم باورچی خانے کو تجربہ گاہ بنانے میں پوری طرح سے آزاد تھے۔ بلغاریہ کی مشہور اور پسندیدہ ڈش "بانا بانغ تاشا" کی شامت ہمارے ہاتھوں آگئی۔ ہم نے ڈش بنانا شروع کر دی۔ اس ڈش کا مرکزی رول گوند کو ادا کرنا تھا۔ آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد لذیذ اور مزیدار ڈش "بانا بانغ تاشا" تیار تھی۔ ہم نے اُسے پلیٹ میں سجایا اور چمچہ ہاتھ میں لے کر باہر برآمدے میں آگئے۔ ہمارے منہ میں پانی آرہا تھا شکل کچھ کچھ ہمارے یہاں جس طرح جیلی تیار ہوتی ہے اس سے ملتی جلتی تھی۔ ابھی بسم اللہ کرنا چاہ رہے تھے کہ بیل کی زور دار آواز نے ہمیں دہلا دیا۔ چمچہ ہمارے ہاتھ سے نکل کر دُور جا گرا۔ ہم سمجھے امی آگئی ہیں جلدی سے پلیٹ کو میز کے نیچے رکھا اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکے جس پر اب ٹکنے بازی شروع ہو چکی تھی۔ جو نہی دروازہ کھُلا۔

ایک زبردست قسم کا ٹکّہ ہمارے چہرے پر پڑا۔ دن میں تارے نظر آگئے۔ یہ ہماری پڑوسن تھیں، امی کی گہری دوست۔ ٹکّے کی معذرت کئے بغیر وہ اندر داخل ہو گئیں۔ اور میز کے قریب پہنچ گئیں۔

"آہا... ہا... ہا کتنی مزیدار خوشبو آرہی ہے... اللہ... کیا بنا یا ہے تم نے... ارے ہاں... یہ خوشبو تو ہماری پسندیدہ ڈش کی ہے... وہ... وہ... کیا نام تھا..." وہ صاحبہ یادداشت کے لوٹے پھوٹے، زنگ لگے ڈبّے میں جھانکنے لگیں۔ مگر وہ سارا دن بھی ڈھونڈتی رہتیں تب بھی اُنہیں یاد نہ آتا... ہم نے جھٹ عادت کے مطابق کہا" بلغاریہ کی مشہور ڈش "بانا بانغ تاشا"

"ہاں یاد آیا" تاگا بان تماشا" کیا مزیدار ڈش ہے"!

پھر وہ سوں سوں کرتی جھکیں اور دوسرے ہی لمحے ان کے ہاتھ میں ہماری پلیٹ تھی "آہا... یہ رہی پلیٹ" اور پھر انہوں نے جلدی جلدی کھانا شروع کر دیا۔ اُس کے بعد جو اُن کی حالت ہوئی بس نہ پوچھیے۔ آنکھوں سے بُری طرح پانی بہہ رہا تھا کچھ بولنا چاہ رہی تھیں مگر بول نہیں پا رہی تھیں۔ ایک ہاتھ میں ہماری پلیٹ تھی، دوسرا ہاتھ منہ میں تھا۔ مسلسل غاں... غاں... غوں... کر رہی تھیں۔ ہم نے سوچا ان کی مدد کرنی چاہیے بڑھ کر پلیٹ لینا چاہا تو انہوں نے ایک ہاتھ سے ہمیں پیچھے دھکیل دیا، نہ جانے وہ کیا سمجھیں۔ ہمیں بھی

غصّہ آگیا ہم بانا بانغ تاشا کی پلیٹ پر جھپٹے زور لگایا اُدھر اُنہوں نے اِدھر ہم نے پلیٹ کھینچی۔ اس کھینچا تانی میں پلاسٹک کی پُرانی پلیٹ کا ایک حصّہ لے کر ایک طرف ہم دھڑام سے گرے اور دوسری طرف وہ...
اب جو ہم نے اُٹھ کر اُن کی طرف غور سے دیکھا تو بلغاریہ کی مشہور ڈش بانا بانغ تاشا اُن کے ہاتھوں اور چہرے پر بِکھری ہوئی تھی۔ اور اس حالت میں وہ کوئی بلغاری خاتون نظر آرہی تھیں۔ اُن کا ہاتھ اب تک منہ میں تھا۔ ہم سمجھے کہ ڈش بہت پسند آئی ہے جو ابھی تک ہاتھ چاٹ رہی ہیں، لیکن تھوڑی دیر میں پتا چلا کہ وہ کسی تکلیف میں ہیں۔ ابھی ہم ان کی تکلیف کی نوعیت پر غور کر ہی رہے تھے۔ کہ تڑاخ کی آواز کے ساتھ ان کا ہاتھ باہر آگیا اور ہماری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اُن کے ہاتھ پر دو ٹوٹے ہوئے دانت تھے۔ یہ بانا بانغ تاشا کا کمال تھا۔

اُن پر تو جو گزری سو گزری اس کے بعد ہم پر جو گزری اس کا حال نہ ہی پوچھیے تو بہتر ہے۔ مختصر یہ کہ اب وہ ہماری شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔ بلغاریہ کی ڈشوں سے تو انھیں نفرت ہو چکی ہے اور جو ایک آدھ رشتے دار جوان کے بلغاریہ میں ہیں، اُنھوں نے اُن سے بھی ناتا توڑ لیا ہے۔ واقعی... ہاں ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ واپسی پر امّی نے ہماری خوب خبر لی کیونکہ ہم نے آدھی کلو گوند ضائع کر دی تھی۔

اصل میں بانا بانغ تاشا بنانے کی ترکیب تو ٹھیک تھی۔ بس ہم نے پاؤ کی جگہ آدھی کلو گوند ڈال دی تھی۔ جو پڑوسن کے کمزور دانتوں سے اس طرح لپٹ گئی تھی جیسے فلموں میں بچھڑے ہوئے بچے ماؤں سے لپٹ جاتے ہیں۔ ہاں اس تجربے کا یہ فائدہ ضرور ہُوا کہ ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ آخر ہمیں گھر والوں کی طرف سے ہمیشہ پھوہڑ بے سلیقہ اور احمق کا خطاب کیوں دیا جاتا تھا۔

ج

۱۰۴ر صفحات پر مشتمل

راہنما

سچّی قرآنی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ

قرآن کی یہ سچّی کہانیاں بچوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں

اس کے حصول کے لیے ۱۰ر روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجیے

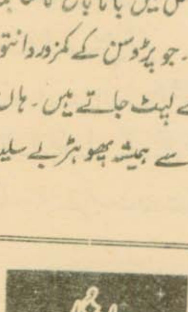

ماموں لیموں

طارق محمود میاں

جب کسی سے لڑائی ہوتی تو وہ
پیٹنج کر آنکھوں میں لیموں نچوڑ دیتے۔

ماموں لیموں کو ہم نے ماموں لیموں کیوں کہنا شروع کیا۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ویسے کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا تھا کہ کوئی معقول شخص ہوش و حواس میں رہتے ہوئے خود کو لیموں کہلوانا کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ماموں اس نام کو نہ صرف برداشت کرتے تھے بلکہ پسند بھی فرماتے تھے۔

عمر میں وہ ہم سے بس یہی کوئی پانچ ساڑھے پانچ برس بڑے تھے۔ مگر حیرت ہے کہ وہ ہم سب چھوٹے بڑے لڑکوں کے ہم عمر لگتے تھے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے اُسی میں رنگ جاتے۔ بلکہ بیشتر اوقات تو یہ ہوتا کہ محفل ہی کو اپنے رنگ میں رنگ ڈالتے۔

ان کا رنگ لیموں کا رنگ تھا۔

لیموں اُن کی زندگی میں یوں رَچ بس گیا تھا کہ کبھی کبھی ہمیں یہ گمان ہوتا کہ اگلے سیزن میں ماموں کے سر میں سے ہری بھری شاخیں نکل آئیں گی اور ان پر درجنوں لیموں لٹک جائیں گے۔ ہر موسم اور ہر موقع پر لیموں کا ناوقت استعمال اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بقول ان کے دنیا کے تمام مسائل کا حل لیموں میں موجود تھا۔ کیونکہ خود دنیا کی شکل بھی لیموں جیسی ہے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت کا وہ عملی مظاہرہ پیش کرنے سے کبھی نہ چُوکتے تھے۔

بزرگوں کا خضاب پھیل جاتا تو لیموں سے صاف کرتے۔ کسی بچے کے دانت پیلے ہوتے تو لیموں سے پالش کرکے چمکا دیتے۔ کپڑوں کے داغ دھبّے کسی سے صاف نہ ہوپاتے تو یہ لیموں کی مدد سے کر ڈالتے چہرے کی رنگت نکھارنے کے لیے خواتین کو بیوٹی بکس میں لیموں ہمہ وقت رکھنے کی تلقین کرتے۔ دعوتوں میں چاٹ کے اوپر ڈالتے۔ سوفٹ ڈرنکس میں نچوڑ نچوڑ کے پیش کرتے۔ تانبے اور پیتل کی سیاہ ہوتی ہوئی چیزوں کو لیموں مل کے چمکا ڈالتے۔ بلکہ ایک بار تو ایک بے چارہ مجمعے والا فٹ پاتھ کے کنارے مجمع لگائے گھڑیوں کی پھیکی پڑتی ہوئی چمک کو درست کر رہا تھا کہ انھوں نے اس کا راز کھول دیا۔ اور سب کو بتادیا کہ یہ تو لیموں لگاتا ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے اپنے گھروں میں جاکے خود ہی لگالیں اور گھڑیاں چمکالیں۔

اسکول کے زمانے میں ایک دفعہ سالانہ تقریب میں وہ بہت مقبول ہوئے۔ یہاں بھی انہوں نے لیموں کے کمالات پیش کیے تھے۔ ان کے سارے جادو تو یاد نہیں۔ البتہ چند ایک کچھ اس طرح تھے۔

انہوں نے رنگین پانی سے بھرے گلاس میں لیموں نچوڑا تو رنگ ایک دم سے غائب ہوگیا۔ صرف صاف و شفاف پانی باقی رَہ گیا۔

راکھ سے بھری ٹرے میں لیموں کے چند قطرے ٹپکائے تو پہلے تو راکھ میں سے کچھ بُلبلے سے اُٹھے اور پھر دھوئیں کے مرغولوں سے سارا کمرہ بھر گیا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی جس میں لیموں کا رس بھرا تھا۔ اس رس سے انہوں نے بالکل نئے نکور صاف ستھرے قلم کی مدد سے ایک سفید کاغذ پر کچھ لکھا اور پھر سارے حاضرین میں اس کاغذ کو گھمایا۔ سب نے دیکھا کہ اس پر لکھا ہُوا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ماموں نے ایک موم بتی جلائی اور بڑی احتیاط سے اس کی لَو پر کاغذ کو گرم کرنا شروع کیا۔ جُوں جُوں وہ گرم ہوتا گیا توں توں گہرے براؤن رنگ کی تحریر اُبھر کے صاف واضح ہوتی چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں سب کچھ پڑھا جانے لگا۔ تمام

حاضرین بہت حیران ہوئے۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اس پر ماموں نے لیموں کی رَس بھری کئی ایک چھوٹی چھوٹی شیشیاں نکالیں۔ اور لڑکوں میں تقسیم کر دیں کہ گھر جا کے خود ہی کمال کریں اور خفیہ خطوط لکھیں۔ ہم نے کر کے دیکھا تو بالکل ایسے ہی ہُوا۔ اس پر ہم ماموں کے اور بھی گرویدہ ہو گئے۔

لیموں ماموں کا پسندیدہ ہتھیار بھی تھا۔ ایک دفعہ اسکول کے ایک غنڈے کے ساتھ ماموں کی لڑائی ہو گئی انہوں نے پہلے تو دُور ہی دُور سے اُس کے کانوں پر تاک تاک کے لیموؤں کے نشانے لگائے اور پھر آناً فاناً اُسے نیچے گرا کے اُس کی آنکھوں میں لیموں نچوڑ دیا۔ اس پر وہ بے چارہ اتنا تڑپا کہ ہمیشہ کے لیے غنڈہ گردی سے باز آگیا۔

لڑائی کے ذکر سے یاد آگیا کہ ماموں کی چُستی اور پھُرتی کے بارے میں بھی بتاتے چلیں۔ وہ لڑاکا ہر گز نہ تھے۔ مگر طرّار غضب کے تھے۔ اتنے کہ ایک بار لوگ کسی چور کو مار رہے تھے، ماموں نے دیکھا تو آتے ہی پہلے اُس کی آنکھوں میں لیموں نچوڑا پھر جُوتا اُتار کے اُس کی پٹائی کی۔ پھر کہیں بہت دیر بعد جا کے ہم سے آہستہ سے پوچھا، "بات کیا تھی ؟"

لیموں کا ایک فائدہ ماموں یہ بھی بتاتے تھے کہ یہ دُنیا کا سب سے فرحت بخش مشروب یعنی سکنجبین، سب سے خوش ذائقہ سالن یعنی اچار، انواع واقسام کی بیماریوں کی زود اثر دوا اور اس کے علاوہ نہ جانے کیا کیا کچھ ہے لیکن یہ اتنا سب کچھ قدرت نے ایک چھوٹی سی پنگ پانگ کی گیند کے اندر اس طرح اسٹور کیا ہُوا ہے کہ آپ اسے آسانی سے جیب میں ڈال کے گھوم پھر سکتے ہیں۔ اس کا ڈھکن آپ ہی کھلنے کا ڈر نہیں ہوتا۔

سکنجبین کے وہ اتنے رَسیا تھے کہ اس کے مقابلے میں دیگر تمام مشروبات کے خلاف جہاد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ انواع واقسام کے مشروبات کے اشتہارات ٹی وی پر دیکھ کے ایک بار تو اُن کا ارادہ ہُوا کہ گھونسا مار کے اسکرین توڑ دیں۔ بلکہ غضبناک ہو کے انہوں نے گھونسا تان بھی لیا اور نعرہ مار کے جھارا پہلوان کے سے جوش وخروش سے ٹی وی پر حملہ آور بھی ہونے لگے مگر پھر اچانک رُک گئے اور گھونسے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کے بولے "یہ گھونسا ٹی وی اسکرین سے زیادہ قیمتی ہے... کیونکہ لیموں ہم اسی سے نچوڑتے ہیں"۔

انہیں لیموں کی عزّت اور توقیر حد سے کہیں زیادہ پیاری تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ لیموں کا دوست اُن کا دوست اور لیموں کا دُشمن اُن کا دُشمن ہے۔ وہ اس دسترخوان تک سے اُٹھ جاتے جہاں لیموں موجود نہ ہوتا۔ اس ریسٹورنٹ میں پھر کبھی نہ جاتے جہاں سلاد کے ساتھ لیموں نہ رکھا ہوتا یا جہاں طعام کے بعد گرم پانی میں لیمن کی کاشیں پیش نہ کی جاتیں۔ کہتے یہ بدذوقوں کا ریسٹورنٹ ہے۔ وہ اس فریج تک سے نفرت کرتے تھے جس میں دیگر سبزیوں اور پھلوں کے ساتھ لیموں نہ سجا ہوتا۔

ایک مرتبہ بحث چھڑ گئی۔ ایک صاحب سیب کے دلدادہ تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ مشہور انگریزی مقولے کی رُو سے روزانہ ایک سیب کھانے والا شخص ڈاکٹروں سے ہمیشہ بچا رہتا ہے۔ ماموں اس بات سے ہرگز متفق نہ تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ڈاکٹروں سے بچنے کا واحد طریقہ بس یہ ہے کہ آدمی ڈاکٹروں کے بجائے ڈاکٹرنیوں سے علاج کرانے لگے۔ ہاں البتہ بیمار ہونے کے بعد لیموں کے استعمال سے افاقہ جلد ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے درجنوں بیماریوں کے لیموں کی مدد سے سینکڑوں علاج گنا گنا کے ساری محفل کو زِچ کر دیا۔

ہم ماموں کے چہیتے دوستوں میں سے تھے۔ لیکن ایک بار انہوں نے ہمارے اعتماد کو بڑی ٹھیس پہنچائی۔ ہم سے کہنے لگے "آج تمہیں لیموں کا ایک ایسا راز بتاتا ہوں جو میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا۔"

ہمیں بڑی دلچسپی پیدا ہوئی۔ پوچھا کہ کیا راز ہے؟

بولے "اپنے آنسوؤں میں لیموں کا رس ملا کے دیا سلائی کی مصالحے والی سائیڈ سے دیوار پر لکھو گے تو رات کو وہ تحریر جگنو کی طرح چمکے گی۔"

یہ واقعہ اب ہم آپ کو ذرا تفصیل سے بتاتے ہیں۔

ہمارا اشتیاق شام تک بے حد بڑھ چکا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اپنے آنسو کیسے جمع کیے جائیں۔ آنسوؤں کے لیے تو رونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ یونہی جھوٹ مُوٹ کا نہیں بلکہ اصلی رونا رونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھُوٹ پھُوٹ کے رونا پڑتا ہے۔ اور پھُوٹ پھُوٹ کے آدمی یونہی خوشی خوشی تو نہیں رو سکتا۔ گویا عجیب مصیبت تھی۔ اس مسئلے کا حل ہماری سمجھ سے باہر ہوتا جا رہا تھا کہ اچانک ایک ترکیب ہماری سمجھ میں آگئی۔ اُس وقت تو اُس ترکیب پر ہم بہت خوش ہوئے تھے مگر بعد میں بڑا شرمندہ ہوئے۔

ہم نے ایسا کیا کہ چُپکے سے باورچی خانے میں گئے اور ایک دراز میں سے جہاں امّی چھوٹا موٹا سودا سلف منگوانے کے لیے پیسے رکھا کرتی تھیں، ساڑھے تین روپے چُرا لیے۔ پڑوس میں کھلونوں کی ایک دکان تھی۔ وہاں سے ہم نے بھیانک سی آواز پیدا کرنے والا ایک باجا خریدا۔ اُس میں پھُونک مارنے سے پھٹی ہوئی بانسری جیسی آواز نکلتی تھی۔ بہت ہی بھدّی، اُونچی اور بے سُری۔

ہم نے سوچا کہ گھر جاکے اُسے بجائیں گے۔ تو رونے کی دو صورتیں نکل سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ امّی پوچھیں گی کہاں سے لیا ہے؟ پیسے کہاں سے آئے؟ اور پھر ماریں گی۔

دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ بھدّی آواز سے ابّو ڈسٹرب ہوتے اور مارتے۔

دونوں ہی صورتوں میں آنسو نکلتے اور ہم خوشی خوشی انہیں فوراً اس چھوٹی سی پیالی میں جمع کر لیتے جس

میں ماموں لیموں کے نسخے کے مطابق ہم نے پہلے ہی لیموں کا رس ڈال لیا تھا، لیکن ہُوا یہ کہ جونہی ہم نے گھر میں داخل ہو کے باجا بجانا شروع کیا۔ ہمارا چھوٹا بھائی اُسے دیکھتے ہی مچل گیا اور انتہائی بلند آواز سے رونے لگا۔ اس کے حلق میں جو باجا بج رہا تھا۔ اس کے سامنے ہمارے باجے کی آواز ماند پڑ گئی۔ اس پر امی نے بڑے پیار سے ہم سے باجا لیا اور ہمارے چھوٹے بھائی کے حوالے کر دیا۔ ہم سے پوچھا ہی نہیں کہ کہاں سے آیا اور کہاں سے لیا۔ اُلٹا امی اور ابو مسرور ہوئے کہ چلو چھوٹے بھائی کے چُپ ہونے کا سامان پیدا ہو گیا۔

ہماری ساری اسکیم فیل ہو گئی۔

اب سوچنے لگے کہ رونے کی صورت کیسے نکالی جائے۔ کبھی کانچ کا گلدان اور کبھی شیشے کا گلاس توڑنے کا خیال آیا۔ تو کبھی کوئی بدتمیزی کرنے کی سُوجھی، مگر دونوں باتوں میں نقصان تھا۔ پہلی میں پیسوں کا دوسری میں اخلاق کا ... پھر کیا کیا جائے۔ سوچتے سوچتے ہم نے دو چار بار رونے کی ایکٹنگ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اگرچہ پتا تھا کہ اداکار آنکھوں میں گلیسرین ڈال کے روتے ہیں۔ اُن کے آنسو اصلی نہیں ہوتے، لیکن یہ بھی سُنا تھا کہ بڑے اداکار نقلی آنسوؤں کے قائل نہیں ہوتے وہ اصلی آنسو بہاتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے بڑا اداکار بننے کے لیے بڑے جتن کیے۔ بڑے بڑے خوفناک اور المناک مناظر سوچ سوچ کے رونے کا مُوڈ طاری کرنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ حالانکہ جب ہم چھوٹے تھے تو جھُوٹ مُوٹ رو کے امّی اور ابّو سے سینکڑوں باتیں منوالیا کرتے تھے۔ ایسا ہی کمال کچھ دیر پہلے ہمارا چھوٹا بھائی بھی دکھا چکا تھا۔ مگر ہم سے اب ایسا نہیں ہو پا رہا تھا۔ عجیب مشکل تھی۔

ابھی ہم اس اُدھیڑ بُن میں مصروف تھے کہ ابّو کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ غضبناک انداز میں وہاں سے برآمد ہوئے اور آتے ہی انہوں نے ایک زنّاٹے دار تھپّڑ ہمارے داہنے گال پر رسید کر دیا۔ تھپّڑ اتنا شدید تھا کہ اُس کا زناٹا ہمیں بائیں گال پر بھی محسوس ہُوا۔

"آپ سے ہزار بار کہا ہے کہ میرا قیمتی پین مت لیا کرو اور اُسے میرے بیڈ پر کھُلا مت چھوڑا کرو... مگر آپ نے تو کہنا نہ ماننے کی گویا قسم کھا رکھی ہے... بے ہودہ... نالائق..."

ابّو بہت غصّے میں تھے۔ وہ کمرے میں جانے کے لیے مُڑے تو ہم نے دیکھا کہ اُن کی قمیض کی پُشت پر روشنائی کا ایک بڑا سا دھبّہ پھیل چکا تھا۔ اور غالباً پین کی نب بھی اُن کی کمر میں کافی شدّت سے چُبھی تھی۔

چند لمحوں کے سناٹے کے بعد اچانک ہمارے حلق سے آہ و فغاں کا ایک بھیانک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ وہی بارش جس کے ہم بڑی شدّت سے متمنّی تھے۔

لیکن یہ کیسی بارش تھی جو تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ دراصل ہمیں بلاقصور مار پڑ گئی تھی۔ ہم نے تو ابّو کے پین کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ یہ ضرور ہمارے چھوٹے بھائی کی حرکت تھی۔ جبھی تو وہ دُور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اور ہمارا باجا بھی بجا رہا تھا۔

بہرحال ہم نے جُوں توں کر کے حواس کچھ بحال کیے اور ایک کونے میں گھُس کے اپنے آنسوؤں سے لیموں کے رس والی آدھی پیالی بھَر لی۔ اس کے لیے ہمیں زیادہ محنت نہ کرنا پڑی۔ بُس پیالی کو کبھی ایک آنکھ کے نیچے رکھتے اور کبھی دوسری کے۔ آنسو بعد میں بھی بڑی دیر تک چالُو رہے۔ بلاقصور مار پڑنے پر تھپڑ کے درد کے ساتھ ساتھ اپنی بے چارگی اور معصومیت پر بھی رونا آ رہا تھا۔ اُسی دوران ایک بار ہم نے دلاسے کے لیے امّی کو بھی آواز دی مگر وہ غصّے سے بولیں۔۔۔ "اور کرو بدتمیزیاں" اس پر ہمیں اور بھی رونا آنے لگا۔ پہلے مسئلہ یہ تھا کہ روئیں کیسے اور اب یہ مصیبت کہ چُپ کیسے ہوں؟ دیر تک ہماری ہچکی بندھی رہی، پھر ہم نے سوچا کہ شاید اللہ میاں نے یہ ہمیں پیسے چُرانے کی سزا دی ہے۔ یوں بڑی دیر کے بعد ہم چُپ ہوئے۔

چُپ ہونے کے بعد ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک دیاسلائی لی اور اس کی مصالحے والی سائیڈ کو لیموں اور آنسوؤں کے مکسچر میں ڈبو کے اپنا نام برآمدے کے چاروں ستونوں پر خوشخط لکھا۔ پھر ایک نمایاں جگہ پر بڑا بڑا کر کے لکھا "پاکستان زندہ باد" تاکہ اندھیرا ہونے پر یہ چیز جگنو کی طرح سب سے زیادہ روشن ہو اور لوگ حیران رہ جائیں۔

لیکن افسوس کہ ایسا کچھ بھی نہ ہُوا۔ ہم دیر تک اندھیرا ہونے کے منتظر رہے۔ رات ہو گئی تو روشنی بُجھا بُجھا کے اور رات کو بستر سے اُٹھ اُٹھ کے ہم نے باہر آ کے دیکھا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

ہمیں اپنی ساری محنت اکارت جانے پر بڑا دُکھ ہُوا۔ اگلی صبح اسکول میں ہم نے ماموں لیموں سے بات تک نہیں کی۔ وہ دن بھر ہمارے اِردگِرد پھرتے رہے مگر ہمارا بُلانے کو دل ہی نہیں چاہا۔

شام کو وہ ہمارے گھر آئے اور بولے۔۔۔ "آخر بات کیا ہے۔۔۔؟"

اب چونکہ وہ گھر پر آئے تھے لہٰذا اخلاقاً ہم نے بھی بات کر لی۔ اور ساری تفصیل بتائی۔ وہ بڑی دیر تک سنجیدگی سے غور کرتے رہے پھر بولے۔

"تم نے آنسوؤں میں لیموں نچوڑا تھا یا لیموں میں آنسو بہائے تھے؟"

ہم نے کہا "پہلے پیالی میں لیموں کا رس ڈالا تھا۔ پھر اس میں آنسو ڈالے تھے"

"بس یہی غلطی ہو گئی" ماموں جھک کے بولے "میں نے تم سے آنسوؤں میں لیموں ڈالنے کے لیے کہا تھا تم نے لیموں میں آنسو ڈال دیے۔"

ڈاکٹر ویکسین سے ملاقات

آپ یقیناً ڈاکٹر ویکسین سے واقف ہوں گے۔ ارے بھئی یہ ہمارے علاقے کی معروف ترین شخصیت ہیں ان کا اصل نام تو کچھ اور ہے۔ مگر سب انہیں ڈاکٹر ویکسین کہتے ہیں یہ نام کیسے پڑا۔ اُس کی وجہ کچھ یوں بیان کی جاتی ہے۔ کہ ایک مرتبہ وہ اپنی گاڑی میں اپنے اسپتال جا رہے تھے تو ایک کتے پر نظر پڑی بجلی کی تیزی سے ایک خیال ان کے ذہن میں کوندا کہ کتے کے کاٹنے پر خواہ مخواہ بیچارے آدمی کو انجکشن لگاتے ہیں۔ کیوں نہ کتے ہی کو چودہ انجکشن لگا دیئے جائیں۔ مسئلہ ہی حل ہو جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے کتے کو پکڑ کر انجکشن لگا دیا۔ اگلے دِن وہ دوسرا ٹیکہ لگانے کے لئے کتے کو ڈھونڈتے پھرے جب نہیں ملا تو پیشانی پر ہاتھ مار کر پشیمانی سے کہنے لگے کہ "غلطی ہوگئی۔ مجھے کتے کو جانے نہیں دینا چاہیئے تھا۔ چودہ انجکشن پورے ہو جاتے پھر چھوڑ دیتا۔"

آپ نے بھی سنا ہوگا کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے لہٰذا جب ہماری شامت آئی۔ تو ہم آنکھوں میں درد لئے ڈاکٹر ویکسین کے اسپتال پہنچے جسے اسپتال کہنا اسپتال کا گویا مذاق اُڑانا تھا۔ ڈاکٹر کی میز برآمدے میں لگی تھی۔ برآمدے میں ہی مریضوں کے بیٹھنے کے لئے دری بچھی ہوئی تھی الیسالگ

رہا تھا کہ لوگ علاج کرانے نہیں آئے سعودی عرب کا ویزا لینے آئے ہوں۔ ہم نے تو کھڑے ہونے میں ہی عافیت جانی۔طویل انتظار کے بعد ڈاکٹر ویکسین بڑے جاہ و جلال سے آئے۔ ہماری باری آخر میں تھی۔ ہم نے سوچا چلو اچھا ہے۔اِن کا طریقۂ علاج بھی دیکھ لیں گے۔ کچھ نہیں تو بیٹھے بیٹھے معلومات ہی ہو جائے گی۔

پہلا مریض دری سے اُٹھ کھڑا ہوا۔اس کو بخار کی شکایت تھی۔ ڈاکٹر ویکسین نے اپنا بیگ کھولا اور چونک کر بولے "ارے تھرمامیٹر تو میں گھر بھول آیا" اتنے میں ان کی نظر کمرے کے تھرمامیٹر پر پڑی۔

"ارے تھرمامیٹر تو موجود ہے۔" انہوں نے چونک کر کہا اور لپک کر اُتار لیا۔

"مگر یہ تو کمرے کا تھرمامیٹر ہے۔" مریض نے بوکھلا کر کہا "ارے بے وقوف بھلا کمرے کو بھی کبھی بُخار ہوا ہے۔" ڈاکٹر ویکسین نے کہا۔مگر مریض نے تھرمامیٹر لگانے سے انکار کر دیا۔چنانچہ انہوں نے بیگ سے ایک عجیب سا آلہ نکالا۔

"یہ کیا ہے"؟ مریض نے بوکھلا کر پوچھا۔

"یہ اسٹیتھو اسکوپ ہے۔" ڈاکٹر ویکسین نے جواب دیا اور اسٹیتھو اسکوپ اس کے دل پر رکھ دی اگلا لمحہ سنسنی خیز تھا وہ بوکھلا کر اُٹھے۔

"کیا ہوا ؟" مریض نے گھبرا کر پوچھا۔

"تم..... تم تو مر چکے ہو؟ تمہارا تو دل ہی کام نہیں کر رہا" انہوں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"نہیں خدا کے واسطے ایسا مت کہئے ڈاکٹر صاحب"، مریض خوفزدہ ہو کر بولا "میرے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہو جائیں گے۔"

"لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے یہاں آنے میں دیر کر دی ہے۔اب کچھ نہیں ہو سکتا۔تمہارے دل کی دھڑکن اب بند ہو چکی ہے" ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔

"ڈاکٹر صاحب" ایک دوسرا مریض کھنکارا "اِن کے دل کی دھڑکن بند نہیں ہوئی آپ آلہ کانوں میں لگانا بھول گئے ہیں۔"

ڈاکٹر ویکسین نے جب غور کیا تو شاید انہیں احساس ہوا کہ دوسرا مریض ٹھیک کہہ رہا ہے۔پھر بھی انہوں نے ذرا سی بھی شرمندگی محسوس نہیں کی۔اسی اعتماد سے پریشان حال مریض سے بولے۔"میں تمہیں نئی زندگی کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

اگلے مریض کو بلڈ پریشر کی تکلیف تھی۔یہ سُن کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیگ سے آلہ نکالا "اوہو! اس کا

ہوا غائب ہوگیا۔ جس کو دبا کر ہوا بھری جاتی ہے“ انہوں نے کہا اور اس کا حل نکالنے کی ترکیب سوچنے لگے پھر اچانک وہ چونکے اور کمپونڈر کو آواز دی کہ بھاگ کر اپنی سائیکل کا پمپ لے آئے۔ کمپونڈر جس کا گھر شاید قریب ہی تھا۔ چند لمحوں بعد وہ سائیکل کا پمپ اُٹھا لایا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر ویکسین اس آلے کا تار پمپ میں گھسیڑتے مریض اُٹھ کر یہ جا وہ جا۔

ایک مریض نے بتایا کہ اس کے سارے جسم میں چھوٹے چھوٹے دانے نکل آئے ہیں۔ ڈاکٹر ویکسین نے معائنہ کیا اور مشورہ دیا کہ خوب گرم چیزیں استعمال کرو۔ مثلاً آم، انڈا وغیرہ اور ہو سکے تو دانوں کو کھجاتے رہا کرو ”ہائیں“ مریض اُچھل پڑا اور بے یقینی سے بولا۔ ”اس طرح کہیں دانے ٹھیک ہوں گے؟“ ”نہیں، اس طرح یہ دانے پھوڑوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ اور پھوڑوں کے لئے میرے پاس دوا ہے“ انہوں نے اطمینان سے کہا۔

دو مریضوں کا حشر دیکھ کر بقیہ مریض تو آہستہ آہستہ کھسک لئے یہاں تک کہ مطب میں کمپونڈر اور ڈاکٹر ویکسین کے علاوہ صرف ہیں باقی رہ گئے۔ کیا مرض ہے آپ کو“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”جی وہ میرے پیٹ میں تکلیف ہے“، ہم نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

”کوئی اور مرض؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی آپ اس کا علاج شروع کریں۔ بقیہ امراض خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔“ ہم نے آہستہ سے جواب دیا جو شاید انہوں نے سنا نہیں۔

اتنے میں کمپونڈر نے کسی مریض کے آنے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے بلوا لیا ”کہو بھئی کیا تکلیف ہے تمہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی دانت میں شدید درد ہے۔ آج دندان سازوں نے اپنے مطالبات کے لئے ہڑتال کر دی ہے کوئی گولی دے دیجئے درد سے مرا جا رہا ہوں۔“ مریض نے جواب دیا۔

ڈاکٹر ویکسین نے بیگ کھولا۔ پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولے! ”پلاس بھی نہیں ہے اس وقت۔“ پھر انہوں نے کمپونڈر کو آواز دے کر کہا ”بھاگ کر پلاس لے آنا۔“

”کیا۔ آ.... آپ پلاس مم.... میرے دانتوں کے لئے مم منگوا رہے ہیں؟“ مریض نے خوف سے ہکلا کر پوچھا۔

”آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ میں کئی مریضوں کو اس طرح ٹھیک کر چکا ہوں۔“ ڈاکٹر ویکسین نے تسلّی دی

"ڈاکٹر صاحب مجھے اجازت دیجئے" یہ کہہ کر مریض رفوچکر ہوگیا۔ وہ جس پھرتی سے بھاگا۔ اس سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے دانتوں کا درد بھول چکا ہے۔

ڈاکٹر ویکسین نے مریض کے بھاگنے کا کوئی اثر نہیں لیا۔ جیسے وہ اس کے عادی تھے۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں تو آپ کے پیٹ میں تکلیف ہے"

"جی ہاں" میں نے کہا۔

"بستر پر لیٹ جائیے" انہوں نے ہدایت کی۔

"کیا آپ میرا پیٹ چیر کر تو نہیں دیکھیں گے"

"فی الحال تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ضرورت پڑی تو آپریشن کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا" انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے کہا

"جی فرمایئے!" ان کے لہجہ میں ایک احمقانہ سکون تھا۔

"ڈاکٹر ذرا اپنے پیچھے تو دیکھئے کیا ہے؟"

ڈاکٹر ویکسین بوکھلا کر پیچھے دیکھنے لگے۔ میں نے اپنے جوتے سنبھالے اور گھر کی طرف دوڑ لیا۔

آکر استعمال کیجئے

ایک دفعہ مشہور امریکی مزاح نگار مارک ٹوئن نے اپنے ایک امیر دوست کے کتب خانے سے ایک کتاب منگوائی۔ ان کے دوست نے جواب میں لکھا "میری کوئی کتاب کتب خانے کے باہر نہیں جا سکتی، ہاں آپ کتب خانے میں آکر جتنا چاہیں، اسے استعمال کر سکتے ہیں" کچھ عرصے بعد اسی دوست نے باغ کی زمین ہموار کرنے کے لیے مارک ٹوئن سے رولر منگوایا۔ مارک ٹوئن نے اس دوست کا جواب حرف بہ حرف نقل کر دیا "ہمارے باغ سے رولر باہر نہیں جا سکتا، ہاں آپ ہمارے باغ میں آکر جتنا چاہیں، اسے استعمال کر سکتے ہیں"

جب بجلی چلی جاتی ہے

ساجد قمر

کیا یہ سچ نہیں کہ جب بجلی چلی جاتی ہے تو آپ کے گھر میں کچھ ایسی آوازیں بلند ہوتی ہیں !

"اے لو یہ موئی بجلی پھر چلی گئی۔"

"ایک تو اس بجلی نے بہت تنگ کیا ہے کوئی وقت ہی نہیں اس کے آنے جانے کا۔"

"امجد بیٹے ذرا پردہ ہٹا کر دیکھنا تو کیا سارے علاقے کی بجلی چلی گئی ہے" آپ کے ابا جان مخاطب ہوئے۔ آپ کھڑکی کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اس لئے پردہ ہٹا کر شیشے میں سے باہر جھانکا تو آپ کو ہر طرف اندھیرا نظر آیا۔

"ابّا جان ہر طرف اندھیرا ہے۔"

"بیٹا فون کر کے معلوم تو کرو یہ بجلی کب آئے گی۔" آپ کی امّی کی آواز آئی۔

"ہائے اللہ ابھی تو "نیلے ہاتھ" بھی آنے والا ہے۔" آپ کی باجی بولیں۔

اب اندھیرا اتنا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ لیکن آپ کو فون کرنے دوسرے کمرے میں جانا بھی ضروری ہے، اس لئے اُٹھے اور اندازے سے ٹٹول کر آگے بڑھے ہی تھے کہ کرسی سے ٹکرائے۔ خیر گرنے سے بچ گئے اور چہرہ ناہموار نہیں ہوا۔ آپ نے ہمّت کی اور آگے بڑھے مگر ابھی آپ چند ہی قدم گئے ہوں گے کہ آپ کے بھائی کی ٹانگ دیوارِ چین کی طرح راہ میں حائل ہوئی۔ اب اندھیرے میں آپ کو اپنی ٹانگ نظر نہیں آرہی پھر بھائی جان کی ٹانگ کیسے نظر آتی نتیجہ ظاہر ہے پہلی بار تو آپ صرف لڑکھڑائے۔ مگر اس بار دھڑام کی آواز سے پتا چلتا ہے کہ اس دفعہ آپ باقاعدہ گرے ہیں۔

اب گھر والے ہیں کہ آپ کو اندازے سے اُٹھانے اور دلاسہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "ہائے اللہ" "میرے لال کیا ہوا"، "بیٹا ٹھیک تو ہو"، کی آوازیں تو آپ تک پہنچ رہی ہیں۔ مگر اُن کے ہاتھ آپ کو اُٹھانے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ اوّل تو آپ تک پہنچے ہی نہیں اور جب پہنچے بھی تو غلط جگہ پر۔ یعنی بازوؤں کے بجائے ٹانگیں جکڑ لیں۔ اب ابّا جان نے اپنی دانست میں اُنہیں بازو خیال کیا اور اوپر کیا تاکہ آپ کھڑے ہو سکیں مگر آپ جو ہاتھ ٹیک کر اُٹھ رہے تھے۔ ایک بار پھر اپنے چہرے کا دفاع نہ کر سکے اور جو کسر پہلے کی زمین اور آپ کے چہرے کی ٹکّر میں رہ گئی تھی۔ وہ اب پوری ہوگئی اور اس دفعہ تو آپ کے دانت بھی ہل گئے۔

خیر آپ کسی نہ کسی طرح دوبارہ کھڑے ہو گئے۔ اب گھر والوں کو آپ پر رحم آ رہا ہے۔ اسی لئے تو وہ کہہ رہے ہیں کہ رہنے دو فون اور چپ چاپ بیٹھے رہو۔ خود ہی آجائے گی بجلی۔ مگر آپ یہ سوچ کر کہ "گرتے ہیں نوجوان ہی ......" اپنی مہم کے لئے دوبارہ تیار ہیں۔

شکر ہے کہ آپ مزید کسی حادثہ سے دوچار ہوئے بغیر ٹیلی فون تک پہنچ گئے۔ اسی وقت باجی کی آواز آئی "امجد! موم بتّی بھی لیتے آنا وہیں ہوگی۔"

چھوٹے ہیں ناں آخر دھر لئے گئے۔ خیر آپ نے سوچا پہلے فون کر لیں پھر موم بتّی بھی ڈھونڈ لیں گے آپ نے اندازے سے ہاتھ بڑھایا اور پہلی کوشش میں ریسیور پکڑ لیا۔ مگر یہ کیا ٹیلی فون تو ڈیڈ ہے! اوہو یہ تو بُرا ہوا۔ اب آپ دل ہی دل میں ٹیلی فون کے محکمہ کو کوس رہے ہیں۔ اسی وقت آپ نے محسوس کیا کہ ریسیور کا تار ماؤتھ پیس کی جگہ ایئر پیس میں لگا ہے "یہ کیسے ممکن ہے!" آپ نے سوچا۔ اوہو! یہ کیا بھئی آپ نے تو ریسیور ہی اُلٹا پکڑ رکھا ہے۔ ارے بھئی شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، اندھیرے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے چلیئے ریسیور سیدھا کریں اور دوبارہ کوشش کریں۔ جی ہاں بسم اللہ۔ لیجئے اس بار آپ کی قسمت نے یاوری کی اور

لائن مل گئی۔

لیجئے بات تو ہوگئی مگر مجھے یقین ہے کہ آپ کو انتہائی حوصلہ شکن جواب ملا ہوگا اور آپ کا چہرہ یقیناً لٹک گیا ہوگا۔ خیر آپ نے موم بتی کی تلاش شروع کی۔ آپ ریک میں اُسے تلاش کر رہے ہیں لیکن آپ کا ہاتھ موم بتی کے علاوہ ہر چیز سے ٹکرا رہا ہے جھنجھلاہٹ ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی اثناء میں آپ کا ہاتھ پوڈر کے بڑے ڈبے پر پڑا اور وہ بھرا ہُوا بھی تھا۔ اس لئے جب وہ آپ کے پاؤں کے انگوٹھے پر گرا تو آپ کو صحیح معنوں میں تارے نظر آ گئے۔

لیکن آپ نے ہمّت نہیں ہاری اور تلاش جاری رکھی آپ کی اتنی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں۔ موم بتی جلد ہی مل گئی۔ آپ ٹٹول ٹٹول کر واپس آئے

"ماچس کہاں ہے۔ وہ ملے تو موم بتی جلاؤں"۔ آپ بولے۔

"یہ لو میرے پاس ہے"۔ آپ کے ابّا جان بولے۔

آپ نے آواز سے اندازہ لگا کر ہاتھ بڑھایا۔ ساتھ ساتھ گھر والوں کو ٹیلی فون کی گفتگو سے بھی آگاہ کرتے جا رہے ہیں"۔ بجلی کے دفتر والے کہتے ہیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ تک بجلی اُف ......"

ارے یہ آپ کے منہ سے چیخ کیوں نکلی۔ اوہو تو ہوگئی نا گڑبڑ شاید آپ کا ماچس کے لئے بڑھا ہُوا ہاتھ ابّا جان کے جماہی کے لئے کھلے منہ میں چلا گیا ہوگا۔ اور جب کوئی چیز بغیر اجازت کے منہ میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو دانت مدافعت کرتے ہیں۔ یہی آپ کے ہاتھ کے ساتھ ہُوا اور آپ کے ابّا جان کے دانتوں نے آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی ہوگی۔

خیر کوئی بات نہیں آپ دوبارہ ماچس پکڑنے کی کوشش کریں" شاباش"

"اے نامعقول یہ کیا کرتا ہے پہلے منہ میں ہاتھ گھسیٹر دیا اب گدگدیاں کرتا ہے"۔ آپ کے ابّا جان کی غصیلی آواز آئی۔ اوہو تو آپ سے ایک اور غلطی ہوگئی اور خطرہ آپ کی پٹائی کا بھی ہے۔

"چٹاخ"۔ دیکھا پڑا نا تھپڑ۔

ارے لیجئے بجلی بھی آگئی۔ لیکن یہ آپ کی حالت کیسی ہو رہی ہے۔ ہاں آپ اس بلیک آؤٹ کے دوران زیرِ عتاب بھی تو رہے ہیں۔ چلیے خیر اب خوش ہو جایئے کہ بجلی تو آگئی۔ ٹی وی چلایئے اور دل بہلایئے

ارے یہ اناؤنسر کیا کہہ رہی ہے!

"ناظرین آپ کلاسیکی موسیقی کا پروگرام 'راگ رنگ' دیکھئے"۔

کہانی جو بندر لے بھاگا

شام یوسفی

جب میں چھوٹا تھا ——— "کھلونا" اور "بچوں کی دنیا"،——— بچوں کے سب سے اچھے رسالے ہُوا کرتے تھے ۔ ان میں کہانیاں ہوتی تھیں ۔ جن اور پری کی بھی اور ڈاکو کی بھی جو امیروں کا مال لوٹ کر غریبوں کو دیتا تھا ۔ خاصا بے وقوف تھا ۔ اور ہاں شہزادی بھی ہوتی تھی اور شہزادہ بھی اور شیخ چلّی کی کہانیاں بھی ۔ یہ سب بڑی مزیدار ہوتی تھیں اور انہیں پڑھ کر جی چاہتا تھا کہ میں بھی کہانیاں لکھوں ۔ لیکن کہانی کیسے لکھی جاتی ہے ۔ اس کا پتا نہیں تھا ۔ رات کو جب سب سو جاتے تو میں قلم لے کر بیٹھ جاتا ۔ اور یہی سوچتا رہتا تھا کہ کہانی کیسے لکھوں نہ کوئی جن جاننے والا تھا ۔ نہ کسی شہزادی سے دوستی تھی ۔ اور نہ کوئی ڈاکو آس پاس رہتا تھا ۔ جس سے پوچھ کر کوئی انٹ شنٹ لکھا جائے دن، ہفتے اور مہینے گذر گئے ۔ کئی راتیں بیت گئیں، قلم کی سیاہی خشک ہو گئی اور کاغذ پہ کہانی کے بجائے دوستوں کے کارٹون نظر آنے لگے ۔ کہانی کا دور دور تک پتا نہیں تھا ۔

لیکن ایک رات کو جب بستر پہ لیٹا تھا تو تھوڑی دیر بعد ہی کہانی شروع ہو گئی ——— بڑی

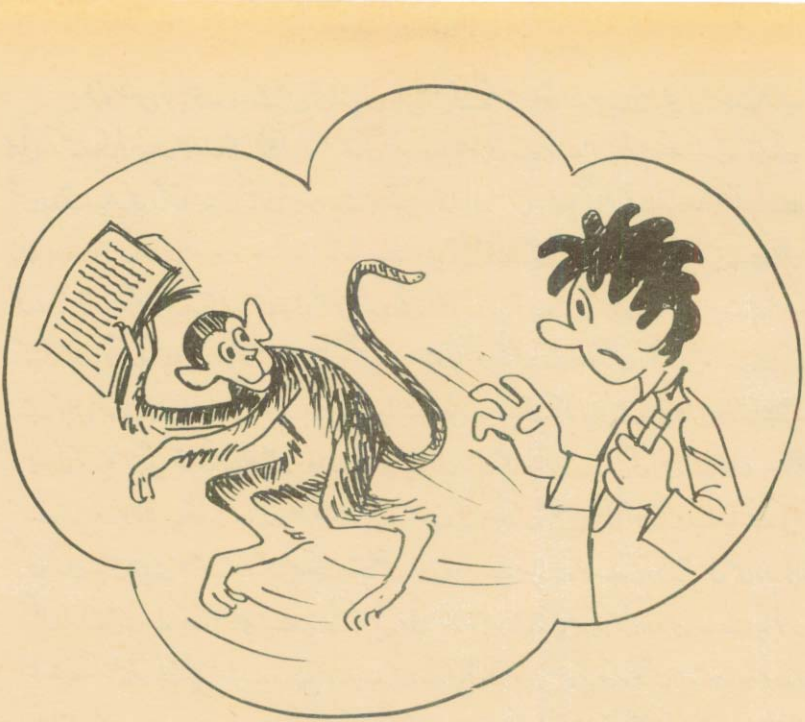

مزیدار کہانی تھی ـــــــ کچھ ایسا نظر آتا تھا کہ ایک بہادر لڑکا تھا۔ اور پتہ نہیں کیوں اور پتہ نہیں کیسے وہ نہ جانے کیسے کیسے کارنامے انجام دے ڈالتا تھا ۔ اور اس لڑکے کے بہت سے کارنامے تو خود مجھے بھی نظر آئے ـــــــ صبح جب آنکھ کھلی تو بڑی خوشی تھی کہ آج کہانی مل ہی گئی ـــ اور ایسی کہانی کہ جس رسالے کو بھیجی جائے گی۔ اس کا ایڈیٹر اسے کم سے کم دو بار چھاپے گا۔ ـــــ اور یہ کہ بس آج کی رات کو ہوم ورک سے نپٹنے کے بعد یہ کہانی جو خواب میں نظر آئی ہے کاغذ پر لکھ کر مکمل کر لوں گا۔

لیکن دِن گزرنے کے بعد جب رات آئی اور کہانی لکھنے کے لئے قلم سنبھالا تو کہانی بالکل صاف ہوگئی ـــــ رات کا دلچسپ خواب یادداشت سے ایسا فرار ہُوا کہ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد بھی ہاتھ نہیں آیا ـــــ اِس قدر مایوسی ہوئی کہ رونا آگیا اور روتے روتے نہ جانے کب ایک اور کہانی شروع ہوگئی یہ جنگل کی کہانی تھی۔ جس میں بہت سارے جانور حصہ لے رہے تھے۔ شیر بھی تھا۔ اور بندر بھی تھا۔ لومڑی اور خرگوش بھی، بھیڑیا اور ریچھ بھی اور اُلّو بھی جو خاصا عقلمند نظر آتا تھا۔

خرگوش تو باقاعدہ گلے میں ڈاکٹروں والی غلیل ڈالے گھوم رہا تھا اور جب لومڑی کی طبیعت خراب ہوئی۔ تو غلیل کی ٹونٹیاں کانوں میں لگا کر اور اس کی گول ڈبیا لومڑی کے پیٹ اور پیٹھ پر رکھ کر پتا نہیں کیا سُن رہا تھا، ریچھ کچھ احمق سا تھا لیکن شیر بہت ہوشیار تھا۔ اور اس نے ہاتھی کو ایک بار ایسا ڈانٹا کہ اسے اپنی سونڈ دبا کر بھاگنا پڑا ------- میں نے سوچا صبح کا انتظار کون کرے۔ کہانی پھر ذہن سے نکل گئی تو افسوس ہوگا۔ اس لئے فوراً ہی کہانی لکھنی شروع کر دی۔ اب آپ یقین کریں یا نہ کریں بہت ہی دلچسپ کہانی تھی اور کوئی پچاس ساٹھ صفحات میں مکمل ہوئی تھی۔ جنگل کے جانور بھی آ آ کر دیکھ رہے تھے کہ میں کہانی لکھ رہا ہوں اور بعض تو بار بار میرے سامنے آ جا رہے تھے۔ تاکہ کہانی میں ان کا زیادہ ذکر آجائے۔ مینڈکی کی کوز کام ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اونچے اونچے بول رہی تھی۔ تاکہ میں اس کی آواز سن لوں — درختوں سے ذرا دور جو تالاب تھا۔ اس میں بگلا بھگت بار بار اپنے پَر پھیلا کر "قیں"، کی آواز لگاتا، سامنے کی گھاس پر ٹڈی کا شور بہ ا بھی پھدک رہی تھی۔ اور دور سے مینا کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ کہانی مکمل کر کے میں نے ایک بار پھر اسے پڑھا کہ کہیں کوئی لفظ نہ چھوٹ نہ گیا ہو۔ اس دوران سارے جانور سامنے آ کر بیٹھ گئے کچھ کھڑے رہے اور جب میں نے کہانی کا آخری صفحہ پڑھ کر خوشی اور اطمینان کا سانس لیا تو اسی دم ——— بندر اُچک کر آگے آیا اور ہاتھ سے کہانی کا مسوّدہ چھین کر درختوں کی شاخوں پر جھولتا ہوا، ہوا میں قلانچیں بھرتا ہوا یہ جا وہ جا ——— میں تو دیکھتا رہ گیا۔

صدمے کے مارے رونا آ گیا۔ اتنی محنت سے بلکہ اتنی مشکل سے تو کہانی لکھی گئی اور یہ کمبخت بندر ——— روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ اور شاید صبح بھی ہو چکی تھی۔ کیونکہ بلّو کی آواز بستر کے سرہانے سے آرہی تھی کہ "امّی بھیا سوتے میں رو رہا ہے۔ خواب میں ڈر گیا" ——— آواز سن کر آنکھ کھلی ——— سامنے بندر ——— معاف کیجئے گا۔ بلّو کھڑا تھا ——— یوں لگا کہ یہی کہانی کا مسوّدہ لے کر بھاگا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن ——— نہ جانے میں نے کتنی کہانیاں لکھی ہیں، لیکن جب بھی کہانی مکمل ہوتی ہے، تو وہی منحوس بندر میرے ہاتھ سے کہانی کا مسوّدہ اُچک کر فرار ہو جاتا ہے۔

اور جاگتے میں سچ مچ کہانی لکھنا ——— نہ بابا نہ ——— یہ اپنے بس کا کام نہیں۔ ہاں کبھی اس بندر سے نجات ملی اور کہانی کا مسوّدہ صبح کو سرہانے رکھا مل گیا تو یقیناً میں اپنی کہانی "آنکھ مچولی" میں بھیجوں گا۔ آپ چھاپیں گے نا؟"

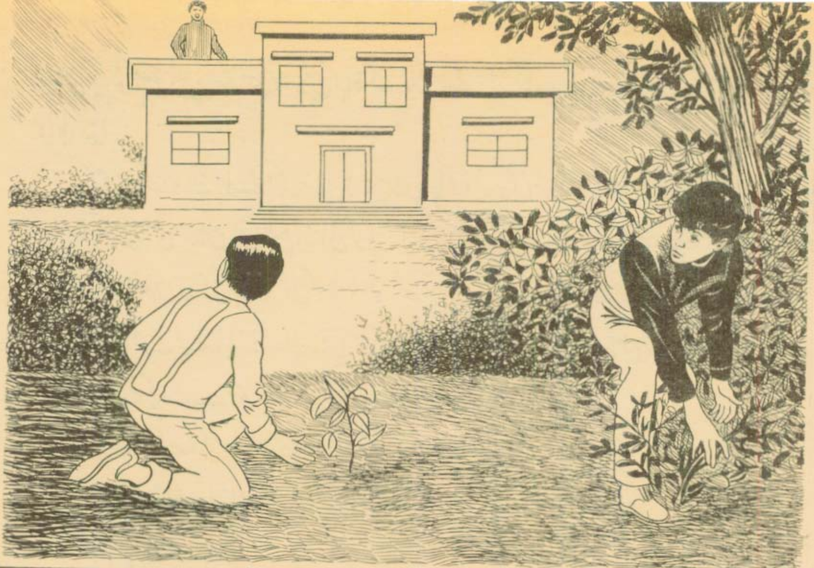

پودے کا اغوا

علی مرتضیٰ

موسمِ بہار کی آمد آمد تھی اور خوش قسمتی سے، ہم ابھی امتحان سے فارغ ہوئے تھے۔ لہٰذا سوچا، کیوں نہ اس فارغ وقت کو کام میں لایا جائے۔ تاکہ نامعقول شیطان ہمارے اعلیٰ دماغ کو گھر نہ بنا سکے۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔ متعدد کتابیں پڑھ ڈالیں کہ شاید کوئی مشغلہ سُوجھ جائے مگر توبہ کیجئے جو خاک سمجھ میں آیا ہو۔ پہلے شکار کے بارے میں سوچا، لیکن نہ تو ہمیں بندوق چلانا آتا ہے اور نہ ہی جال لگانا۔ دیسے بھی ہم خاصے رحم دل واقع ہوئے ہیں۔ بے چارے معصوم جانوروں اور پرندوں پر ہم ظلم نہیں کر سکتے تھے۔ پھر فوٹوگرافی کے بارے میں پڑھا۔ مگر ہم ٹھہرے غریب آدمی۔ بھلا اتنے اخراجات کیسے برداشت کرتے اور پھر یہ فضول شوق ہے۔ کیونکہ اس میں ہدایات دینی پڑتی ہیں اور ہم خاصے کم گو واقع ہوئے ہیں۔ بھلا ہدایات کیسے دے سکتے تھے۔ آپ نے تو دیکھا ہوگا کہ تصویر بناتے وقت فوٹوگرافر ایک کے بعد ایک ہدایت دیتا رہتا ہے، یہ چہرہ اُوپر کیجئے۔۔۔ ٹھیک۔۔۔ اب گردن کو تھوڑا سا خم دیں۔ اب اگر کوئی کوتاہ گردن ہو تو اپنی گردن کو کس طرح خم دے گا؟

یک دَم خیال آیا، کیوں نہ مصوری کریں، لیکن پھر صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ آج تک ایک

سیدھی لکیر تو کھینچ نہیں سکے، کسی کا اسکیچ کیا خاک بنائیں گے۔ ڈرائنگ کے پرچے میں ہمیشہ بغیر اُبلا ہوا انڈا ہی ملا تھا۔

کتابیں کھنگالتے ہوئے ایک خیال ذہن میں آیا کہ آخر یہ کتابیں کسی انسان نے ہی تو لکھی ہوں گی۔ کیوں نہ ہم بھی اسی میدان میں طبع آزمائی کریں۔ آخر کہانی لکھنا کون سا مشکل کام ہے، کسی کو ہیرو بناؤ اور اُس کے ہاتھوں دو تین بدمعاشوں کو مار ڈالو۔ کہانی تیار ہے۔ واہ۔ ایسے عمدہ خیال پر ہم نے خود کو داد دی اور مشورہ کرنے اپنے تایا زاد بھائی کے پاس دوڑ گئے۔ موصوف لان میں ٹہل رہے تھے۔ ہمیں جویوں بھاگتے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا تو ٹھٹھک کر رُک گئے۔

"کہو۔۔۔ کیسے آنا ہوا؟" رسمی سلام و دُعا کے بعد پوچھا۔

"تم سے ایک مشورہ لینا تھا۔" ہم نے کہا۔

"کہو، کیا بات ہے؟"

"تم جانتے ہو کہ آج کل میں فارغ ہوں، لہٰذا میں نے سوچا ہے کہ اب میں کہانیاں لکھوں گا۔"

"تم کہانیاں لکھو گے؟" وہ ایک دم کِھل کِھلا کر ہنس پڑا۔

"کیوں؟" اُسے ہنستے دیکھ کر ہم غصّے میں آ گئے۔ "کیا مصنّفوں کے چار ہاتھ ہوتے ہیں یا دو سر؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" وہ اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولا۔ "اپنی لکھائی دیکھی ہے کبھی؟"

"کیوں؟ کیا خرابی ہے؟" ہم چمک کر بولے۔

"لکھنے کے بعد خود تو تمھاری سمجھ میں آتا نہیں۔ بے چارے ایڈیٹر کی سمجھ میں خاک آئے گا۔"

"اوہ۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ مصنّف بننے کی پہلی شرط اچھی لکھائی ہے اور پوری کلاس میں صرف میری کاپیوں پر جگہ جگہ "صاف، صاف لکھیے" لکھا ہوتا ہے تو پھر کیا کروں؟" ہم بیچارگی سے بولے۔

"باغبانی۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"کیا مطلب؟" ہم نے اُلجھ کر پوچھا۔

"میرا مطلب تھا کہ تم پودے لگاؤ۔ آج کل موسم بہار کی آمد آمد ہے اور ویسے بھی ہرا رنگ آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔ سمجھے یا نہیں؟"

"سمجھ تو رہا ہوں۔" ہم سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"تو پھر کیا خیال ہے، کرو گے باغبانی؟" وہ پُرخیال انداز میں ہماری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں، اس کے تو بے شمار فائدے ہیں" ہم خوش ہو کر بولے اور گنگنانے لگے۔
"حلق مت پھاڑو، آواز بیٹھ جائے گی، بلکہ لیٹ... جائے گی" وہ بڑے ہمدردانہ انداز میں بولا۔
"تو تمھاری آواز کون سی خوبصورت ہے" ہم جل گئے "میری آواز تو لیٹ جائے گی، تمھاری تو سو جائے گی"
"کام کی بات کرو، ٹائم نہیں ہے، وقت بہت ہے" ہماری بات پر وہ جھلا سا گیا۔
"اچھا!" ہم اُسے اُوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے بولے "ختم کرو۔ کل تم میرے ساتھ نرسری چلنا"
"کیوں؟ میں تو نہیں جاؤں گا۔ شوق تمھارا ہے، تم ہی بھگتو" وہ اکڑ گیا۔
"یار، مجھے تو پودوں کی پہچان بھی نہیں ہے اور تم تو ماہر ہو" ہم نے مسکا لگانے کی کوشش کی۔
"یعنی تم مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں مالی کہہ رہے ہو" وہ غرّایا۔
"ڈھکے چھپے" ہم نے حیرت کا مصنوعی اظہار کیا۔ "یار تم تو ہر بات کا غلط مفہوم سمجھ لیتے ہو۔ میں نے تو تمھیں پروفیسر آف گارڈن کا خطاب دیا تھا"
"اچھا" وہ خوش ہو گیا۔ مسکا چیز ہی ایسی ہے۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔
"ٹھیک ہے۔ کل صبح ساتھ چلیں گے"
کھانے کی میز پر امّی نے ہم سے کہا "عاطف! کل صبح نرسری جا کر پودے لے آنا"
یہ سُن کر ہم دم بخود رہ گئے۔ کہاں باغبانی اور کہاں امّی۔ اُنھیں تو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔
"آپ کو کب سے شوق ہو گیا امّی جان؟" ہم حیرت سے بولے۔
"تمھاری نصیرہ خالہ کہہ رہی تھیں کہ اتنا بڑا صحن پودوں کے بغیر سُونا سُونا سا لگتا ہے اور پھر آج کل ہمارے پڑوسی بھی تو خوب پودے لگا رہے ہیں۔ تو کیا ہم کسی سے کم ہیں؟"
"اوہ! تو یہ بات ہے" ہم نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ معاملہ پڑوسن کا تھا لہٰذا کون برابری کرے گا۔ ہم نے دل ہی دل میں نصیرہ خالہ کو ڈھیروں دُعائیں دے ڈالیں کہ چلو ان کے بہانے ہمارا شوق تو پورا ہوگا۔
صبح خوشگوار تھی۔ امّی نے ہمیں سو کا نوٹ تھماتے ہوئے کہا "بیٹا خوب اچھے اور خوبصورت پھولوں کے پودے لانا" ہم سر ہلاتے ہوئے منصور کے گھر کی طرف چل پڑے۔ گیٹ سے جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے منصور کی چھوٹی بہن سمیرا مل گئی، مگر اس کی حالت دیکھ کر ہمیں بے اختیار ہنسی آ گئی۔
"ارے یہ تم نے ٹنڈ کب کرائی" ہم نے اُس کے قریب پہنچ کر ایک ہلکی سی چپت لگائی۔

"اللہ، عاطف بھائی! آپ تو نہ ماریں۔جب سے فارغ البال ہوئی ہوں۔ جسے دیکھو، ایک چپت لگا دیتا ہے۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"بھئی ایسے کاموں کا تو یہی انجام ہوتا ہے۔" ہم ہنستے ہوئے بولے۔ "منصور کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں!" وہ جلدی سے بولی اور باہر دوڑ گئی۔ ہم منصور کے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ موصوف گھوڑے کیا، شاید ہاتھی اور گدھے بھی بیچ کر سوئے تھے۔ زور زور سے آواز دینے اور جھنجوڑ جھنجوڑ کر ہلانے پر بھی اُس کی آنکھ نہ کھلی تو ہم طیش میں آ گئے اور پانی سے گلاس بھر کر اُس پر اُنڈیل دیا۔

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ بچاؤ۔ میں ڈوب رہا ہوں۔" وہ جلدی جلدی ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

"ابھی کہاں ڈوبے ہو۔" ہم نے اُس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ شرافت سے اُٹھ جاؤ ورنہ سچ مچ ڈبو دوں گا۔" ہمارے ان الفاظ نے اُس پر جادو کا اثر کیا۔ وہ ایک دم اُٹھ بیٹھا اور ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

"کیا اُلو کی طرح گھور رہے ہو۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ نرسری پودے لینے جانا ہے۔" ہم اُسے شانے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولے۔

"صبر تو کرو۔ میں نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔ دس منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔" وہ بستر سے اُترتا ہُوا بولا۔

قصّہ مختصر، بہ ہزار دقّت وہ تیار ہو کر ہمارے ساتھ نرسری روانہ ہوا۔ جو ہمارے گھر سے چند فرلانگ دُور تھی۔ نرسری میں قدم رکھتے ہی ہمیں ایسا محسوس ہُوا، جیسے ہم کسی تپتے ہوئے ریگستان سے ایک دَم نخلستان میں آ گئے ہوں۔ نرسری کا ماحول خوشبوؤں سے مہکا اور رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ ٹھنڈی اور خوشبودار ہواؤں نے ہمیں تر و تازہ کر دیا۔ چاروں طرف پودے ہی پودے نظر آ رہے تھے۔ جنھیں ترتیب سے سجایا گیا تھا۔ اونچے اونچے بلند و بالا گھنے درختوں سے گھری نرسری جنّت کا ٹکڑا لگ رہی تھی۔ ہم دونوں ٹہلتے ہوئے پودوں کی پہلی قطار میں داخل ہو گئے۔ عجیب پودے تھے۔ ان میں پھول لگے تھے اور نہ ہی پھل، بس پتّوں سے شاخیں لدی ہوئی تھیں۔ تمام پودے ایک دوسرے سے مختلف رنگ کے تھے کوئی سفید و سُرخ تھا تو کوئی سبز و پیلا۔ کسی پر مختلف رنگوں کی بوندیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم اُنھیں حیرت سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے۔

"انھیں کروٹن کہتے ہیں۔" منصور نے ہم پر اپنی علمیت جھاڑی۔

"تو پھر میں کیا کروں ؟" ہم بے نیازی سے بولے اور آگے بڑھ گئے۔ ابھی ہم قطار کے درمیان ہی تھے کہ یکایک ایک پریشان حال شخص دوڑتا ہُوا آیا اور ہمارے قریب پہنچ کر رُک گیا۔

"پودے چاہئیں صاحب ؟" وہ اپنی تبسیی کی نمائش کرتا ہوا بولا۔ بالکل ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار لگ رہا تھا۔ ہم اُس کے صاحب کہنے پر اکڑ گئے اور آواز بارُعب بناتے ہوئے بولے "ہاں"۔

"کون سے نکال دُوں ؟" وہ خوش اخلاقی کے عالمی ریکارڈ توڑتا ہُوا بولا۔

"یہ پودا کتنے کا ہے ؟" ہم نے ایک خوبصورت سے پودے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"سو روپے کا" وہ بولا۔

"سو روپے کا ؟" ہم نے حیرت سے دُہرایا "بھائی میں نے ایک پودے کی قیمت پوچھی ہے، سب کی نہیں"

"میں بھی ایک ہی پودے کی قیمت بتا رہا ہوں" وہ منہ بنا کر بولا۔

"تو اس پودے میں کون سے سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں ؟" ہم اُس کے طرزِ تخاطب پر چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔

"اسے "موگا" کہتے ہیں لڑکے" وہ ہاتھ لہرا کر بولا "اور یہ تمام کروٹن کا سردار کہلاتا ہے۔ آیا سمجھ میں"

"اسے "موگا" کہتے ہوں یا "گوگا" اس سے ہماری صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے" ہم شانِ بے نیازی سے بولے۔

"آپ لوگوں کو پودے چاہئیں یا نہیں" وہ شاید ہمارے اس انداز سے چڑ گیا۔

"اوہو" ہم نے ہونٹ سکوڑ کر اُوپر سے نیچے تک اُس پر نظر ڈالی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو ؟" وہ جھینپ سا گیا۔

"سوچ رہا ہوں کہ جب آپ جیسے لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے تو کل کلاں کو ہمارا دودھ والا ہم سے یہ نہ کہہ بیٹھے کہ "باؤ جی ٹائم نہیں تھا، اس لیے آدھا کلو دودھ دے رہا ہوں، آدھا کلو پانی تم خود ملا لینا"

"ہمارے ساتھ مسخری کرتا ہے" وہ غصّے میں آکر عوامی زبان پر اُتر آیا۔ خوش اخلاقی کا اب اس کے چہرے پر دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔

"ارے جناب، ناراض ہونے کی کیا بات ہے" منصور نے معاملہ رفع دفع کرنے کی نیت سے کہا "بچّہ ہے۔ جانے دیجئے۔ ہمیں پھولوں کے پودے چاہئیں"

"پھولوں کے پودے سب سے آخری قطار میں ہیں۔ جب پسند کر لو تو مجھے بُلا لینا" یہ کہہ کر وہ واپس اُسی جانب چل پڑا، جہاں سے نمودار ہوا تھا۔ ہم دونوں اُسی طرف چل پڑے، جہاں اُس نے پھولوں

کی نشاندہی کی تھی۔

"کیا خیال ہے، لیموں نہ پار کر لیں"۔ منصور نے ایک لیموں سے لدے پودے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بکواس نہیں"۔ ہم نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ وہ منہ بنا کر خاموش ہو گیا۔ پھولوں کی قطار کے پاس پہنچ کر ہم نے اس میں سے دس پودے نکال لیے۔ یہ سب خوبصورت اور پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔

آواز دینے پر وہی شخص دوڑا آیا اور پودوں پر نظر ڈالتے ہوئے بولا "نکال لیے اپنی پسند کے پودے؟"

"ہاں"۔ ہم نے کہا "کتنے روپے ہو گئے؟"

وہ پودے گنتا ہوا بولا "پورے دس پودے۔ چار سو روپے ہو گئے"۔

"کیا؟؟" ہم ایک دم چلا اُٹھے۔ منصور بھی کم حیرت زدہ نہیں تھا "یہ تم پودے بیچ رہے ہو یا سونا۔ غضب خدا کا، اس سے سستی تو آٹے کی بوریاں آتی ہیں"۔

"تو لگا دینا اپنے صحن میں آٹے کی بوریاں، بہت خوبصورت لگے گا تمھارا صحن اور گھر"۔ وہ ہاتھ نچاتا ہوا بولا۔

"بھائی صاحب، کچھ تو مناسب لگائیے"۔ دفعتاً منصور لجاجت سے بولا۔

"صاحب" کہنے پر وہ تھوڑا سا نرم پڑ گیا اور بولا "کتنے روپے ہیں، تم لوگوں کے پاس"۔

"سو روپے"۔ ہم مری مری آواز میں بولے۔ "اونہہ! سو روپے لے کر چلے تھے۔ پودے خریدنے"۔

"دیکھئے جناب آپ ہماری عزّتِ نفس پر حملہ نہ کریں"۔ ہم اُسے اپنا مذاق اُڑاتے دیکھ کر طیش میں آ گئے۔

"کیا بکواس ہے۔ میں نے کب تم پر حملہ کیا ہے؟" اُس نے بڑی حیرت سے کہا۔

"ارے صاحب! اس کی باتوں میں کہاں اُلجھ گئے آپ؟" منصور اُسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا چلو، تم چار پودے اُٹھا لو"۔ اُس نے گویا قارون کو سخی بنانے کی کوشش کی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے، ہم نے سو کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور چار پودے الگ کر لیے۔

"کیوں نہ گدھا گاڑی کر لیں"۔ منصور پودوں کو دیکھتا ہوا بولا۔

"نہیں اُونٹ گاڑی کر لیتے ہیں"۔ ہم غصّے سے بولے۔

"پھر کیسے لے کر جائیں گے؟" وہ آنکھیں مٹکاتا ہوا بولا۔

"ہاتھوں میں"۔ ہم نے کھٹ سے جواب دیا اور دو گملے ہاتھوں میں اُٹھا لیے اور باقی دو گملے اُسے اٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے نرسری سے باہر آ گئے۔ ہمارے پیچھے منصور بھی گملے اُٹھائے لنگڑاتا ہوا آنے لگا۔ شاید

گملے اٹھاتے وقت موچ آگئی تھی۔ واپسی میں ہم نے گلیوں والا راستہ اختیار کیا۔ آخر ہماری بھی کوئی عزّت ہے۔ مختلف گلیوں سے گھومتے ہوئے ہم اپنے گھر کی طرف تیزی سے رواں دواں تھے۔ کہ منصور ایک مکان کے سامنے ٹھٹھک کر رُک گیا۔

"اب کیا ہُوا؟" ہم نے جھلّا کر پوچھا۔

"یار عاطف! وہی پودا۔" وہ مکان کی کیاری میں ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"کونسا" ہم نے نگاہ دوڑائی "اوہ، موگا" ہم حیرت سے بولے۔

"کیوں نہ چوری کر لیں؟" وہ راز داری سے بولا۔

"اسی وقت؟" ہمارے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں، رات کو۔ رات کا ڈرامہ چھوڑنا پڑے گا۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"تو میں ڈرامے کو پکڑتا کب ہوں کہ چھوڑنا پڑے گا۔" ہم زیرِ لب بولے۔

"بس رات کو آئیں گے۔" اتنا کہہ کر اُس نے آگے قدم بڑھا دیے۔

شام کو ڈرامے سے قبل ہی منصور آدھمکا۔

"ایسی بھی کیا بے قراری؟" ہم اُسے اتنی جلدی آتا دیکھ کر بولے۔

"بھئی جب تک ہم وہاں پہنچیں گے، اُس وقت تک ڈرامہ شروع ہو جائے گا۔"

"یار، اگر کتّے ہوئے تو؟" ہم ڈرے ڈرے لہجے میں بولے۔

"تو تم بھی بھونکنے لگنا۔ وہ سمجھیں گے کہ اپنی ہی برادری کا ہے" وہ جل کر بولا۔

"میں سنجیدہ ہوں۔ سمجھے۔"

"یار، اگر کتّے ہوئے تو واپس آجائیں گے۔ اب چلو۔"

کچھ گلیاں عبور کرنے کے بعد ہم اُس مکان تک پہنچ گئے۔ پودے کو ابھی ابھی کسی نے پانی دیا تھا۔ زرد بلب کی مدّھم روشنی میں وہ پودا چمک رہا تھا۔ "چلو اُکھاڑو۔" ہم نے منصور کو ٹہوکا دیا۔

"اس کا فیصلہ ابھی کر لو کہ یہ کس کے گھر میں رہے گا۔" منصور بولا۔

"فیصلہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ میرے گھر رہے گا۔" ہم نے جواب دیا۔

"اس پر میرا حق ہے۔ میں نے اسے پہلے دیکھا تھا۔" اُس نے غصّے سے کہا۔

"اچھا۔" ہم نے ہاتھ نچایا۔ "اگر میں تمھیں اس گلی سے نہ لاتا تو تم کہاں سے دیکھ پاتے۔"

"کچھ بھی ہو یہ پودا میں اپنے گھر میں رکھوں گا" وہ اور زیادہ جوش میں آنے لگا۔
"چلو ایسا کرتے ہیں، ایک ہفتہ تم رکھنا اور ایک ہفتہ میں۔ منظور ہے؟" ہم نے معاملے کو رفع دفع کرنا چاہا۔

"منظور ہے" اتنا کہہ کر وہ ڈم ڈم کی مختصر سی باڑھ پھلانگ گیا۔ جیسے ہی وہ پودا اُکھاڑنے میں کامیاب ہُوا، عین اُسی لمحے کسی کا سر چھت پر نمودار ہوا۔ چند لمحے تو اُس سر پر لگی ہوئی آنکھیں حیرت سے پھٹ کر یہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ پھر جونہی اُن آنکھوں کا مالک معاملہ سمجھا، اپنی سُریلی آواز میں ریڈیو کی طرح بجنا شروع ہو گیا۔ "چور۔۔۔ ارے بچاؤ۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔۔۔ چور۔۔۔!"

اُس کے سُر شروع ہوتے ہی منصور اس طرح اُچھلا، جیسے اُسے سو واٹ کا کرنٹ لگا ہو۔۔۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اندھا دُھند باڑھ سے باہر چھلانگ لگا دی اور اوندھے منہ سڑک پر پھیلے پانی میں جا پڑا۔ ہمارے تو ہاتھوں کے طوطے اور پیروں کی بطخیں، سب اُڑ گئے۔ ہم نے اُسی وقت ہرن کی طرح چوکڑی بھری اور فٹ بال کی طرح لڑھکتے چلے گئے۔ پتا نہیں ہاتھ پر سَر رکھ کر بھاگے تھے یا سر پر پیر رکھ کر، ایسے موقعے پر کون یاد رکھ سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس شخص کی آواز آنی بند ہو گئی۔ کسی تیز گام کی طرح سرپٹ دوڑتے اور راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ہٹاتے ہوئے ہم نے اپنی۔۔۔ گلی میں جا کر دَم لیا۔ تھوڑی دیر بعد منصور بھی آتا دکھائی دیا۔ اس کے بال کسی نئے ہیئر اسٹائل کی طرح اکڑے ہوئے تھے، چہرے پر خراشیں اور کپڑوں پر کسی تجریدی آرٹ کے نادر و نایاب نمونے بنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چپّل اور دوسرے میں پودا جھُول رہا تھا، ہمارے قریب پہنچ کر وہ دھپ سے بیٹھ گیا۔ اس کا سینہ کسی پمپ کی طرح پھول اور پچک رہا تھا۔

"امریکہ فتح کر آئے کولمبس؟" ہم اُسے گھورتے ہوئے بولے۔
"بکواس مت کرو کیا تم مجھے بتا نہیں سکتے تھے کہ چھت پر کوئی موجود ہے" وہ کراہتا ہُوا بولا۔
"کیا میں غیب دان ہوں؟ مجھے کیا معلوم وہ منحوس کب چھت پر آن مَرا۔"
"اپنا حُلیہ کس طرح درست کروں" وہ اپنے کپڑوں پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔
"چلو میرے گھر بدل لینا" ہم نے کہا اور اُٹھ گئے۔ ہمارے پیچھے وہ کسی وفادار ملازم کی طرح لنگڑاتے ہوئے چلنے لگا۔ چوری چھپے ہم گھر میں داخل ہوئے اُسے غُسل خانے میں منتقل کیا تاکہ وہ آدمیت کے جامے میں آ سکے اور خود پودا لے کر صحن میں آ گئے۔ جلدی سے پودا ایک خالی گملے میں لگا کر ٹی وی

لائونج میں لے آئے۔
"ارے یہ کونسا پودا اُٹھا لائے؟" باجی پودے کو حیرت سے تکتے ہوئے بولیں۔
"محنت کا" ہم بے اختیار بول پڑے۔ چوری کا تو کہہ نہیں سکتے تھے۔ کوئی ہمیں ڈانٹ تھوڑا ہی کھانی تھی۔
"یہ بھلا کیا نام ہُوا!" امّی بولیں۔
"اس کا یہی نام ہے" ہم جان چھڑاتے ہوئے بولے۔ گملا رکھ کر لاؤنج سے باہر آگئے۔ اس دوران میں منصور بھی حلیہ درست کر کے غسل خانے سے نکل آیا۔
"اب تم ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر جاؤ" ہم نے اُسے باہر کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔
"کیا بدتمیزی ہے۔ پودے کا کیا ہُوا؟" وہ اپنا بازو چھُڑاتے ہوئے بولا۔
"اگلے ہفتے لینے آنا" ہم اُسے گیٹ کے پاس لے آئے اور خدا حافظ کہہ کر اندر آگئے۔
چوری کا پودا، جسے ہم نے محنت کے پودے کا نام دیا تھا۔ اگلے دن جب ہم نے اُسے دیکھا تو حیران پریشان ہو گئے۔ اس کی چمک دمک ماند پڑ چکی تھی اور وہ مُرجھانے لگا تھا۔ یہ دیکھ کر ہمیں بڑی تشویش ہوئی اور ہم پودے کے قریب ہی بیٹھ کر اس کے مُرجھانے کی وجہ پر غور کرنے لگے۔
"کیا پودے کو ہپناٹائز کر رہے ہو؟" یکایک ایک آواز سُن کر ہم چونک گئے۔ دیکھا تو وہ منصور تھا۔
"نہیں بھائی! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس پودے کو ہُوا کیا ہے؟" ہم افسوس سے بولے۔
"ارے ہاں، واقعی!" منصور کی نظر شاید اب پڑی تھی۔
"کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ چونکہ ہم چُرا کر لائے تھے اور چوری کرنا اچھّی بات نہیں، اس لیے یہ مُرجھا رہا ہے" ہم سوچتے ہوئے بولے۔
"ہاں۔ یہی بات ہو سکتی ہے" منصور ہمیں دیکھتا ہُوا بڑے جوش سے بولا۔ یہ سن کر ہم نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا۔
"آؤ میرے ساتھ!" ہم گملا اُٹھا کر باہر جانے لگے۔
"مگر کہاں؟" منصور پریشان ہونے لگا۔
"پودا واپس اپنی جگہ رکھنے۔ کیونکہ چُرائی ہوئی چیز میں خیر و برکت نہیں ہوتی" ہم فیصلہ کُن انداز میں بولے اور تیزی سے باہر نکلتے چلے گئے۔

باتیں مزیدار

سعدیہ سلیم

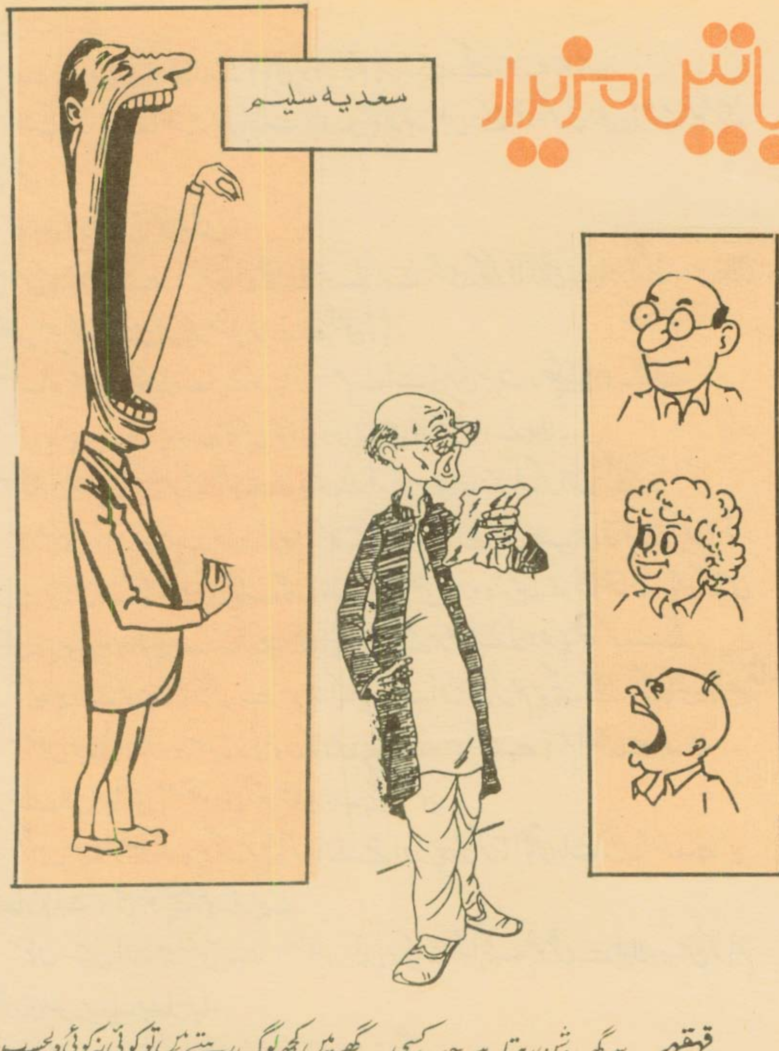

قہقہے سے گھر روشن رہتا ہے۔ جب کسی گھر میں کچھ لوگ رہتے ہیں تو کوئی نہ کوئی دلچسپ بات ایسی ضرور ہو جاتی ہے جس پر سب مل کر ہنس پڑتے ہیں۔ کسی بچّے کا کوئی معصومانہ سا فقرہ، کوئی دلچسپ واقعہ، ابّو یا بھائی جان کا سنایا ہوا لطیفہ، بس انہی باتوں سے گھر کی رونق قائم رہتی ہے۔ اس مضمون میں ایسے ہی دلچسپ واقعات یکجا کر دیئے گئے ہیں جنہیں آپ چاہیں تو سچ سمجھ سکتے ہیں۔

نقلی دانت

چندسال پہلے کی بات ہے۔ ہمارے گھر میں پہلی بار ٹی وی آیا تھا۔ گھر کے سبھی لوگ ٹی وی پر وگراموں کے علاوہ ٹی وی آنے والے اشتہارات بھی بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔

اُس زمانے میں ٹی وی پر سر درد سے نجات دلانے والی گولی کا اشتہار آتا تھا۔ جس میں ایک خاتون دکھائی جاتی تھیں۔ جن کے سر میں درد اُٹھتا تھا۔ سر درد سے نجات پانے کے لئے وہ خاتون فوراً پانی کے ساتھ وہ گولی کھا لتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے سر کا درد ٹھیک ہوجاتا اور وہ خاتون ہنستی مسکراتی ٹی وی اسکرین پر نمودار ہوتیں۔

ایک روز میرے چھوٹے بھائی کے سر میں درد ہوا تو میری امّی نے اُسے وہی ٹی وی والی گولی کھانے کو دی۔ گولی دیکھتے ہی میرا بھائی بولا" امّی یہ گولی تو بے کار ہے۔ ٹی وی والی آنٹی کئی مہینوں سے یہ گولی کھا رہی ہیں۔ اور اُن کا سر درد ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا،،

جب بھی جب کبھی ٹی وی پر اُس اشتہار کو دیکھتی ہوں تو مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی معصومانہ بات یاد آجاتی ہے اور میں بے اختیار مسکرا اُٹھتی ہوں۔

گولی کا اشتہار

چار پانچ برس پہلے کی بات ہے، ہماری پھوپھی کی بیٹی کی شادی تھی۔ ہمارے خاندان میں یہ پہلی شادی تھی۔ اس لئے ہم سب لوگ بے تابی کے ساتھ شادی کا انتظار کر رہے تھے۔ دولہا میاں کو پریشان کرنے کے لئے نئے نئے طریقے سوچے جا رہے تھے۔

شادی سے تین روز قبل دولہا میاں کے ایک رشتہ دار آئے اور کہنے لگے کہ شادی پر لڑکے کے ساتھ کسی قسم کا کوئی مذاق نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ لڑکا بہت سنجیدہ ہے اور مذاق کو بالکل پسند نہیں کرتا پھوپھا جی نے ہم سب کو بلا کر سخت تاکید کی کہ دولہا میاں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی مذاق نہ ہونے پائے ہم سب کو بُرا لگا، مگر کیا ہو سکتا تھا۔

شادی کے بعد دولہا میاں پھوپھی کے گھر آئے تو ہم سب پھوپھا کی تاکید کو نظر انداز کر کے مذاق کرنے کے موڈ میں تھے۔ مگر دولہا کی سنجیدہ اور بُردبار شخصیت کو دیکھ کر ہمّت نہیں پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دولہا میاں کھانا کھانے بیٹھے تو ہم سب اُن کی خدمت میں لگ گئے۔ اچانک دولہا میاں "دونوں گئے۔ دونوں ہی چلے گئے"، کا شور مچاتے ہوئے پیٹ پکڑ کر آنگن کی طرف بھاگے۔

"کیا ہوا ؟"، پھوپھا چلاّئے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کس نے شیطانی کر دی ہے۔

باہر آنگن میں دولہا صاحب ایک ہاتھ سے پیٹ اور دوسرے ہاتھ سے منہ کو دبائے اشاروں سے پانی مانگ رہے تھے۔ پانی پینے کے لئے جیسے ہی دولہا نے منہ کھولا اُن کے چلاّنے کی حقیقت سب پر واضح ہوگئی۔ ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ جناب کے دو دانت نقلی تھے۔ جو کھانا کھاتے ہوئے اُن کے پیٹ میں چلے گئے تھے۔

میں کیا کہہ رہی تھی ؟

فلم شروع ہو چکی تھی۔ میرے برابر میں بیٹھی ہوئی دو خواتین مسلسل آپس میں باتیں کئے جا رہی تھیں اُن میں سے ایک کہہ رہی تھی۔ "اس بار عید پر ہم مرزا جی کے یہاں گئے تھے۔"

اُسی وقت فلم میں ہیروئن نے ہیرو کو ایک چانٹا مار دیا۔ چنانچہ دونوں خواتین گفتگو چھوڑ کر منظر دیکھنے میں مصروف ہوگئیں۔ منظر ختم ہوا تو ایک خاتون نے بات کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کی غرض سے کہا "ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی ؟"

"اِس بار عید پر آپ مرزا جی کے یہاں گئیں تھیں"، پچھلی سیٹ پر سے آواز آئی۔ اس کے بعد سب نے سکون کے ساتھ فلم دیکھی۔

بیڑی پلاؤ

ایک بڑے انجینئر کے ماتحت کو انجینئر کے دفتر میں آئے ابھی دو چار روز ہوئے تھے ایک دن انجینئر صاحب نے اپنے نئے ماتحت کو بلوایا۔ وہ جب اُن کے کمرے میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ صاحب ایک فائل پڑھنے میں مصروف ہیں۔ اُن کے منہ میں سگریٹ لگی ہوئی تھی۔ اپنا دھیان ہٹائے بغیر انجینئر صاحب بولے۔

"بیڑی پلاؤ"

ماتحت کچھ سہم گیا۔ اور اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ اتنے میں پھر صاحب کی آواز آئی

"بیڑی پلاؤ۔"

ماتحت یہ سنتے ہی باہر چلا گیا اور کچھ دیر بعد بیڑی کا ایک چھوٹا بنڈل صاحب کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ صاحب جواب بھی فائل دیکھنے میں مصروف تھے۔ پھر بولے " بیڑی پلاؤ۔"

ماتحت نے جلدی سے بنڈل کھولا اور ایک بیڑی نکال کر صاحب کے آگے رکھ دی۔ فائل سے نظریں ہٹا کر جب انجینئر صاحب نے بیڑی طرف دیکھا تو خوب زور سے ہنس کر بولے۔

"ارے بھائی میں نے کہا تھا۔ بی، ڈی، پی لاؤ یعنی بک آف ڈیلی گیٹڈ پاورس لاؤ۔" صاحب کی بات سن کر ماتحت بہت شرمندہ ہوا۔

چینی کی لائن

۱۹۷۳ء کی بات ہے۔ میں ایک روز شام کے وقت بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ میرا چار سالہ بھتیجا میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہیں پاس ہی زمین پر چینی کے دانے پڑے ہوئے تھے۔ جنہیں چیونٹیاں اُٹھا کے لے جا رہی تھیں۔ زمین سے دیوار تک چیونٹیوں کی ایک لائن بنی ہوئی تھی۔ چیونٹیوں کی لائن دیکھ کر میرا بھتیجا بولا "پھپھو کیا چیونٹیوں کو بھی ہماری طرح چینی کے لئے لائن لگانا پڑتی ہے"؟ اپنے بھتیجے کی بات کر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

سفر مبارک

معلومات بھی ــــــ رہنمائی بھی

حجّاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۲۰۳ صفحات

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے حاصل کر سکتے ہیں

آپ کی مُسکراہٹ دوسروں کا دِل جیت سکتی ہے

مسکراہٹ اور ہم

ساجد سعید

میں آفس جانے کے لئے گھر سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرا دوست عامر نہایت پریشانی کے عالم میں چلا جا رہا ہے۔ میں نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اُس کے چھوٹے بھائی نے قیمتی قلم توڑ دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اُس کی چھوٹے بھائی سے لڑائی ہوئی اور وہ افسردہ ہے اِس واقعہ کے برعکس کچھ ہی دنوں پہلے میری ایک دوست سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس کی نئی بائیسکل چوری ہوگئی تھی۔ لیکن غم و غصّہ کا اظہار کرنے کے بجائے اُس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح تبّسم کھیل رہا تھا۔ میں نے حیرانگی سے پوچھا کہ "کمال ہے تمہاری نئی بائیسکل چوری ہوگئی ہے۔ اور تم ہو کہ خوشی کا اظہار کر رہے ہو"۔ جواب میں اُس نے کہا کہ "جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا۔ اب غم و غصّے اور پریشانی سے بائیسکل واپس آنے سے رہی"۔

آپ نے دیکھا کہ پہلے دوست نے ایک نقصان کے ساتھ ایک روگ کا اضافہ کیا۔ جب کہ دوسرے دوست نے اپنے آپ کو یقین دلا رکھا کہ منہ بسورنے سے نقصان پورے نہیں ہو سکتے۔

ایسی کئی مثالیں آپ کے سامنے پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ ایسی مثالیں اپنے اسکول کالج یا محلے میں خود تلاش کریں تو آپ دیکھیں گے کہ کہیں کوئی طالب علم پڑھائی کے بوجھ سے پریشان ہے اور کوئی مالی مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ الغرض ہر کوئی کسی نہ کسی مسئلے میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن ان لوگوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے۔ جو ہر مصیبت اور پریشانی کا مقابلہ بڑی دیدہ دلیری سے کرتے ہیں۔ اور ہار و جیت دونوں صورتوں میں اُن کے چہرے پر مسکراہٹ کھلی رہتی ہے

اگر آپ کو مشکل حالات میں مسکرانے کی عادت نہیں تو یہ بُری بات نہیں عام سی بات ہے۔ لیکن آپ اگر عام حالات میں مسکرانے کے عادی نہیں تو یہ بڑی تشویشناک بات ہے۔ شاید ابھی آپ کو یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ مسکراہٹ شخصیت میں کتنی دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔

مسکراہٹ ایک انمول نعمت ہے۔ اور یہ نعمت انہی کو حاصل ہوتی ہے۔ جو اپنے والدین اور اھلِ خاندان، دوست احباب، ارد گرد کے رہنے والے لوگوں سے محبّت کرتے ہیں۔ تنہائی پسند اور الگ تھلگ رہنے والے لوگوں کے چہرے آپ نے اکثر حقیقی مسکراہٹ سے محروم پایا ہوگا۔ یہ بات کبھی نہ بھولنے کی ہے کہ پاکیزہ جذبات سے تعلقات میں طاقت پیدا ہو سکتی ہے۔ خود غرضی کی جگہ ایثار، فریب کے بجائے وفاداری اور تکبّر کے بجائے انکساری ہی وہ خوبیاں ہیں۔ جو آدمی کو مطمئن اور مسرور بناتی ہیں۔

یاد رکھیئے کہ دوسروں کی ذات میں دلچسپی لینے اور ضرورت کے وقت اُن کے کام آنے ہی سے آپ کے چہرے پر شگفتگی اور مسکراہٹ پیدا ہو سکتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض نوجوانوں کے مزاج میں چڑچڑاپن ہوتا ہے۔ جہاں کوئی بات مزاج کے خلاف ہوئی۔ فوراً بھڑک اُٹھتے ہیں۔ بات بات پر کیڑے نکالنے کے عادی ہوتے ہیں تنقید کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہوتا۔ اِن عادتوں کی وجہ سے وہ دوسروں میں ناپسند کیے جاتے ہیں۔

اوّل تو کوئی اِن سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا اور جو ملتا ہے وہ بدمزہ ہوتا ہے۔ ایسے نوجوان منفی سوچ کے مالکِ ہوتے ہیں۔ اِس بات کی وضاحت ایک

مثال سے کی جاتی ہے۔ اگر میز پر آدھا گلاس پانی رکھا ہو تو وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ گلاس آدھا بھرا ہوا ہے۔ ان کی نگاہ اسی پر جمی رہے گی کہ گلاس آدھا خالی ہے۔ اس قسم کی منفی سوچ مزاج میں جھنجھلاہٹ پیدا کرتی ہے۔ اگر آپ زندگی کو ہنستے مسکراتے گزارنا چاہتے ہیں۔ تو اپنی سوچ کو مثبت بنائیے۔ اپنی کامیابیوں پر نگاہ رکھیئے۔ اللہ نے جو نعمتیں آپ کو دی ہیں اس کا شکر ادا کیجئے۔ محرومیوں کا گلہ نہ کیجئے۔ کوششیں جاری رکھیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ جلد یا بدیر آپ کا دامن خوشیوں سے بھر جائے گا۔ اور یہ جو خوشیاں ہوتی ہیں نا یہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ صبح کو پرندوں کا گیت، کسی پرانے دوست سے ملاقات کسی بچے کی معصوم مسکراہٹ، سب گھر والوں کا جمع ہو کر خوش گپیاں کرنا، اسکول یا تعلیمی ادارے کی کوئی تقریب، استاد کی شاباشی، کسی اچھی کہانی یا نظم کا مطالعہ۔ جی ہاں یہ چھوٹی باتیں ہیں۔ لیکن زندگی کا حسن انہی سے قائم ہے۔ آدمی کا دل انہی سے توانا ہوتا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے اسی طرح کھلتے ہیں۔ لہذا چھوٹی خوشیاں تلاش کیجئے۔ دنیا آپ کو خوشگوار جگہ معلوم ہوگی اور یہاں آپ کا دل لگے گا نیک نیت لوگ آپ کو مسکراتے ہوئے ملتے ہیں اور جب ان سے ملاقات نہیں ہوتی تو ان کا مسکراتا ہوا چہرہ یاد آتا ہے۔ آپ کا چہرہ بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے جس کو دیکھ کر مسرت کا احساس ہو نا کہ کوفت کا۔ اچھا تو آپ میری بات سنکر مسکرا رہے ہیں۔ کیا آپ کو میری بات پر یقین نہیں آرہا ہے۔ چلیئے کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ مسکراہٹ نے آپ کے چہرے کو کیسی رونق بخش دی ہے۔ یقین نہ آئے تو آئینے سے پوچھ لیں۔

تعلیم الاسلام ۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات
جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے
تالیف: مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب
تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مفت منگوانے کے لیے
صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجئے۔

SWD-1289

ARGUS

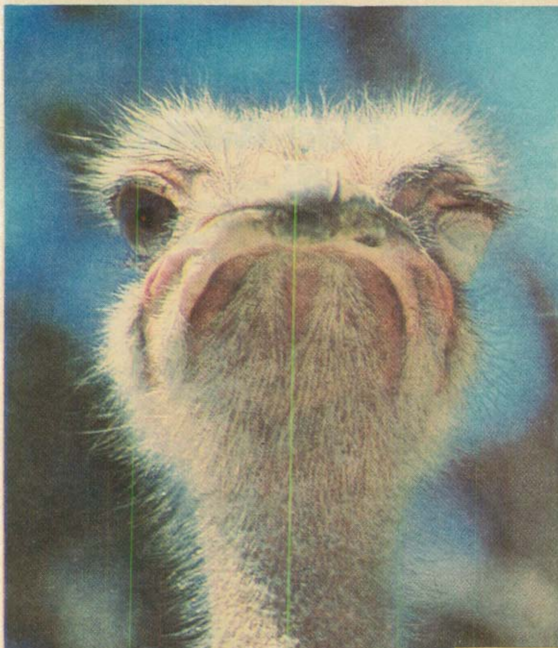

اِک آنکھ بند کر کے
کھنچوا رہے ہیں فوٹو

شتر مُرغ
اور اُود بلاؤ
انسانوں میں رہتے رہتے
کیسی باتیں سیکھ گئے ہیں
دیکھیں اور افسوس کریں!

شرارتی آنکھیں

سلمیٰ سلیم

دیکھنے کے علاوہ آنکھوں کے بہت سے استعمالات ہیں۔ ہم انہی میں خوبصورت مناظر اور پیارے لوگوں کو بساتے ہیں۔ دُکھ میں انہی سے روتے اور سُکھ میں انہی سے ہنستے ہیں۔ غصّہ آئے تو انہی سے گھورتے ہیں اور کسی پر پیار آئے تو انہیں کو پٹپٹا کر بند کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ آنکھوں کو دھول جھونکنے اور طوطا چشمی کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔

ایک آنکھ کے اشارے عام طور پر شرارت کے وقت استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ آپ نے خود کئی بار ایک آنکھ بند کر کے مختلف اشارے کیے ہوں گے۔ دیکھیے مُکریے مت! ابھی کچھ روز پہلے جب آپ ٹافیاں لینے باہر جا رہے تھے تو آپ کے چھوٹے بھائی نے آپ کے ارادے کو بھانپ کر آپ کے ساتھ باہر جانے کی ضد کی تھی۔ اُس وقت آپ نے اپنی امی کی طرف ایک آنکھ بند کر کے دیکھا تھا اور کہا تھا "امی میں دوست سے ملنے جا رہا ہوں نا!" یہ کہہ کر آپ نے اپنے چھوٹے بھائی کی آنکھوں میں دُھول جھونکی تھی۔ یاد ہے نا؟ کہیں تو اور مثالیں دیں...!

جس طرح انسانوں نے جانوروں سے بہت کچھ سیکھا ہے، اُسی طرح جانوروں نے بھی انسانوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس بہت کچھ میں ایک آنکھ بند کر کے مخصوص اشارے کرنا بھی شامل ہے۔ برابر کے صفحے پر موجود تصاویر ہمارے دعوےٰ کی تصدیق کرتی ہیں۔

ذرا بتائیے تو شُترمُرغ اور اُود بلاؤ ایک آنکھ بند کر کے کس بات کا اشارہ کر رہے ہیں؟

نہیں معلوم، ہم بتاتے ہیں! جناب ہُوا یہ تھا کہ ہمارا فوٹوگرافر شترمُرغ اور اُود بلاؤ کی نسل کے بادشاہوں کی تصاویر اُتارنے پہنچا تو اُس کی ملاقات ان دونوں سے ہوئی۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ وہی اپنی اپنی نسل کے بادشاہ ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا جب موقعے پر موجود دوسرے شُترمُرغ اور اُود بلاؤ نے ان دونوں کے جھُوٹ کا بھانڈا پھوڑنا چاہا تو انہوں نے آنکھ کے اشارے سے انہیں منع کر دیا۔

اتفاق سے ہمارے فوٹوگرافر نے انہی لمحوں میں اُن کی تصاویر اُتار لیں۔ ممکن ہے ان دونوں نے شرارتاً ایسا کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے بہت سے انسانوں کی طرح شہرت حاصل کرنے کے لیے جھُوٹ بولا ہو۔ آپ ان تصاویر کو غور سے دیکھیے اور پھر بتائیے کہ ان کی آنکھوں سے جھوٹ جھلکتا ہے یا شرارت...؟

ہم نے ان تصاویر کو دیکھنے سے پہلے آئینہ دیکھا تھا۔ آپ چاہیں تو ہماری تقلید کر سکتے ہیں۔ توقع ہے کہ آپ کو ہماری تقلید سے درست فیصلے پر پہنچنے میں مدد ملے گی۔

Goldfish
Deluxe Pencil
حقیر
سی
لکیر
حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی
گولڈ فِش ڈیلکس پنسل
SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E. MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PH_NE: 293451
جہاں چلے، رَواں چلے
Goldfish

عامر یونس

ہنستی ہوئی زندگی

چند بے فکروں کی شرارتیں
جو ہاسٹل میں رہتے تھے

میں نے ڈرتے ڈرتے کلاس میں جھانکا...

میر صاحب بلیک بورڈ پر مشکل الفاظ کے معنی لکھ رہے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور جھکتا ہوا کلاس میں داخل ہوگیا۔ لڑکوں نے مجھے داخل ہوتے دیکھا اور کچھ تو اُچھل ہی پڑے۔

"کیا ہوا...؟" میر صاحب مڑے اور میں وہیں زمین پر لیٹ گیا۔ میر صاحب اپنی گول عینک اپنی گول سی ناک پر بٹھاتے ہوئے بولے۔

"ذرا یہ مشکل الفاظ کے معنیٰ مکمّل کرلوں... پھر دیکھتا ہوں..."

میر صاحب کی آواز بلند ہوئی تو میرے دل کے دھڑکنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے کلاس میں رینگنا شروع کردیا جس طرح کمانڈو اور فوجی رینگتے ہیں۔ پھر رینگتے رینگتے میں انوار کے ڈیسک کے نیچے سے بھی نکل آیا۔

"واہ میاں واہ خشکی پر سوئمنگ کا اچھا طریقہ ڈھونڈا ہے۔"

میر صاحب کی آواز پر میں اس طرح ہاتھ پیر مارنے لگا جیسے واقعی تیر رہا ہوں

"خشکی پر کسی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے مینڈک...! اپنی شکل ظاہر کرو..." وہ گرجے...

چاروناچار مجھے اُٹھنا ہی پڑا۔

"آہا... یہ تو ہمارے پرانے لیٹ لطیف عامر صاحب بقلم خود موجود ہیں گویا آپ کے لیٹ آنے کی عادت نہیں گئی۔ بلکہ آپ کلاس میں لیٹ کر آنے لگے ہیں۔ جی۔" پھر انہوں نے سزا کے طور پر مجھ سے دو مرتبہ پُوری کلاس میں سوئمنگ کروائی۔ اسکول ختم ہوتے ہی سب لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔

"یار... تم واپس کس طرح آگئے..." بے شمار لڑکوں نے پوچھنا چاہا۔

"اس طرح..." میں نے اُن کو چل کر دکھایا

"اوفوہ... یہ کوئی میر صاحب کی کلاس ہے جو مذاق ہو رہا ہے..."

"ہاں... ٹھیک ٹھیک بتاؤ...؟"

"تو بھائیو اور... اور مزید بھائیو... کیونکہ یہ صرف لڑکوں کا اسکول ہے... بہرحال... ابّا جان اپنا ٹرانسفر کروانا چاہتے تھے، مگر نہ ہوسکا... لہٰذا میں ایک دفعہ پھر آپ سب کے پاس اِدھر یعنی لارڈ نیپئی سن ماڈل اسکول بترجمہ لاٹ صاحب نیپئی سن مجتمہ مدرسہ و ہاسٹل میں واپس چل کر آپہنچا ہوں۔ تو دوستو استقبال کیجیے اور ایک ساتھ مل کر نعرہ لگائیے..."

"جیئے رنگیلا..." کسی نے زور سے نعرہ لگا کر بات کاٹ دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ دُور سعد کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ میرا سب سے بہترین دوست اور روم میٹ تھا۔

"کمرہ آپ کا منتظر ہے جناب..." اُس نے کہا

"اچھا... کون سا..."

"وہی چار سو بیس..." اُس نے بتایا اور میں مسکرانے لگا۔ یوں تو ہمارے کمرے کا نمبر ۲۰ تھا۔ مگر جب پہلی دفعہ ہم دونوں کو وہ کمرہ دیا گیا تھا۔ تو بیس کے ہندسے سے پہلے کسی من چلے نے چار کا اضافہ کر دیا تھا۔ اس طرح مکمل چار سو بیس پڑھا جانے لگا تھا۔ اس کے بعد سے ہمارے کمرے کا نام کمرہ نمبر چار سو بیس پڑ گیا تھا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو میرے پیچھے تمام ہی گینگ داخل ہوگیا۔ ہم کل سات دوست تھے۔ سعد، عرفان، موٹو یا جس کا دوسرا نام ادھڑی تھا... (وجہ تو آپ سمجھ ہی رہے ہوں گے)، عاطف باڈی بلڈوزر (جس کو باڈی بلڈنگ کا شوق تھا اور وہ ایسا لگتا تھا جیسے کہ کوئی بلڈوزر چلا آرہا ہو)... اکّو بادشاہ عرف عقیل، نجّو بابا بنام نجم بے ضمیر (یا نجم ضمیر)، اُلّو بھائی جنہیں پیار سے علیم کہتے تھے۔

اور میں ... شاید آپ سوچیں کہ سعد اور میرا کوئی عرف نہیں ... تو ایسی کوئی بات نہیں ... سعد کو عرفِ عام میں گُدگُد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ دراصل اُس کو گُدگُدی بہت ہوتی تھی۔ اور مجھے ... خیر چھوڑئیے۔ اب میرے بارے میں معلوم کرکے کیا کیجیے گا ..."

ہم ساتوں کا اُس وقت سے ساتھ تھا جب سے ہم نے لاٹ صاحب کے ہوسٹل میں داخلہ لیا تھا اس وقت ہم نیچی سن مجسّمہ مدرسہ (اسکول کے نام کا اُردو ترجمہ) کی پانچویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھے۔ اُس دوسرے گھر میں جو بَسا اوقات ہمارا پہلا ہی گھر تھا۔ ہمیں اب پانچ سال ہوچکے تھے۔ ہمارا یہ مدرسہ یا اسکول شہر سے باہر مضافات میں تھا۔ چاروں طرف باغات و جنگلات تھے۔ اور ایک جھیل بھی قریب تھی۔ اکثر چھٹیوں میں ہم وہاں جایا کرتے تھے۔

ہوسٹل کے کمروں کی روشنایاں گل ہونا شروع ہوگئیں۔ رات دس بجے کے بعد جاگنے کی اجازت نہیں تھی۔ پروفیسر صاحب ہاسٹل کے وارڈن تھے۔ اور کمروں کا دورہ مکمّل کرکے جا چُکے تھے۔ ہاسٹل کی راہداری میں چند سائے نمودار ہوئے۔ وہ احتیاط سے چلتے چلتے ایک دروازے پر ٹھہر گئے۔ پھر انہوں نے دروازہ دو مرتبہ ہلکے اور ایک دفعہ زور سے کھٹکھٹایا۔

"رات ہوگئی ..." اندر سے سرگوشی سُنائی دی۔

"ہاں ... سورج ڈوب چکا ہے"... دروازے کے باہر کھڑے سایوں نے آہستگی سے کہا۔ کمرے کا دروازہ آہستہ آہستہ کُھل گیا۔

"کمرہ نمبر چار سو بیس آپ کو خوش آمدید کہتا ہے ..." اور سائے کمرے کے اندر داخل ہوگئے۔

کھڑکیوں پر رضائیاں چڑھادی تھیں اور اندر دو موم بتّیاں روشن تھیں۔

"دوستو ... اس وقت دس بج کر تیس بجنے میں دس منٹ باقی ہیں ... اب آپ سب جمع ہوچکے ہیں۔ لہٰذا میٹنگ کا آغاز کیا جاتا ہے ..." سعد نے کہا۔

"مجھے تو نیند آرہی ہے ..." علیم نے جماہی لیتے ہوئے بولنے کی کوشش کی۔ وہ بے حد نکمّا تھا۔

"مجھے بھی سونا ہے ... صبح اُٹھ کر ورزش کرنے کے لیے ..." عاطف نے کہا۔ وہ ضرورت سے زیادہ چُست تھا۔

"تم سب کو تو میں سُلاتا ہوں ... ابھی اور ہمیشہ کے لیے ..." سعد آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔

"اُفوہ لڑائی جھگڑا نہیں کرو ... دیکھو ہم میٹنگ جلدی ختم کردیں گے ..." میں نے کہا۔

"مگر ہم میٹنگ میں کیا طے کریں گے... پڑھائی ابھی زوروں پر ہے چند دنوں بعد ماہانہ ٹیسٹ ہیں": نجم نے اپنی رائے دی۔

"بالکل ٹھیک... ہم ابھی کوئی زبردست منصوبہ نہیں بنائیں گے... فی الحال ہمیں پڑھائی کرنی ہے اور ٹیسٹ دینا ہیں... البتہ اس کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا..." میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں... تھوڑا سا کیا..." عقیل نے پوچھا۔

"تھوڑا سا کام کرنا ہے... یہ بتاؤ کون سے اُستاد ابھی تک ہیں..." میں نے پُوچھا

"اُردو کے میر صاحب، سائنس کے عبدالرّشید صاحب، حساب کے عارف صاحب، اسلامیات کے لطیف صاحب، جغرافیے کے عبدالقدوس پانی پتی صاحب، البتہ انگریزی کے نئے ماسٹر صاحب آئے ہیں... نجم نے بتایا۔

"وہ کون ہیں؟"

نجم، عاطف، عقیل، علیم، عرفان اور سعد نے ایک دوسرے کو دیکھا مُسکرائے اور پھر ایک ساتھ بولے "یو آئے..."

"یو آئے... یہ کیا ہُوا"۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ ہیں انگریزی کے نئے ماسٹر صاحب طیّب علی یو آئے..." سعد نے کہا

"انگریزی کے ماسٹر صاحب کا کیا نام ہے... طیّب علی یُو آئے..." میں تقریباً چیخ پڑا۔

"افوہ... آہستہ... ہاں طیّب علی نام ہے اور یو آئے ان کا تکیۂ کلام... دراصل وہ بولتے تو یو آئے ہیں، لیکن نکلتا یو آئے ہے..." عرفان نے وضاحت کی۔

"اوہ... تب تو میٹنگ کا مقصد پورا ہو گیا ہے دوستو..." میں نے کہا۔

"تو کیا...؟"

"ہاں... ٹیسٹ تک ہمیں طیّب علی سر سے "دوستی" کرنی ہے..." میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر چلتے ہوئے سب ایک آواز ہو کر... خدا حافظ یُو آئے..."

انگریزی کے ماسٹر صاحب طیّب علی سے ہماری دوستی ہو گئی۔ ان کی کلاس کچھ یُوں ہوتی۔

"السلامُ علیکم سر..." وہ کلاس میں داخل ہوئے تو سب بچّوں نے اُٹھ کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام یو آئے ... بیٹھ جائیں یو آئے ... انگلش کی کتاب نکالیں اور چیپٹر نمبر یُو آئے"۔

"چیپٹر نمبر یُو آئے ... ؟" پیچھے سے آواز آئی۔

"یہ کیا مذاق ہے یو آئے ... یو آئے ... یہ کون کہہ رہا ہے یو آئے ..." وہ ناراض ہو کر بولے۔ اور پھر مایوس ہو کر پڑھانے لگے۔ پھر ماہانہ ٹیسٹ آ گئے۔ انگریزی کا ٹیسٹ طیّب صاحب نے لیا۔

پوری کلاس نے پہلے سے طے شدہ پلان کے تحت ٹیسٹ دیا۔

"یہ کیا ہے ... ؟" ٹیسٹ کے دوسرے روز طیّب صاحب کلاس میں پھٹ پڑے۔

"تم لوگوں نے ٹیسٹ دیا ہے ... یو آئے ... یا مذاق کیا ہے ... دیکھو یہ ہے رول نمبر ۲۱، کا پرچہ، اس نے سوال کا جواب ... کیسے دیا ہے ... سنو۔

"(اُردو میں ترجمہ) دھوبن کپڑا دھونے والے یو آئے کو کہتے ہیں۔ دھوبی معاشرے کا ایک بہت اہم یُو آئے یعنی فرد ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو ہم سب میلے میلے رہیں۔ یو آئے ...

اور یہ عرفان کا ٹیسٹ پیپر ہے ... انہوں نے مضمون، میری زندگی کا مقصد کے شروع میں لکھا ہے "میری زندگی کا مقصد ... یو آئے ... یو آئے ہے ..."

"یہ ... یہ سب کیا ہے ... میں ابھی پرنسپل صاحب کے پاس جاتا ہوں ... یو آئے ..." طیب علی صاحب غصّے میں تھے۔

"سر ... ایک منٹ ... ہماری بات سُن لیں" میں نے آگے بڑھ کر اُن کو روک لیا۔

"سر ... ہم سب معذرت خواہ ہیں ... اور آپ سے سوری کرتے ہیں۔ اصل میں سر ہم چاہتے ہیں۔ کہ کسی طرح آپ کا یہ تکیہ کلام ختم ہو جائے۔ تاکہ کوئی آپ پر ہنس نہ سکے ... آخر آپ ہمارے اُستاد ہیں۔"

"کیا مطلب یو ..." پھر جلدی سے منہ بند کر لیا۔

"اچھا تو یہ بات تھی ..." طیّب صاحب اس دفعہ منہ بند کیے بغیر بولے۔

اس کے بعد سے طیّب علی صاحب کا تکیہ کلام ختم ہو گیا۔

دن یوں ہی گزرتے رہے۔ ششماہی امتحان بھی ہو گئے۔ امتحانوں کے بعد سالانہ کھیل ہوئے ہماری کلاس کے کھیلوں کے انچارج پروفیسر صاحب تھے۔ جو کہ وارڈن بھی تھے۔ انھوں نے اپنی بھرپور کوشش کر لی لیکن لڑکوں کو کسی کی نگرانی میں کھیلنا تو گوارا ہی نہ تھا۔ جب پروفیسر صاحب زبردستی کھلانے گراؤنڈ میں لے جاتے تو سب یوں کھیلتے گویا سلو موشن میں کھیل ہو رہا ہے۔ کرکٹ میں بیٹنگ کرنے کے

لیے عقیل کو بھیجا جاتا۔ جو گیند کو دیکھ کر بلّا چھوڑ کر میدان سے بھاگنے کی کوشش کرتا۔ اِدھر بولنگ بھی ایسی ہوتی کہ گیند وکٹوں کی طرف جانے کے بجائے امپائر کی طرف جانے لگتی۔ ہاکی میں اور بھی زیادہ دلچسپ منظر دیکھنے کو ملتا۔ سعد گیند گول کی جانب لے جاکر عین گول کیپر کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا۔

"ارے گول کیجئے میاں..." پروفیسر صاحب چلّائے۔ ادھر سعد اور گول کیپر میں گفتگو ہو رہی ہے۔

"ارے قبلہ پہلے آپ ہٹ لگائیے..." گول کیپر نے کہا۔

"نہیں آپ گیند روک لیں گے..."

"نہیں قبلہ پہلے آپ ہٹ تو لگائیے..."

"توبہ توبہ... میں ایسی جرأت کہاں کر سکتا ہوں... واللہ پہلے آپ گیند روکیے..." سعد منہ پیٹ کر بولا۔

"ارے نہیں پہلے آپ..."

"نہیں جی پہلے آپ"

"پہلے آپ..."

"پہلے آپ..." اور یونہی سورج غروب ہو جاتا۔

پروفیسر صاحب بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ کھیلوں کا دن آیا۔ کرکٹ کا میچ ہوا۔ ہماری ٹیم نے مخالف کو دس وکٹوں سے ہرا دیا۔ ہاکی ہوئی ہماری ٹیم کا اسکور بارہ گول تھا۔ اور مخالف کا صفر۔ اسی طرح میں نے سوئمنگ میں، انور نے بیڈ منٹن میں، اور جمشید نے ٹیبل ٹینس میں اوّل نمبر حاصل کیا۔ شام ہوئی تو پروفیسر صاحب مٹھائی کے ڈبے لیے خود ہمارے کمروں میں آئے۔ ان کی مسکراہٹ ایک کان سے دوسرے کان تک جارہی تھی۔

"اچھا اب میں سمجھا کہ تم لوگوں کو میری نگرانی میں کھیلتے ہوئے شرم کیوں آتی تھی" انہوں نے خوش دلی سے کہا...

"جی سر" ہم لوگوں نے سعادت مندی سے سر جھکا لیے۔

سالانہ امتحان قریب آگئے۔ ہمارا وقت اب پڑھائی میں صرف ہوتا۔ کبھی کبھار دل کو بہلانے کے لیے کھیل وغیرہ کھیل لیتے۔ پھر ایسا عجیب وغریب واقعہ ہوا۔ جس نے نہ صرف ہماری بلکہ پرنسپل جناب متین صاحب کی بھی نیندیں اُڑا کر رکھ دیں۔

ہاسٹل کے اندر ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا۔ گزشتہ کئی برسوں سے وہ خاموش تھا مگر ایک دن اچانک وہ بول پڑا۔ سب سے پہلے وہ خوفناک آوازیں عرفان نے سُنیں۔ اس کے بتانے پر ہر ایک نے مذاق اُڑایا۔ مگر چند دنوں میں ہی مجھ سمیت کئی لڑکوں نے وہ عجیب وغریب آوازیں سُن لیں تو سب ڈر گئے۔ راہداری میں پھڑ پھڑاہٹوں کی آواز آتی اور پیپل کا درخت تیز ہواؤں میں شائیں شائیں کرتا رہتا۔ کسی نے یہ بات اُڑادی کہ پیپل کے درخت پر کسی آسیب کا قبضہ ہو گیا ہے۔ بالآخر ان باتوں کی بھنک پر وائس پرنسپل صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ انہوں نے خوب مذاق اُڑایا۔ اور وہم سمجھ کر دُور کرنے کے لیے خود رات جاگ کر گزاری۔ دوسری صبح وہ اُٹھے ہیں تو اُن کے آس پاس جانوروں کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور قمیض پر خون کی بُوندیں تھیں۔ پروفیسر صاحب جو اُٹھ کر بھاگے ہیں تو پرنسپل صاحب کے پاس جا کر ہی دم لیا۔ پرنسپل صاحب کو بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ مگر اُن کو بھی یقین کرنا پڑا۔ اب حالت یہ تھی کہ عشاء کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں بند ہو کر بیٹھ جاتے۔ اور دُعائے قنوت، آیۃ الکرسی پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔

پھر پرنسپل صاحب نے شہر سے ایک عامل کو بلوالیا۔ ایک عجیب وغریب وضع کا آدمی جسے ہم ویسے دیکھتے تو شاید پاگل سمجھتے، گلے میں لوہے کے سینکڑوں ہار ڈالے اور ہڈیوں کا ہار پہنے آیا۔ عامل نے ایک رات پیپل کے درخت کے سامنے گزار دی۔ دوسری صبح بتایا کہ درخت پر ایک بڑے آسیب کا سایہ ہو گیا ہے اور اس کو بھگانے کا معاوضہ دو ہزار روپے ہو گا۔ ہم سب لڑکوں نے اور پرنسپل صاحب نے پیسے جمع کیے اور دو ہزار اس عامل کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پھر اس رات اس کا عمل شروع ہوا۔

چاند کی چودھویں تاریخ تھی۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا اور چاندنی پھیل رہی تھی۔ سب لڑکے اپنے اپنے کمرے میں بستروں میں دبکے ہوئے تھے اور کچھ کھڑکیوں پر چپکے ہوئے عامل باوی جاگا کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ عامل نے رات بارہ بجے کے بعد اپنے گرد ایک دائرہ کھینچا پھر لوبان کو جلایا اور خوب دُھواں پیدا کیا اس کے بعد نہ جانے کیا منتر پڑھنے لگا۔ کئی گھنٹے ہو گئے۔ کچھ نہ ہوا۔ تھک ہار کر لڑکے سو گئے۔

میری آنکھ بہت جلدی کُھل گئی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے فوراً کھڑکی سے جھانکا۔ پیپل کا درخت وہیں موجود تھا مگر... عامل باوی جاگا غائب تھا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں نے جھرجھری لے کر دوبارہ درخت کو دیکھا۔ اچانک مجھے کوئی چیز درخت کے پتّوں میں ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے دیکھا، مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ اللہ کا نام پڑھتے میں کمرے سے نکلا اور درخت کی جانب گیا۔ دائرہ اب بھی کھینچا ہوا تھا۔ جلتی ہوئی لوبان اور راکھ اب بھی موجود تھی مگر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

اچانک مجھے درخت سے کچھ آوازیں سُنائی دیں۔

میں نے گھبرا کر اُوپر دیکھا۔ پتے ہل رہے تھے۔ پھر اچانک ہی جیسے دنگل شروع ہوگیا۔ پھڑپھڑاہٹ ہو رہی تھی۔ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے پھر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے ساتھ ایک زور دار چیخ سُنائی دی اور کوئی نیچے گر پڑا۔

میں آنکھیں بند کیے اپنی موت کا منتظر تھا مگر کافی دیر تک کچھ نہ ہُوا۔ کونے سے تھوڑی سی آنکھ کھول کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

اتنے میں چیخ کی آواز سُن کر پُورا ہوسٹل دوڑتا ہُوا آگیا تھا۔ سب کے سب میرے گرد جمع ہوگئے۔ متین صاحب بھی مجمع چیرتے ہوئے مجھ تک آن پہنچے۔

"عامر... کیا ہُوا... کیا ہُوا...؟" میں پتھر کے بُت کی مانند زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے بھی اس طرف دیکھا...

"ہائیں... یہ کیا...؟" متین صاحب بھی اُچھل پڑے۔

زمین پر عامل باوی جاگا ایک عجیب الخلقت پرندے کو پکڑے ہوئے گرد اور مٹی سے اٹا ہُوا پتوں کے درمیان پڑا آنکھیں جھپکا رہا تھا۔

"یہ... یہ... یہ کیا ہے...؟" متین صاحب نے پوچھا۔

"جناب... یہ آسیب ہے..." عامل بولا۔

"کیا...؟" پورا مجمع چلّایا۔

"ہاں جناب... آسیب نے اُلّو کی شکل اپنا لی ہے..." عامل باوا نے کہا

"کیا کہا..." میں زور سے چلّایا۔ پھر علیم کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں احمق... علیم کی نہیں... اصل اُلّو کی..." سعد نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔

"تم کہہ رہے ہو کہ یہ اُلّو دراصل آسیب ہے..." متین صاحب نے کہا۔

"جی صاحب... بڑی جان جوکھوں کا کام تھا... پوری رات منتر پڑھے ہیں... پھر جو میری اس آسیب سے لڑائی ہوئی ہے تو... توبہ توبہ... اگر یہ قابو نہ آتا تو میری لاش ہی ملتی..."

عامل باوی آنکھیں نچا نچا کر کہہ رہا تھا۔

اچانک سعد دوڑا اور درخت پر چڑھ گیا۔ وہ اس کام میں بڑا ماہر تھا۔ تھوڑی دیر تک ویسی ہی آوازیں

آئیں... پھڑ پھڑاہٹ کا شور سُنائی دیا اور کافی افراتفری کے بعد سنّاٹا چھا گیا۔ پھر اچانک سعد ایک ٹہنی پہ نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک اُلّو تھا۔

"یہ لیجیے متین صاحب... میں نے بھی آسیب قابو میں کر لیا... بغیر منتر پڑھے..." اُس نے ہنس کر کہا۔ اُدھر عامل باوی جا گا اُٹھ کر بھاگا... کسی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

"دیکھتے کیا ہو دوستو... پکڑو اس بدمعاش کو..." سعد نے کہا اور چھلانگ لگا دی۔ تمام لڑکے عامل کے پیچھے دوڑ پڑے۔ تھوڑی دیر بعد عامل باوی جا گا یخنی ہوئی مُرغی کی مانند کھڑا کانپ رہا تھا۔

"حضور غلطی ہو گئی... آئندہ کبھی آسیب کا نام بھی نہیں لُوں گا... میرے باپ دادا کی توبہ..." عامل کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔

"سَر یہ بہت چالاک ہے... اس نے اب بھی اپنے باپ دادا سے توبہ کروائی ہے خود توبہ نہیں کی۔" سعد نے کہا۔

"میرے باپ دادا، میرے بچّوں کی اور میری توبہ... ہزار مرتبہ توبہ... توبہ توبہ..." عامل کان پکڑ کر اُٹھک بیٹھک کرنے لگا۔

"اچھا ہمارے پیسے واپس کر دو..." عقیل نے کہا۔ وہ بہت کنجوس تھا۔

عامل سے ڈھائی ہزار روپے نکلوا لیے گئے۔

"ماسٹر صاحب... رحم... غریب آدمی ہوں... میں نے آپ سے دو ہزار روپے لیے تھے، آپ کے شاگردوں نے ڈھائی ہزار روپے نکلوا لیے ہیں۔" عامل متین صاحب کے پیروں پہ گر پڑا۔

"تمہارے ساتھ ہونا تو یہی چاہیے تھا۔ لیکن خیر..." متین صاحب نے پانچ سو روپے واپس کروا دیے پھر عامل سر پہ پیر رکھ کر بھاگ گیا۔

"یہ بتاؤ کہ سعد تمہیں کس طرح پتا چلا کہ" عارف صاحب نے پوچھا۔

"بس عارف صاحب کہ... کیا بتاؤں کہ..." سعد شرمانے لگا۔ میں نے زور سے اُس کے چٹکی لی۔

"اچھا اچھا بتاتا ہوں... چٹکیاں کیوں لیتے ہو۔ دراصل مجھے اس عامل پہ پہلے ہی شبہ تھا۔ پھر اُلّو کے ساتھ دیکھ کر میرا شک پختہ ہو گیا کہ ضرور اس درخت پر کسی اُلّو نے بسیرا ڈال دیا ہے، میں تصدیق کرنے کے لیے درخت پہ چڑھ گیا۔ وہاں ایک اُونچی شاخ پر یہ دوسرا اُلّو بھی بیٹھا تھا۔

یوں ہی لڑتے جھگڑتے، پڑھتے، پڑھاتے، کھاتے پیتے، ہنستے ہنساتے ہمارا فائنل امتحان بھی ہو گیا۔

امتحان کے دوسرے روز بارہ بجے تک سب اپنے اپنے کمروں میں لیٹے رہے۔ کسی کا بھی اُٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پرویز صاحب کو اطلاع ہوئی دوڑے دوڑے آئے۔ چند منٹوں میں متین صاحب بھی ہمارے سامنے موجود تھے۔

"کیا بات ہے لڑکو... تم لوگ اُداس کیوں ہو..." انہوں نے نہایت نرم لہجے میں پوچھا۔

"سر اب ہمارے امتحان ختم ہو گئے ہیں نا اس لیے..." عاطف نے کہا۔

"یہ لو... تمام دنیا کے بچے تو امتحان ختم ہونے پر خوشی مناتے ہیں... یہاں اُلٹا ہی دستور ہے۔

"نہیں سر... دراصل اب ہماری چھٹیاں ہو جائیں گی... ہم یہاں سے چلے جائیں گے... پھر... پھر تو کبھی واپس نہیں آئیں گے..." میری آواز بھرا گئی۔

"اوہو... تو یہ بات ہے... دیکھو لڑکو... مجھے معلوم ہے تم سب کی دوستی کتنی زیادہ ہے۔ پھر تمہاری زندگی کا بڑا حصّہ یہاں گزرا ہے... انسان کو جس طرح اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے اسی طرح تمہیں بھی اس ہوسٹل سے محبت ہو گئی ہے... مگر تمہیں زندگی میں کہیں رُکنا تو نہیں ہے... جس طرح تم اپنے جسم کو بڑھنے سے نہیں روک سکتے اس طرح تم اپنے آپ کو آگے بڑھنے سے بھی نہیں روک سکتے۔ آگے بڑھنے کا یہ عمل ہی زندگی ہے"۔ متین صاحب کی باتیں ہم سب غور سے سُن رہے تھے۔

"اب تم لوگ یہاں سے جاؤ گے... ضروری تھوڑی ہے کہ تمہاری دوستیاں ختم ہو جائیں... تم کالج میں ایک ساتھ داخلے لے سکتے ہو... وقفے وقفے سے ایک دوسرے سے ملاقات کر سکتے ہو... گر دل چاہے تو چھٹیوں میں یہاں بھی آ سکتے ہو... آخر تمہارے ساتھ ہمارا بھی تو وقت گُزرا ہے۔ وہ اچھے دن گزر رہے ہیں کہ ہمیشہ یاد رہیں گے..." متین صاحب کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔

آخری بس جانے ہی والی تھی... تقریباً پورا ہاسٹل خالی ہو چکا تھا۔ خدا خدا کر کے بس روانہ ہوئی۔ پوری بس نے ہاتھ ہلا ہلا کر لارڈ بیچی سن ماڈل اسکول اینڈ بورڈنگ کو خدا حافظ کہا۔

واپسی کا سفر شروع ہی ہوا تھا۔ کہ قریب ہی ایک زیرِ تعمیر عمارت پر نظر پڑ گئی۔

"یہ کیا بن رہا ہے سر..." پوری بس نے پوچھا۔

"آگے بورڈ لگا ہوا ہے۔ پڑھ لو..." متین صاحب نے مُسکرا کر کہا۔

آگے بورڈ لگا ہُوا تھا۔

"لارڈ بیچی سن ماڈل کالج اینڈ بورڈنگ..."

ٹوٹنا ہماری ٹانگ کا

شانی ایوب

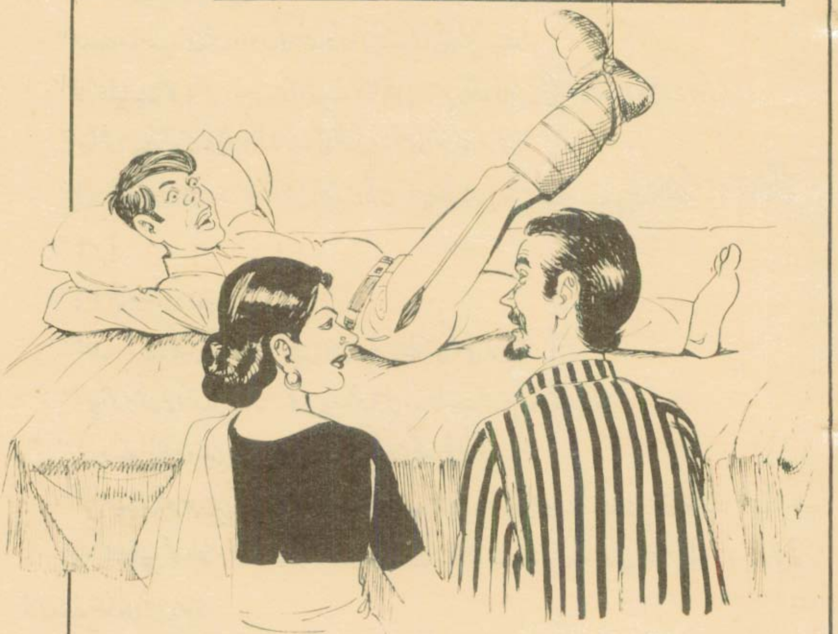

خدانخواستہ آپ کی ٹانگ ٹوٹ جائے تو اسپتال جانے سے پہلے اس مضمون کو پڑھنا نہ بھولیں

اُس روز ہم گھر لوٹ رہے تھے کہ ایک منی بس ہماری بائیں ٹانگ کو سہلاتی ہوئی گزر گئی۔ ہم دھڑام سے گر پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے آس پاس کی زمین خون سے سفید ہوگئی۔ لوگوں کی بھیڑ نے ذراسی دیر میں عادتاً ہمارا گھیراؤ کر لیا۔ منی بس کا ڈرائیور اپنے کیسٹ پلیئر پر " ذرا چہرہ تو دکھاؤ"

والا گانا بجاتا غائب ہو گیا۔

خبر جنگل کی آگ کی طرح محلّے میں پہنچی، جہاں سے ہمارے علاقے کے کونسلر صاحب دس پندرہ لڑکوں کے ساتھ موقعٔ واردات پر پہنچ گئے اور آتے ہی بڑھک ماری۔

"میں نے کہا پنٹو صاحب آپ کہیں تو سڑک بلاک کروادیں۔ پتھراؤ کروادیں؟"

"ارے نہیں بھائی چھوڑیں! جو ہونا تھا ہُوا" میں نے اپنی ٹانگ کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا۔

"ارے صاحب منی بس والوں کی غنڈہ گردی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔"

"قوم کا کیا بنے گا؟" کسی دوسرے آدمی نے ٹکڑا لگایا۔ ہم بگلے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر بولے۔

"بھائیو! پہلے میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی فکر کرو۔ قوم کی فکر پھر کر لینا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں" کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ اسپتال میں بستر چڑھنے سے پہلے ہماری کیس ہسٹری کالی گئی

"نام؟"

"پنٹو خراب آبادی۔"

"ہوں... یہ ٹانگ پہلی بار ٹوٹی ہے یا اس سے پہلے بھی کبھی ٹوٹی تھی؟"

"آپ کو یہ سُن کر انتہائی صدمہ ہوگا کہ یہ سانحہ پہلی بار ہُوا ہے" ہم نے جل کر کہا۔

"آپ کے خاندان میں اس سے پہلے بھی کسی کی ٹانگ ٹوٹی؟"

"کیا آپ اس موضوع پر کوئی تحقیقی کتاب لکھ رہے ہیں؟" ہم نے تکلیف سے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"یاد کیجیے آپ کے دادا، دادی کسی کی تو ٹانگ ٹوٹی ہوگی" کارندے نے اپنے سوال کو دہرایا اور میرا سوال تو اُس نے سُنا ہی نہیں تھا۔

"نہیں جناب مجھے اس بارے میں کچھ یاد نہیں ہے۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ پہلے لوگوں کی ٹانگیں جینیوئن ہوتی تھیں، میرا مطلب ہے جاپان سے منگوا کر لگایا کرتے تھے۔ ہم لوگ چونکہ ہانگ کانگ کی ٹانگیں استعمال کرتے ہیں۔ اسی لیے آٹھ سال سے زیادہ نہیں چل پاتیں، ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہ سُنتے ہی اسپتال کا کارندہ حکیم الامّت کا پوز بنا کر بیٹھ گیا۔ دایاں ہاتھ کنپٹی پر اس طرح تھا جیسے گہری سوچ میں ڈبکیاں کھا رہا ہو۔

"جاپان اور ہانگ کانگ کی ٹانگیں۔ میں سمجھا نہیں" کارندے نے کچھ پریشان ہو کر پوچھا۔

"آپ سمجھ جائیں گے لیکن ابھی نہیں۔ فی الحال آپ میری ٹانگ پر توجہ دیں۔ جو ٹوٹ چکی ہے۔ اس کی تاریخ پر آپ بعد میں بھی غور کر سکتے ہیں۔ اُف میرے خدا!" درد کی ایک لہر اُٹھی اور ہم چیخ پڑے۔

ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں پلاسٹر کا کھٹ کھٹ کرتا جوتا پہنے ہم گھر پہنچے۔ اب پلنگ ہی ہماری دنیا تھی۔ چلنا پھرنا قطعاً منع تھا۔ ذرا سا بھی چلنے کی کوشش کرتے تو نیچے والوں کے یہاں سے آواز آتی۔

"ارے بھائی کیا مرچیں کوٹ رہے ہو؟"

ہم گیلری سے اپنی پلاسٹر چڑھی ٹانگ نیچے لٹکا دیتے، وہ دیکھ لیتے اور تھوڑی دیر کے لیے چُپ ہو جاتے۔

"ذرا آہستہ چلا کریں۔ آپ کے تیز چلنے سے چھت کا پلاستر گرتا ہے۔" نیچے سے آواز آتی۔

ہم پیر کو حسرت سے تکتے ہوئے سوچتے کہ جیل کے قیدیوں کو بیڑیاں خواہ مخواہ ہی پہنائی جاتی ہیں۔ ہماری رائے میں تو انہیں پلاسٹر چڑھا دینا ہی کافی ہوگا۔ کیسا ہی خطرناک مجرم کیوں نہ ہو۔ پلاسٹر کو یاد کر کے کانپ اُٹھے گا۔ جیسے جیسے پلاستر کے اُترنے کا وقت قریب آ رہا تھا ہمارا دل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔

اور پھر اُس دن...

قینچی پلاستر کو کتر رہی تھی اور ہم سو میٹر دوڑ کے ارادے کو تھپکیاں دے رہے تھے۔ اسپتال کے انٹرویو لینے والے کارندے کو جتنی بھی ہدایتیں یاد تھیں سبھی ہمیں دے ڈالیں۔ بس اُس نے صرف یہ نہیں کہا کہ آئندہ پیدل چلنے کی کوشش مت کرنا۔ ہم اُس کی ہدایات پر بہت بھنّائے اور پکّا ارادہ کیا کہ آئندہ کبھی اسپتال نہیں آئیں گے، مگر والئے قسمت اگلے روز ہی ہم دوبارہ اپنی دوسری ٹوٹی ہوئی ٹانگ لے کر اسپتال کے اُسی کارندے کے سامنے تھے۔

"اس سے پہلے کبھی ٹانگ ٹوٹی یا نہیں؟"

"شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں؛" اُس نے سر اُٹھا کے غور سے ہمیں دیکھا "جاپان کی ٹانگیں" اُس نے مسکرا کر کہا۔ "جی نہیں ہانگ کانگ کی" ہم نے جواب دیا

"ہاں تو آپ کی ٹانگ دوبارہ کیسے ٹوٹ گئی؟"

"ناتجربہ کاری کی وجہ سے"

"کیا اتنی جلدی آپ چلنا پھرنا بھول گئے تھے؟" اس نے طنز سے کہا

"دراصل ہوا یہ کہ میں دو ماہ تک ایک پیر میں پلاسٹر پہنے رہا اور دوسرے پیر میں چپّل۔ پلاستر والے پیر کی چپل میں نے سنبھال کر رکھ دی تھی۔ جو چپل استعمال میں آئی، مسلسل گھسنے کی وجہ سے اس کی اونچائی آدھی رہ گئی جبکہ استعمال میں نہ آنے والی چپّل جوں کی توں رہی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"پلاسٹر کٹنے کے بعد میں نے سنبھال کر رکھی ہوئی چپّل پہنی تو توازن بگڑ گیا۔ تھوڑی دیر تک تو مجھے یہی

لگا کہ یا تو میرا ایک پاؤں چھوٹا ہو گیا ہے یا پھر میں ایک پاؤں فٹ پاتھ پر اور دوسرا سڑک پر رکھ کر چل رہا ہوں۔ اس گتھی کو سلجھانے سے پہلے میری ٹانگیں آپس میں اُلجھ چکی تھیں۔ اور میں فٹ پاتھ سے نیچے تھا۔ جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔" یہ کہہ کر ہم نے ایک چیخ ماری۔ تکلیف کی شدت سے۔

اب ہماری دوسری ٹانگ پر پلاسٹر چڑھ چکا ہے۔ ہم آج کل پھر ہر وقت پلنگ پر پڑے رہتے ہیں۔ ہاں البتہ اب پچھلے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا ہے۔ اب ہم ایک پیر کی چپّل سے جتنا چلتے ہیں دوسرے پیر کی رکھی ہوئی چپّل کو اتنا ہی گھس لیتے ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ٹیسٹ کرکٹ میں گیند کی شکل بگاڑنے پر ایمپائر نئی گیند کو گھستا ہے۔ اب ہمیں یقین ہو چلا ہے کہ تیسری بار ہماری ٹانگ ٹوٹنے کا کوئی اور ہی سبب ہو گا۔ اور ہاں اب ہماری آئندہ نسلوں میں سے کسی شخص کی ٹانگ ٹوٹی تو اُس کا کیس پیچیدہ نہیں ہو گا کیونکہ اُسے کم از کم میری ایک ٹانگ کے ٹوٹنے کے بارے میں تو ضرور معلوم ہو گا۔

کبھی تو اپنے ابو کی طرح چُپ چاپ ناشتہ کر لیا کرو۔

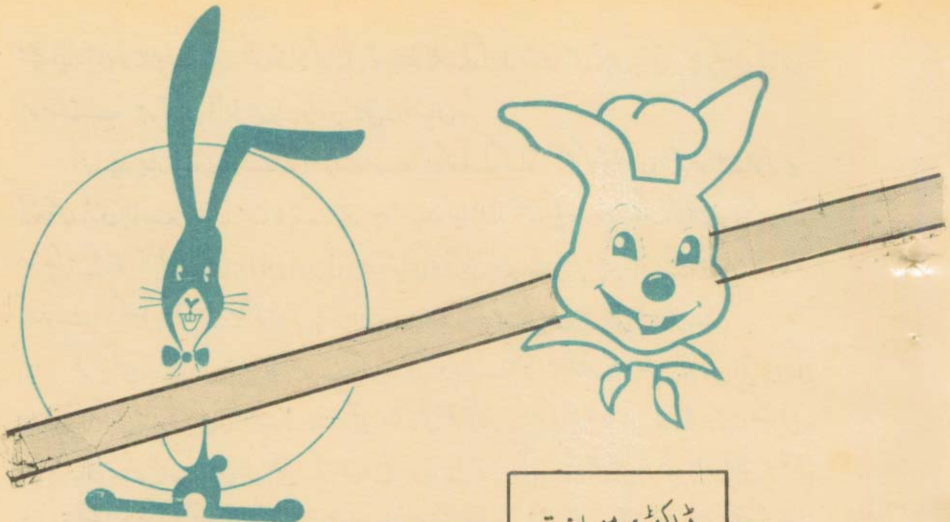

ڈاکٹر مبین اختر

خوش رہو آباد رہو

امّی ابّو کھلونے لائیں تو کتنی خوشی ہوتی ہے ہر بچّہ آگے بڑھ کر اسے مانگتا ہے اور پھر اس سے کھیلنے میں لگ جاتا ہے۔ بھائی، بہنوں اور دوستوں کو دکھاتا ہے اور ان کے ساتھ مل کر کھیلتا بھی ہے کھیل کے دوران ہنستا ہے اور قہقہے لگاتا ہے زندگی کتنی حسین لگتی ہے۔ یہاں تک کہ کھیلتے کھیلتے شام ہو جاتی ہے پھر رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ کاش دن ختم نہ ہوتا۔ دوست اپنے گھروں کو نہ جاتے، امی ابو سونے کے لیے اصرار نہ کرتے کھیل کو دیونہی چلتا رہتا۔ مگر ایک وقت آتا ہے اسے ختم کرنا پڑتا ہے۔ اور رات آجاتی ہے۔ کھانا کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ دِل تو کھیل میں مگن ہے کھانے کی کس کو پڑی ہے۔ کیا تھوڑی دیر اور نہیں کھیل سکتے۔ اندھیرا ہو گیا ہے تو باہر صحن میں بلب جلا کر روشنی بھی تو کر سکتے ہیں۔ بڑے بھیّا تو ایسے ہی کرتے ہیں، ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ مگر کھانا کھانے کا بھی اپنا مزا ہے۔ ان کے بغیر

بچّے بیمار بھی تو ہو جاتے ہیں۔ اگر غذا نہ کھائیں تو چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہیں رہتی۔ پھر کھیل کہاں ہو سکتا ہے۔ پھر تو بس ڈاکٹر ہیں اور کڑوی کسیلی دوائیاں۔

اس لیے پیارے پیارے بچّو! مزے مزے کے کھانے کھاؤ، جسم کو توانا کرو۔ تم سوچتے ہو کہ یہ نیند بھی بُری بلا ہے۔ کاش سونا نہ پڑتا۔ پھر معلوم ہے کیا ہوتا، کبھی ایک رات جاگ کر دیکھو، اگلے دن سر چکرائے گا۔ آنکھیں بند ہو رہی ہوں گی۔ اور دنیا کی کوئی چیز نیند کے برابر اچھی نہیں لگے گی۔ نہ کھانا، نہ کھلونے، نہ کھیل، تو پتا یہ چلا کہ خوش باش اور صحت مند رہنے کے لیے نیند بھی ضروری ہے۔

مگر یہ صبح اُٹھتے ہی یہ چیخ پکار کیسی ہے کہ جلدی کرو کپڑے پہنو، ناشتہ کرو، اسکول کی بس آتی ہی ہوگی اور جب اسکول پہنچو تو مس کی ڈانٹ ڈپٹ بدتمیز، نالائق تم تو بڑے ہو کر بھی ایسے ہی بنو گے۔ کیا اسکول اور پڑھائی سے نجات نہیں مل سکتی۔ اگر اس طرح ہو جائے تو زندگی میں خوشی ہی خوشی ہو۔ قہقہے ہی قہقہے ہوں تو تعلیم نہ ہوگی، تعلیم نہ ہوگی تو انسان اور جانور میں کیا فرق رہ جائے گا۔ دیکھتے نہیں جن لوگوں کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا وہ کتنی خراب زندگی گزارتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں نہ پڑھ سکتے ہیں نہ اخبار رسالوں کے ذریعے دنیا کی خبروں کا پتا لگا سکتے ہیں۔ دنیا میں کسی نئی چیز کی ایجاد بھی نہیں کر سکتے۔ اور جو چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں، اُن سے فائدہ بھی نہیں اُٹھا سکتے۔ نہ ٹائپ رائٹر، نہ کمپیوٹر، نہ کچھ اور تعلیم کے بغیر آمدنی بھی کم ہوتی ہے اور آمدنی کم ہو تو انسان خوشیوں سے بھی محروم رہتا ہے۔

تو سنو! کھیلو کودو لیکن اسکول بھی جاؤ۔ اپنے خدا کو بھی خوش رکھو اور امّی ابّو کو بھی۔ صحت بھی بناؤ اور بڑے ہو کر پیسے بھی کماؤ۔ جب یہ سب چیزیں تمہیں حاصل ہوں گی تو تم ایک مسرّت بھری زندگی گزار سکو گے اور خوب جی بھر کے ہنس سکو گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔

ابھی پچھلے دنوں ہمارے ایک دوست کی شادی کی سالگرہ تھی۔ ان کو ایک دوست کی طرف سے جو کارڈ موصول ہوا اُسے دیکھ کر معلوم ہوا کہ کفایت شعاری کسے کہتے ہیں۔ مبارک باد کے کارڈ میں لکھا تھا۔

"چھوٹی عید، بڑی عید، نئے سال، آپ دونوں کی برتھ ڈے، بچّوں کی سالگرہ ... آپ دونوں کی شادی کی سالگرہ، ... اس سال اور آئندہ دس سال تک کی پُرخلوص مبارک باد قبول فرمائیے۔ اور خوشی کے ان تمام مواقع پر اپنے مخلص دوست کو اپنے ساتھ شریک تصوّر کیجیے!"

(مُرسلہ :- منیر منصوری۔ کراچی)

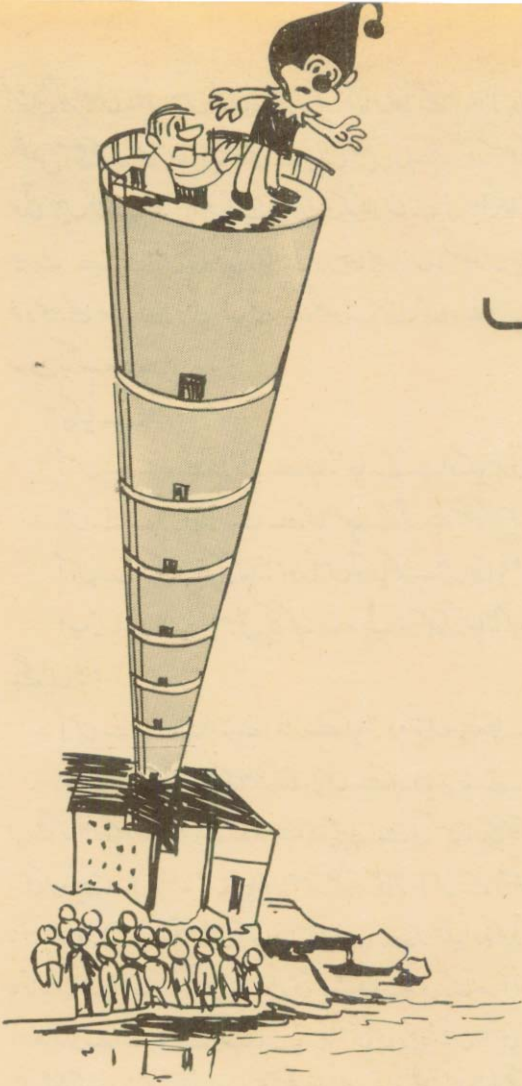

چھلانگ

شوکت تھانوی

ایک جھوٹ جس نے سرکس کا ہیرو بنا دیا

لاھور پہنچکر سیدھا مسعود کے گھر پہنچا تو وہ حضرت غائب۔ معلوم ہوا کہیں گھومنے گئے ہیں خیر وہ گھومنے جائیں یا جہنم میں۔ گھر تو ان کا موجود ہی تھا۔ سامان رکھ کر نہایت اطمینان سے نہایا دھویا کپڑے بدلے اور ان کے ملازم سے کہا کہ چائے لاؤ یہ ملازم بھی کوئی نیا جانور پھنسا تھا۔ ایک تو وہ شروع سے آخر تک ایسی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں اس کے مالک کا مہمان نہیں کوئی

اُٹھائی گیرا ہوں ۔ اور اس گھر سے کچھ نہ کچھ اُٹھا کر بھاگنے ہی والا ہوں ۔ دوسرے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص آج تک کسی مہذب آدمی کے یہاں نہیں رہا ہے ۔ اور مسعود کو بھی ابھی اسے انسان بنانے کا موقع نہیں ملا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے تمیز داری کہ گلاس میں بنی بنائی چائے لاکر تپائی پر رکھ دی ۔ میں نے حیرت سے پہلے اِس بے ہودہ چائے کو دیکھا پھر اس نامعقول چائے لانے والے کو دیکھا ۔ لیکن وہ خود ہی مجھے کھاجانے والی نظروں سے گھور رہا تھا ۔ میں نے اس سے بہت کچھ کہنا چاہا ۔ لیکن بمشکل صرف یہ کہہ سکا ۔

"یہ کیا ہے "

اُس نے جلے بُھنے انداز سے کہا ۔ "چائے ہے اور کیا ہوتی ؟ "

میں نے اب ذرا وضاحت سے کہا "چائے تو ہے مگر گلاس میں ؟ "

اُس نے ترکی بہ ترکی کہا ۔ " اور نہیں تو کیا گھڑے میں لاتا ؟ "

اب میں نے اپنے متعلق کچھ کہنا مناسب نہ سمجھ کر کہا ۔ "کیا مسعود صاحب گلاس میں چائے پینے لگے ہیں ؟ "

اُس نے بہت ہی کھرّے انداز سے کہا ۔ " وہ نہیں پیتے چائے وائے ۔ وہ لسّی پیتے ہیں ۔ "

اب میں اِس نوکر کے کیا منہ لگتا ۔ اِس سے کہہ دیا یہ چائے لے جاؤ اور خود مسعود ہی کے بستر پر لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا قریب ہی پچھلے مہینے کی کسی تاریخ کا کوئی پھٹیچر سا اخبار پڑا ہوا تھا ۔ دیر تک اِسی کو دیکھتا رہا ۔ اِس میں چھپا پورا معمّہ حل کر ڈالا ۔ اِس کے اشتہارات تک پڑھ ڈالے ۔ مگر مسعود کو نہ آنا تھا اور نہ آئے ۔ آخر میں اُٹھا اسی خیال سے کہ شاید اور کوئی پڑھنے کی چیز مل جائے ۔ الماری کا جائزہ لینا ہی چاہا تھا ۔ کہ نمائش کا اعزازی ٹکٹ سامنے ہی رکھا نظر آیا ۔ بس فوراً یہ پروگرام بنالیا کہ یہاں پڑے انتظار کرنے کے بجائے جب تک جاکر نمائش ہی دیکھ آئیں ۔ اتنی دیر میں مسعود بھی گھر آجائیں گے ۔ یہ پاس اُٹھا کر جیب میں رکھا ۔ اور اسی جنگلی ملازم سے نمائش کا پتہ پوچھ کر نمائش جا پہنچے گیٹ پر وہ پاس دکھا کر اندر جانا ہی چاہتے تھے کہ گیٹ کیپر نے پاس پر لکھا ہوا نام پڑھ کر جیسے کچھ چونکتے ہوئے کہا ۔

" آپ ہی ہیں پروفیسر مسعود ؟ "

ظاہر ہے کہ اِس قسم کے موقع پر صرف جھوٹ ہی بولا جاسکتا ہے ۔ ورنہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ پروفیسر مسعود نہیں ہیں ۔ تو ان کے نام کا پاس کیوں لائے اِس لئے بہت انکساری سے عرض کیا ۔

"اب میں اپنے منہ سے کیا عرض کروں"
گیٹ کیپر مجھے جواب دینے کے بجائے چیخنے لگا۔
"چودھری صاحب! یہ آگئے ہیں پروفیسر مسعود"
اور اس آواز پر ایک نہایت ہی حواس باختہ قسم کے بزرگ نے لپک کر میرا بازو تھاما اور اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا:

"ارے صاحب کمال کر دیا آپ نے بھی۔ آج نمائش کا پہلا دِن اور آپ نے آج ہی سارا پروگرام گڑبڑ کر دیا ہوتا۔ اگر ذرا دیر اور ہو جاتی۔ خلقت کا ہجوم اور آپ غائب!"

وہ یہ کہے جا رہے تھے اور گھسیٹتے لئے چلے جا رہے تھے اپنی کہتے تھے اور دوسروں کی سننے کو تیار نہ تھے۔ آخر ایک خیمے میں لے جا کر سرکس کے مسخروں والا لباس میری طرف اُچھال کر کہا۔
بس اب چٹکی بجاتے تیار ہو جاؤ۔ میں جب تک لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کراتا ہوں کہ آپ پہنچ گئے ہیں۔ "حضرت آپ کو لینے نمائش کے مینجر صاحب خود دوڑے گئے ہیں آپ کے گھر"
میں نے وہ مسخروں والا لباس غور سے دیکھ کر کہا
"مگر مجھے بتایئے تو سہی کہ ماجرا کیا ہے؟"
وہ گھبراہٹ کے ساتھ بولے

"اب ماجرا واجرا بعد میں بتایا جائے گا پہلے آپ یہ کپڑے پہنیے۔ جلدی سے کمال کر دیا آپ نے بھی۔ ذرا تو وقت کی پابندی کرنی چاہیئے انسان کو۔ اور اب بھی کھڑے منہ دیکھ رہے ہیں۔ خدا کے لئے اب دیر نہ کیجئے۔ لایئے میں اُتارتا ہوں آپ کے کپڑے۔

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں اُن حضرات نے میری شیروانی اُتار کر ایک طرف اُچھال دی اور جھپٹے قمیض کی طرف۔ میں نے ذرا بچاؤ کی کوشش کی تو ان کے تیوروں سے اندازہ ہوا کہ شاید قمیض پھاڑ ڈالیں گے۔ اِس لئے انہیں قمیض بھی اُتار لینے دی۔ اور پھر عرض کیا۔
"حضرت! آپ صرف ایک بات سُن لیجئے میری"
"وہ گھبرا کر بولے" کمال کرتے ہیں آپ یعنی آپ کو باتوں کی پڑی ہے۔۔ اور وہاں تماشائیوں کے ہجوم میں نمائش کے انتظامات پر ہنسی اُڑائی جا رہی ہے پہلے ہی دِن اگر ہماری ہوا اگھڑ گئی تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

اب میں نے ان سے صاف صاف کہا، "سنیئے جناب! میں مسخروں کا لباس ہرگز نہ پہنوں گا۔

وہ آستین چڑھا کر بولے۔

" پہنیں گے تو آپ کے فرشتے۔ ہم آپ سے یہ شرط پہلے ہی طے کر چکے ہیں کہ آپ کو یہ لباس پہننا پڑے گا۔ اور چہرے پر بھی کھریا لیپ کر سیاہ لکیریں کھینچیں گے۔

میں نے کہا۔

" میں آپ سے ایک بات عرض کر دوں کہ میں دراصل ...."

" وہ ایک دم کڑک کر بولے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیدھی اُنگلیوں گھی نہ نکلے گا! عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو تمہیں ذرا بھی خیال نہیں کہ ہماری کس قدر ہنسی اُڑ رہی ہے ہمیں دھوکے باز سمجھا جا رہا ہے کہ ہم اشتہار کچھ دیتے ہیں۔ اور دکھاتے کچھ ہیں۔"

میں نے پھر اصل واقعہ عرض کرنے کی کوشش کی ــــــــ "بھئی میری بات تو سنیئے۔"

مگر چودھری صاحب نے خیمے کے باہر منہ نکال کر کچھ لوگوں کو آواز دی۔

کلو! امام دین! بھوری!

اور فوراً ہی تین چار مشٹنڈے خیمے میں آموجود ہوئے تو چودھری صاحب نے نادری حکم دیا۔

" ہمیں یہ ذلیل حرکت کرانے پر تلے ہوئے ہیں انہیں زبردستی یہ کپڑے پہنا کر اور منہ پر کھریا ورا مل کر لاؤ وہاں۔ جب تک میں اعلان کراتا ہوں۔"

وہ تو یہ کہہ کر چلتے بنے اور یہاں ان قصائیوں نے واقعی زبردستی میرے باقی کپڑے اُتار کر مجھے وہ جوکروں والا لباس پہنا ہی دیا اور جس وقت وہ میرے چہرے پر چونا مل کر سیاہ لکیریں کھینچ رہے تھے۔ میں نے پھر بہت خوشامد سے کہا۔

" بھائی مجھ سے چاہے۔ جیسی قسم لے لو۔ میں پروفیسر مسعود نہیں ہوں۔"

ان میں سے ایک نے میرے سر پر سرخ پھندنے والی لمبی سی ٹوپی پہناتے ہوئے کہا۔

" یہ چکمہ تو خیر کسی اور کو دینا۔ نہیں ہو پروفیسر تو پیشگی روپیہ کیوں لیا تھا۔"

دوسرے نے کہا

" کوئی پوچھے ایسی ہی جان عزیز تھی۔ تو کس نے کہا تھا اس سولی پر لٹکنے کو؟"

اور اسی وقت میں نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان سُنا

"معزز شائقین! آپ کے انتظار اور اشتیاق کی واقعی حد ہوچکی ہے۔ لیکن ہم نہایت خوشی کے ساتھ اعلان کرتے ہیں۔ کہ پروفیسر مسعود گولڈ میڈلسٹ پہنچ چکے ہیں اور مینار کے پاس تشریف لا رہے ہیں۔ آپ زندگی اور موت کا یہ کھیل دیکھنے کو جمع ہو جائیں ایک سو چالیس فٹ اونچے مینار سے پروفیسر مسعود اپنے جسم میں آگ لگا کر حوض میں چھلانگ لگائیں گے۔ آیئے! آیئے! آیئے!!! پروفیسر مسعود آگئے! آگئے!! آگئے!!!

میرے سارے جسم میں پہلے تو کپکپی پیدا ہوگئی۔ پھر معلوم ہوا کہ رگوں میں خون منجمد ہوگیا اور بمشکل میں صرف یہ کہہ سکا۔

"چھلانگ!"

اور وہ چاروں قصائی ایک دم ہنس دیئے اور مجھے خیمے کے باہر دھکا دیا۔ یہ موقع غنیمت تھا۔ اس لئے میں سر پر پیر رکھ کر بھاگا ہی تھا کہ اُن میں سے ایک نے لپک کر میری گردن پکڑ لی اور مجھے جھنجوڑ کر کہا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟ بے ایمانی کی حد کر دی کہ اب عین وقت پر اپنا ریٹ بڑھانے کے لئے یہ حرکتیں کر رہے ہو۔"

اور اُسی وقت اُن خوفناک چودھری صاحب نے آکر کہا۔

"کان پکڑے بابا کل سے یہ کھیل موقوف لیکن آج تو یہ چھلانگ لگانی ہی پڑے گی۔"

میں نے پھر تقریباً زور دینے کے انداز سے کہا۔

چودھری صاحب اللہ جانتا ہے کہ میں پروفیسر مسعود نہیں ہوں۔ نہ میں نے کبھی چھلانگ لگائی۔ نہ میں چھلانگ لگا سکتا ہوں۔ میں بے موت مر جاؤں گا۔ میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔ بخدا میں پروفیسر مسعود نہیں ہوں۔

چودھری صاحب نے بہت ہی تعجب سے کہا۔ کیا مطلب؟ یعنی اب تم پروفیسر مسعود ہی نہیں ہو؟"

میں نے اُسی طرح گڑگڑاتے ہوئے کہا "اللہ جانتا ہے میں نہیں پروفیسر مسعود! میں تو ان کا ایک مہمان ہوں۔ میں ان کا یہ پاس اٹھا لایا تھا تماشہ دیکھنے کے لئے، اور یہاں آکر اس عذاب میں پھنس گیا۔ مجھے اپنے بچوں کا واسطہ بخش دیجئے!

عین اسی وقت لاؤڈ اسپیکر پر پھر اعلان ہوا۔

"ایک سو چالیس فٹ اونچے مینار سے چھلانگ! پروفیسر مسعود کا زندگی اور موت دونوں سے مذاق!
چوہدری صاحب نے یہ اعلان سُن کر میری اپیل خارج کر دی۔ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم پروفیسر مسعود ہو یا نہیں ہو اس سے کچھ نہیں ہوتا چھلانگ تو لگانی ہی پڑے گی ۔۔!

اور میرے سامنے بجلی کے رنگا رنگ قمقموں سے جگمگاتا ہوا۔ وہ ایک سو چالیس فٹ اونچا مینار تھا۔ جس پر چڑھنا ہی میرے لئے دشوار تھا۔ چڑھ کر پھاندنے کا تو سوال ہی نہیں۔ میں نے تو اسے دیکھ کر آنکھیں خوف سے بند کر لیں۔ لیکن چودھری صاحب نے مجھے اس مینار کی طرف دھکّا دیا۔ بلکہ تقریباً گھسیٹتے ہوئے مینار تک لے گئے۔ تماشائیوں نے مجھ کو دیکھ کر تالیاں بجائیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرے طائر روح کو اُڑانے کے لئے یہ تالیاں بجائی جا رہی ہیں۔ چودھری صاحب میرے ہاتھ میں ایک پٹرول کی بوتل اور ایک ڈبیا دیا سلائی کی دے کر کہا۔

"چڑھ جاؤ اس مینار پر اور یہ پٹرول اپنے اوپر چھڑک کر دیا سلائی دکھا دینا اور فوراً چھلانگ لگا دینا اس تالاب میں۔ بس چھٹی ہوئی۔"

چھٹی تو خیر واقعی ہمیشہ کے لئے ہونے والی تھی۔ لیکن میں اب بھی بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ تماشائی برابر تالیاں بجا رہے تھے۔ آخر میں نے طے کیا کہ ان تماشائیوں سے صاف صاف کہدوں کہ مجھے زبردستی پروفیسر مسعود بنایا جا رہا ہے اور میں یقیناً مر جاؤں گا۔ لیکن اس نقار خانے میں طوطی کی آواز سنتا ہی کون مجبوراً میں اس مقتل کی طرف بڑھنے لگا لیکن عین اسی وقت مجمع میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی اور کسی نے باآواز بلند کہا۔

"یہ آگئے ہیں۔ پروفیسر مسعود!"

اور چودھری صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھسیٹا اور دوڑاتے ہوئے خیمے میں لا کر جلدی جلدی یہ مسخروں والا لباس میرے جسم سے اُتار کر ایک نو وارد کو پہنانا شروع کیا۔ میں نے اس شخص کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ "لیجئے اب کسی اور کی شامت آئی۔ اب کسی اور کو پروفیسر مسعود بنایا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ دراصل یہ بھی پروفیسر مسعود نہ تھا بہر حال کوئی بھی ہو۔ ہماری بلا سے ہم تو موت کے منہ سے نکال ہی لئے گئے۔ اس نو وارد نے جلدی جلدی وہ لباس پہنا۔ اپنے چہرے پر عجیب و غریب نقوش بنائے اور دوڑا اس مینار کی طرف۔

جب میں اپنے ذاتی کپڑے پہن کر اور منہ صاف کر کے اس ہجوم میں پہنچا ہوں تو یہ نو وارد ایک سو

چالیس فٹ کی بلندی پر پہنچ کر اپنے جسم پر پٹرول چھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں کو پٹرول سے تر کرنے کے بعد دیا سلائی دکھا کر آگ لگائی اور اب جو پھاندا ہے۔ اس مینار سے تو تالاب میں ایک چھپاکا ہوا۔ اور فضا تالیوں کے شور سے گونج گئی نووارد تالاب سے نکل کر دوڑا خیمے کی طرف۔ اب میرے دماغ کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ اور دماغ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیّت پیدا ہونے لگی تھی۔ اس لئے سب سے پہلا سوال ذہن میں یہ آیا کہ یہ پروفیسر مسعود نہ سہی۔ مگر مسعود نے یہ کرتب دکھانا کب سے شروع کر دیئے؟ مسعود کی زندگی کے اس رُخ کی تو مجھے خبر ہی نہ تھی۔ میں ابھی اس بات پر غور ہی کر رہا تھا کہ چودھری صاحب نے آکر پھر مجھے گھیرا۔

"چلئے آپ کو پروفیسر مسعود بلاتے ہیں۔ جن کا پاس آپ چرا لائے ہیں۔"

میں خود اس معمّے کو حل کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ اس لئے بہت ہی مستعدی سے خیمے میں پہنچ گیا مجھے دیکھتے ہی اس نام نہاد مسعود نے کہا۔

"کیوں جناب! یہ میرا پاس آپ نے کہاں سے اُڑایا؟"

"میں نے کہا یہ آپ کا نہیں پروفیسر مسعود کا پاس ہے جو میرے دوست ہیں اور جن کے گھر میں آج ہی مہمان آیا ہوں۔"

اس شخص نے چونک کر کہا۔ "اچھا تو یہ آپ کا بستر وغیرہ رکھا ہوا ہے۔ میرے گھر میں؟"

میں نے کہا۔ "آپ کے گھر میں مسعود کے گھر میں؟"

اس شخص نے تالی بجا کر کہا۔ "ارے یار کہیں تم اس مسعود کے مہمان تو نہیں ہو جو کالج میں پڑھاتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔ جی ہاں! وہی مسعود۔"

اس شخص نے کہا۔ "تو یہ کہو نا۔ وہ تو میرے مکان کے سامنے والی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ میں بھی کہوں کہ پروفیسر اور کون ہو سکتا ہے؟" اور اسی وقت چودھری صاحب نے چائے کا ایک گلاس پروفیسر مسعود کو اور دوسرا مجھے تھما دیا اور میں ان سے یہ نہ کہہ سکا کہ چائے تو یہ ہے۔ مگر گلاس میں؟ "البتہ پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے "لسّی نہیں مل سکتی؟"

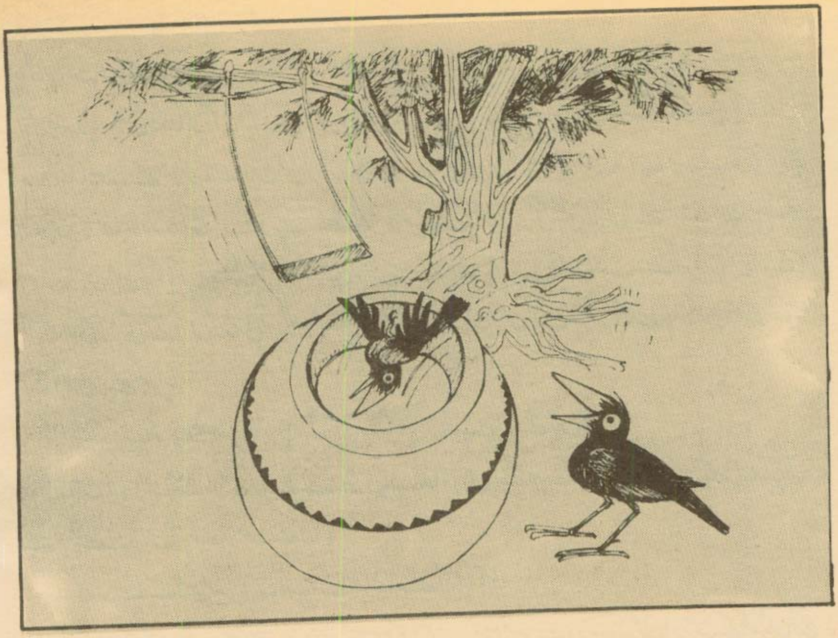

پرانا کوّا نئی کہانی

انعام اللہ شاہ

ایک دن کاگاجی نے قصد کیا کہ اپنے فرسٹ نہ سہی سیکنڈ یا تھرڈ کزن سے ہی مل لیا جائے۔ جو ان سے اتنا ہی دور رہتا ہے جتنا دور کا اس سے رشتہ تھا۔ تو رسم رشتہ داری نبھانے کے لئے کاگاجی نے پر پھڑپھڑا کر انہیں تولا، اور پھر مغرب کی سمت پرواز کر گئے۔ انہیں اپنے اڈّے سے ٹیک آف کیئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ انہیں یکایک یاد آیا کہ انہوں نے مناسب وقت کا انتظار کیئے بغیر پرواز کر دی ہے، یعنی اب عین دوپہر کا سورج سر پر تھا، اصولاً ان کو صبح سویرے یا شام ڈھلے نکلنا چاہیئے تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ کمان سے نکلا ہوا تیر، اور

گھونسلے سے نکلا ہوا کوّا، جب تک اپنا کام پورا نہ کرلیں واپس نہیں لوٹ سکتے۔ اب اڑتے اڑتے پیاس بھی لگنے لگی، کچھ دیر تو برداشت کیا۔ پھر کائیں کائیں کرکے باقاعدہ ہانپنے لگے۔ گرمی کی شدت سے چونچ سات کے ہندسے (۷) کی مانند ہیٹی کی پھٹی رہ گئی تھی۔ اور زبان باہر لٹکنے کو بالکل تیار تھی۔ اس عالمِ مجبوری میں کاگا جی نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، کوئی دریا، کوئی ندی، کوئی جھیل، کوئی تالاب۔ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں تھا۔!

آخر خدا خدا کرکے ایک جھونپڑی دور نظر آئی۔ کاگا جی نے سوچا کہ یہاں یہ جھونپڑی ہے تو یقیناً —— کوئی اللہ کا بندہ یہاں کیمپ کئے ہوتے ہوگا، اور یقیناً اس کے پاس پانی بھی ہوگا۔ بس کاگا جی نے چونچ کی سیدھ میں اس طرف کا رُخ کیا۔

جھونپڑی کے ساتھ ہی ایک بڑا سا درخت بھی تھا، کاگا جی نے اس درخت کی ایک موٹی سی شاخ پر لینڈ کیا۔! احتیاط کے طور پر اِدھر اُدھر کا تفصیلی معائنہ کیا، اور دیکھ کر اُسکی چونچ اپنی گنجائش سے کچھ زیادہ ہی چر گئی کہ درخت کے نیچے ایک گھڑا رکھا ہے، اور ظاہر ہے گھڑے میں پانی بھی ہوگا! کاگا جی نے ایک مرتبہ پھر تفتیشی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ جب پوری طرح اطمینان ہوگیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے اور کسی نے کوئی پھندا نہیں پھیلا رکھا ہے تو ایک ہی مختصر پرواز میں گھڑے کے منہ پر براجمان ہوگئے۔! اب جو اندر جھانک کر دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی، پانی تو تھا لیکن بہت نیچے۔ اب کیا کیا جائے؟ اچانک ان کو اپنے بھائی کوّے کا خیال آیا۔ جس کو کبھی ایسی ہی "سچویشن" درپیش آئی تھی، اور اس سمجھدار کوّے نے اپنا مسئلہ حل کرلیا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ کاگا جی اپنے اس بھائی کے طریقے پر عمل کرنے جھپٹ پڑے، یعنی کنکر لا لا کر گھڑے میں ڈالنے لگے، ابھی انہوں نے کوئی پندرہ بیس کنکر ہی ڈالے تھے، کہ ایک اور کوّا اِدھر آنکلا، اس نے یہ تماشا دیکھا تو چلّایا:

"کاگا جی۔ اے کاگا جی۔ ارے بھیّا جی۔ یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟"

کاگا جی جھلّا کر بولے "دیکھتے نہیں، اس گھڑے میں اتنا کم پانی ہے اور کوئی ترکیب بھی نہیں۔"

دوسرا کوّا بولا۔ "تم نے یہ کہانی غلط سنی ہے، اصل واقعہ وہ ہے جو کسی کتاب میں لکھا ہے۔ کہ جب کہانی کے کوّے نے کنکر ڈالنے کا سلسلہ شروع کیا تو کنکر ڈالتے ڈالتے شام ہوگئی۔ اب جو گھڑے میں دیکھا تو گھڑے میں کنکر ہی کنکر بھرے تھے۔ پانی سارا کنکروں نے چوس لیا تھا۔ بے چارہ دن بھر کا تھکا ہارا اور پیاسا تو تھا ہی، یہ دیکھتے ہی ٹپ سے گرا اور بیٹ سے مر گیا۔! اب تم بھی اپنا یہی حشر چاہتے ہو؟"

کاگا جی نے ایک آہِ سرد کھینچ کر کہا۔ "اے برادرِ خورد و کلاں و سیاہ۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

دوسرے کوّے نے کہا۔ "تم بس ایک لمبی سی رسّی کہیں سے لے آؤ۔"

کاگاجی نے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن یہاں ڈول کہاں سے آئے گا؟"

دوسرے کوّے نے بھنّا کر کہا "یار پہلے تم رسّی تو لاؤ۔ پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں!"

کاگاجی جلد ہی جھونپڑی کے اندر ہی ایک لمبی رسّی تلاش کر لی، دوسرا کوا دو پتلی پتلی لکڑیاں لے آیا، اب اس نے دونوں لکڑیوں کو رسّی کے دو ٹکڑوں سے باندھ کر ایک جھولا سا بنا دیا۔ اسی جھولے کا ایک سرا نیچے گھڑے میں لٹکا دیا۔ دوسرا گھڑے کے منہ پر اٹکا دیا۔

دوسرے کوّے نے اب فخر سے پَر اور دُم پھیلا کر کہا۔ "لو کاگاجی۔ تمہارے لئے ایک عمدہ قسم کا جھولا تیار ہے اب تم اس پر بیٹھ کر جھولا جھولتے ہوئے جی بھر کے پانی پی سکتے ہو۔ میں اوپر، دوسرا سرا پکڑے رکھوں گا!" کاگاجی نے خوشی سے دو تین فٹ اچھل کر پَر پھڑپھڑائے۔ اور دوسرے لمحے گھڑے کے اندر تھے۔

دوسرے نے ڈوری چھوڑ دی اور کہا "اچھا کاگاجی۔ ہم چلے تم ساری عمر یہاں پانی پیتے رہو۔"

کاگاجی نے جو یہ صورتحال دیکھی تو گھبرائے چلّا کر بولے "میری زندگی سے کیوں کھیلتے ہو۔ میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

دوسرا کوّا بولا "تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے مجھ پر اعتبار کیا۔ اور جو کوّا دوسرے کوّے پر اعتبار کرتا ہے اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اڑ گیا۔

اب بھی موقع ہے اسے روک لو ورنہ یہ میرے ہاتھ سے مارا جائے گا!

نیّر ابدالی

امریکی اور پاکستانی گھرانوں کا چُلبلا موازنہ

ڈنر تیار ہے

گھڑیال نے رات کے آٹھ بجنے کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی پورے گھر میں جیسے ہلچل مچ گئی۔

"آجاؤ بچّو۔ کھانا تیار ہے۔ تم لوگوں نے اپنے ہاتھ دھوئے؟ نہیں دھوئے تو فوراً دھو کر آؤ۔"

"بیگم یہ چاقو پھر کُند ہو گیا۔ میں تم سے کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ چاقو پہ دھار لگوا لو۔ مگر تم ہو کہ۔۔"

"شش، آہستہ بولیئے نا۔ بچّے سُن لیں گے۔"

"آؤ بچّو۔ بیٹھ جاؤ۔ شاباش۔ ڈان بیٹے اپنا نیپکن فرش سے اُٹھاؤ۔ جو، بیٹا آپ کا دُودھ کا گلاس میز کے کِنارے رکھا ہے اسے درمیان میں رکھو۔"

"ارے... میں تو سوپ لانا ہی بھُول گئی۔ یہ رہا سُوپ۔ ہاں آپ کافی ابھی پئیں گے یا بعد میں؟ جو بیٹا دُودھ تمہارے کپڑوں پہ گِر رہا۔ آرام سے پیو۔ ڈان تم کرُسی پر جھُول کیوں رہے ہو؟ ٹھیک طرح سے کھانا کھاؤ۔

شاباش"۔

"ڈینی ۔ کتے کا نام ۔ پیچھے ہٹو اور ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ ہاں بچّو! تمہارے اسکول کا فنکشن کیسا رہا بھئی؟"

"ڈیڈی بہت مزہ آیا۔ سارے پروگرام اچھے تھے۔ پروگرام میں ہم نے آپ کی کمی بہت محسوس کی"

"جو، بیٹا کیچپ کی بوتل کو ٹھیک طرح پکڑو اور ڈان تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ سوپ پیتے ہوئے منہ سے سُڑ سُڑ کی آواز نہ نکالا کرو۔ ڈان تم گوشت کیوں نہیں کھا رہے ہو بھئی سب اُسی طرح تمہاری پلیٹ میں رکھا ہُوا ہے"

کھانا خاموشی سے ختم ہونے کے بعد

"ڈان بیٹا تم میز صاف کرنے میں اپنے ڈیڈی کی مدد کرو۔ میں برتن دھوؤں گی اور جو انہیں الماری میں رکھے گا۔

یہ تو تھا ایک امریکی گھرانے کا قصّہ، جہاں رات کا کھانا، ہلکی پھلکی گپ شپ کے ساتھ کھایا گیا۔ اب ہم آپ کو ایک مشرقی گھرانے میں لیئے چلتے ہیں۔

"سنیئے، کھانا گرم کردوں؟"

شیخ صاحب دُکان بند کرکے گھر میں داخل ہوئے۔ ڈھیلی ڈھالی نیکر سنبھالتا ہُوا ایک بچّہ اُن سے آکر لپٹ گیا...

"ابّو آگئے... ابّو آگئے۔ ایک اور بچّے نے جو آنگن میں نل کے پاس کھڑا تھا اعلان کیا۔ شیخ صاحب کی بیگم کی گود میں ایک چھوٹا سا بچّہ بُری طرح چیخ رہا تھا۔

"مُنّی اری او مُنّی۔ تیرے ابّا آگئے ہیں۔ جلدی سے کھانا نکال دے۔ شیخ صاحب کی بیگم نے باورچی خانے کے دروازے پر کھڑی ایک نوعمر سی لڑکی کو کہا۔ وہ لڑکی آنگن میں بچھے تخت پر دسترخوان بچھاتی ہے۔ اس کے بعد جیسے تیسے کھانا لگاتی ہے۔ اُس دوران بیگم صاحبہ مسلسل آنگن میں موجود اپنے دونوں بیٹوں کی شکایت کرتی رہتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ شکوہ بھی کہ

"اے تمہارے لاڈ پیار نے کمبختوں کو بگاڑ دیا۔ نہ پڑھنے کے، نہ لکھنے کے... اری مُنّی جلدی کھانا لگا۔" "جی اچھا اماں۔ لگا تو رہی ہوں" مُنّی ہلکے سے بولی۔ تھوڑی دیر بعد مُنّی نے بتایا کہ کھانا لگ گیا ہے۔ شیخ صاحب تخت پر آکر بیٹھ گئے۔ بیگم صاحبہ بھی بچّے کو لیے ہوئے تخت پر آگئیں۔ دونوں بچّے اور مُنّی بھی بیٹھ گئے۔ ابھی شیخ صاحب نے سالن نکالا تھا اور چنگیر سے روٹیاں نکال رہے تھے کہ دونوں بچّے آپس

میں اُلجھ پڑے۔

" ابّا اس نے میری بوٹی لے لی "

" ابّا یہ جھوٹ بولتا ہے۔ بوٹی میری تھی۔ اس نے میری پلیٹ سے اُٹھائی ہے" شیخ صاحب نے بچّوں پر قہر آلود نگاہ ڈالی۔ دونوں بچّے سہم گئے۔ شیخ صاحب نے پہلا لقمہ مُنہ میں ڈالا۔

" توبہ... توبہ... اتنی مرچیں۔ یہ تم نے سالن پکایا ہے یا زہر؟ اور یہ روٹی کیوں ٹھیک طرح نہیں سینکی گئی۔ نیک بخت کیا گھر چلانے کے یہی ڈھنگ ہوتے ہیں؟" انہوں نے بیگم سے جرح شروع کر دی۔

" اے... یہ تمہارے بچّے میرے کہنے میں کب ہیں۔ جب دیکھو کھیل... جب دیکھو شرارت۔ ارے ان کو سنبھالوں تو سالن زہر ہو جائے اور سالن کو دیکھوں تو یہ آپس میں خون خرابہ کرنے لگیں۔ تمہی بتاؤ میری اکیلی جان کیا دیکھے کیا نہ دیکھے؟" بے چارے شیخ صاحب ابھی کوئی جواب دینے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ایک بچّہ بلبلایا۔

" ابّا اس نے میری بوٹی..." اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی شیخ صاحب نے اُسے ایک دھپ لگائی

" یہ لے بوٹی..." بچّہ لُڑھک کر نیچے گر گیا۔ بیگم چلّانے لگیں۔

" اے کیا بچّے کو مار ڈالنے کا ارادہ ہے؟ بھلا ایسے بھی کوئی مارتا ہے" وہ رونے لگیں۔ دوسرا بچّہ بھی سہم گیا۔

شیخ صاحب بیگم کو غصّے سے گھور کر دیکھتے ہیں اور دستر خوان سے اُٹھ جاتے ہیں۔ اُن کے اُٹھتے ہی نیچے گرا ہوا بچّہ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہو جاتا ہے اور شیخ صاحب اُسے پھلانگتے ہوئے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ ان کے جاتے ہی گرا ہُوا بچّہ تیزی سے اُٹھتا ہے اور اپنے بھائی کی پلیٹ میں رکھی ہوئی بوٹی کو جھپٹ کر دروازے کی طرف دوڑ لگا دیتا ہے۔

اُف یہ کرکٹ!

پیا آج آپ نے پھر مرچ زیادہ ڈال دی

سیرتِ طیبہؐ پر لکھی جانے والی معرکتہ الآرا کتاب جسے بطورِ خاص

بچّوں اور طالب علموں کے لیے **تحریر کیا گیا**

مشہور محقّق سیّد نظر زیدی کا تحفۂ خاص، جس نے صدارتی ایوارڈ حاصل کیا

سب سے بڑا انسان

- سیرتؐ کے موضوع پر بیش بہا معلومات
- عام فہم، آسان اور دلنشیں اندازِ تحریر
- ۱۹۰ حسین آفسٹ صفحات،
- دلکش کمپوزنگ، عمدہ طباعت
- چار رنگوں کا حسین اور لیمینیٹڈ سرورق

الحمدللہ

اس خوبصورت کتاب کو شائع کرنے کی سعادت ادارۂ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی نے حاصل کی.

ھدیہ:- (۴۰ چالیس روپے) (منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کی شکل میں بھجوائیں)

ڈاک خرچ ادارے کے ذمّے ہوگا.

نوٹ

طلبہ وطالبات اپنے ادارے کے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ بھجوا کر یہ کتاب آدھی قیمت میں حاصل کر سکتے ہیں

کتاب منگوانے کا پتہ:-

"سب سے بڑا انسان" گرین گائیڈ اکیڈمی ۔ ڈی ۔ ۱۱۲ ۔ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

ماڈرن آدمی نامہ

شاعر ، مجید لاہوری

آپ نے نظیر اکبر آبادی کا آدمی نامہ ضرور پڑھا ہوگا مگر یہ آدمی نامہ مجید لاہوری کا ہے اور آج کے دور کے آدمی کے بارے میں ہے۔ پڑھیئے اور لطف اندوز ہوئیے۔

مونچھیں بڑھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ڈاڑھی منڈا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
مُرغے جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
دَلیا پکا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اور "لنچ" اڑا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

وہ بھی ہے آدمی جسے کوٹھی ہوئی الاٹ
وہ بھی ہے آدمی ملا جس کو نہ گھر نہ گھاٹ
وہ بھی ہے آدمی جو اُٹھائے ہے سر پہ کھاٹ
موٹر میں جا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
رکشا چلا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں سجا سجا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں ٹھیلہ لگا لگا
ہر مال چار آنہ کی دیتے ہیں وہ صدا
پولیس اُن کا کرتی ہے چالان جا بجا
کیبن بنا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اس کو گرا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

رشوت کے نوٹ جس نے لیے وہ بھی آدمی
دو روز جس نے فاقے کیے وہ بھی آدمی
جو آدمی کا خون پیئے وہ بھی آدمی
جو پی کے غم کا زہر جیئے وہ بھی آدمی
آنسو بہا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اور مسکرا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

وہ "لالو کھیتوی" ہو کہ ہو "گولی ماردی" دفتر کا ہو کلرک کہ مسجد کا مولوی
ہو وہ "فقیر خان" کہ ہو وہ سیٹھ ٹیوب جی وہ بھی ہے آدمی کہ جو کرتا ہے لیڈری

جو بس میں جا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اور بس چلا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یہ جھونپڑے میں قید وہ بنگلے میں شاد ہے یہ نامرادِ زیست ہے وہ بامراد ہے
یہ "کارچور" قابلِ صد اعتماد ہے یہ "زندہ باد" اِدھر، وہ اُدھر "مردہ باد" ہے

نعرے لگا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
چندہ جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

لٹھے کے تھان جس نے چھپائے سو آدمی پھرتا ہے چیتھڑے سے لگائے سو آدمی
بیٹھا ہُوا ہے غلّہ دبائے سو آدمی راشن نہ کارڈ پر بھی جو پائے سو آدمی

صدمے اُٹھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
دھومیں مچا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

انتخاب۔ شبانہ مشتاق۔ تونسہ

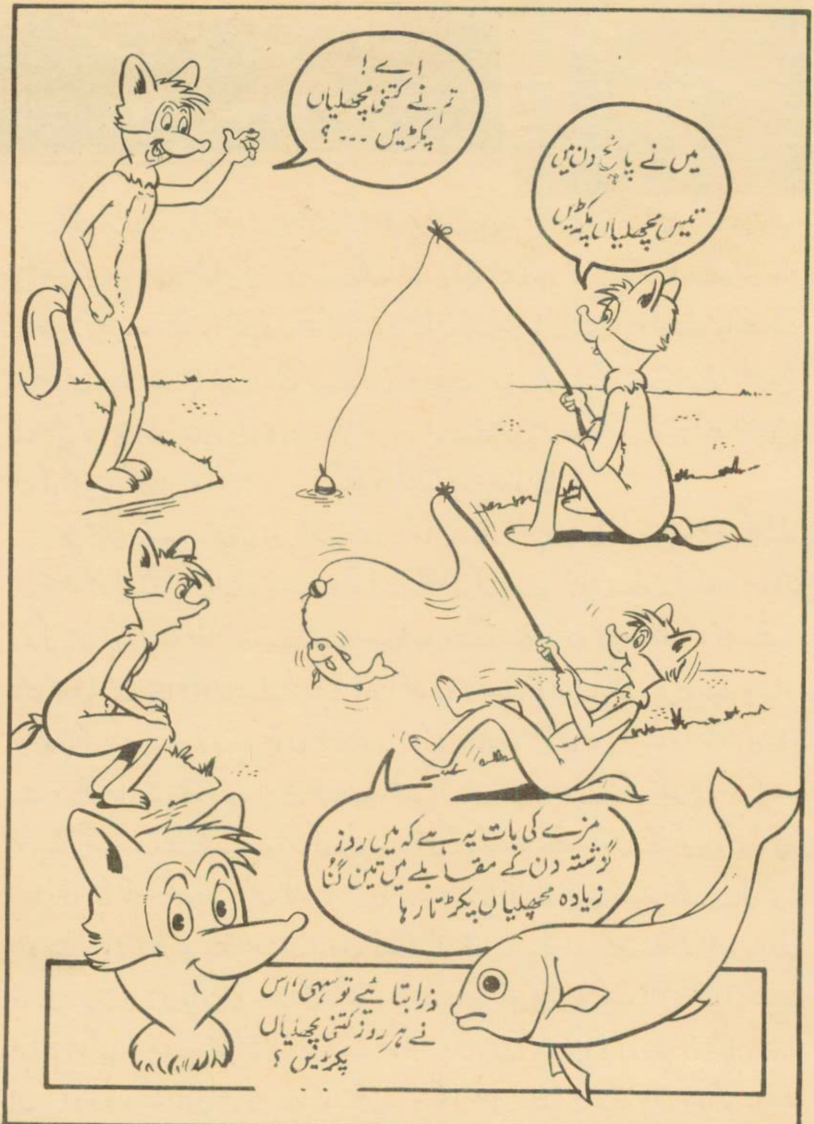
ارے! تم نے کتنی مچھلیاں پکڑیں ...؟
میں نے پانچ دن میں تیس مچھلیاں پکڑیں
مزے کی بات یہ ہے کہ میں روز گزشتہ دن کے مقابلے میں تین گنا زیادہ مچھلیاں پکڑتا رہا
ذرا بتائیے تو سہی اس نے ہر روز کتنی مچھلیاں پکڑیں؟

ایک سانحہ

قہقہہ نمبر کی تیاریاں مکمّل ہو چکی تھیں کہ آنکھ مچولی کے ایک مخلص اور مہربان دوست جناب محمّد حسین کے اچانک انتقال کی افسوسناک اطلاع آئی۔ جناب محمّد حسین کراچی کے ممتاز نیوز پیپرز ایجنٹ تھے۔ آنکھ مچولی کو کراچی کے بچّوں تک پہنچانے میں انہوں نے نہایت محنت اور خلوص سے حصّہ لیا تھا۔ وہ حج کرنے کی نیّت سے سعودی عرب گئے ہوئے تھے، لیکن مدینہ میں پہنچ کر اچانک اُن پر دِل کا دورہ پڑا اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جنّت البقیع میں ان کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن ؕ

محمّد حسین نیک، رحم دل اور غریب پرور انسان تھے۔ انہوں نے خود ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی لیکن اپنی محنت اور خدا کے فضل و کرم سے اُنہوں نے ترقی کی اور کاروباری زندگی میں اپنا ایک مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ کاروباری آدمی تھے۔ لیکن کاروبار میں بھی انہوں نے شرافت اور اخلاق کا معیار قائم کیا تھا۔ اپنی بے پناہ خوبیوں کی وجہ سے وہ دوستوں عزیزوں اور کاروباری حلقوں میں عزّت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ اپنے غریب رشتہ داروں کے نہ صرف دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے بلکہ ضرورت پڑنے پر اُن کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ اُن کے کردار کی نیکی انسانوں ہی تک محدود نہ تھی بلکہ چرند پرند سے بھی ان کی محبت بے مثال تھی۔ راہ چلتے باجرہ خرید لیتے اور پرندوں کے آگے ڈال دیتے اور کہتے تھے کہ ہمیں پرندوں کی بھی دعائیں لینی چاہئیں۔ ان کی ناگہانی موت سے شہر کراچی ایک اعلیٰ انسان سے محروم ہو گیا۔ جناب محمّد حسین نے اپنے سوگواروں میں ایک بیوہ اور چار بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ ادارہ آنکھ مچولی مرحوم کے لواحقین سے دِلی تعزیت کرتا ہے اور دعاگو ہے کہ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین) (ادارہ)

آئیے کرکٹ کھیلیں

نائلہ صدیقی

کرکٹ آج کل مقبول ترین کھیل ہے۔ گلی گلی، محلّے محلّے اس کھیل کے یادگار میچز کھیلے جاتے ہیں۔ کسی سڑک پر مستقبل کا نامور بیٹسمین چھکّے مار مار کر محلّے والوں کی بد دعائیں لے رہا ہے (محلے والوں کے کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹیں گے۔ تو وہ بد دعائیں تو دیں گے۔) کسی گلی میں کل کا مایہ ناز بالر اپنی بولنگ کے کرشمے دکھا کر ڈاکٹروں کی دعائیں لے رہا تھا۔ (بولنگ کے صدقے بہت سے زخمی کھلاڑی ہاتھ آئیں گے) اِس لئے آج ہم آپ کو اِس مقبول عام کھیل سے متعلق کچھ ضروری معلومات فراہم کر رہے ہیں۔ آیئے کرکٹ کا میچ کھیلنے کی تیاری کریں۔ میچ کھیلنے سے قبل یہ طے کر لیجئے آپ کو یہ میچ کھیلنا کہاں ہے؟ اگر آپ کے محلّے میں چند حاسد قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ جو آپ کو کرکٹ کھیلتا دیکھ کر جلتے ہیں اور آپ کی شکایتیں آپ کے والدین سے کرتے ہیں۔ اور والدین ان کی شکایتوں کی وجہ سے کھال کھینچ لینے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ تو ایسے حاسد کی پرواہ بالکل نہ کریں۔ فوراً سے پیشتر میدان کا رخ کیجئے۔ اب ٹیم بنانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ ٹیم بنانے کے لئے آپ

چن چن کر اعلیٰ برانڈ کے بے وقوف لڑکے جمع کرلیں۔ (اگر وہ لڑکے بے وقوف نہ ہوئے تو آپ کپتان کیسے بنیں گے۔ سمجھا کریں ناں) اب ان لڑکوں میں سے جو لڑکے منہ توڑنے کے ماہر ہیں۔ انہیں "بولرز" کا اعزاز بخشئے اور جو لڑکے شیشے و بلب توڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے انہیں "بیٹسمین" کی صف میں کھڑا کر دیں۔ اب رہا امپائر کا مسئلہ، تو بھئی اپنے محلّے کے سب سے بے ایمان لڑکے کو تاڑ لیجئے۔ اس کا مختلف طریقوں سے امتحان لیں اور جب اُس کی بے ایمانی میں کوئی شک نہ رہے تو اسے ایمپائر کا عہدۂ جلیلہ بخش دیں۔

اگر آپ کو کپتان بننا ہے تو اپنی ناک چڑھا لیں۔ مسکرانا چھوڑ دیں۔ پیشانی پر بہت سے بل ڈالیں اور لہجہ سخت کرلیں۔ کیونکہ اگر آپ ہنسنے مسکرانے والے نرم مزاج کپتان بن گئے تو آپ کی کوئی نہیں سنے گا۔ سب لڑکے اپنی مرضی کے مطابق کھیلیں گے اور وقت پڑنے پر آپ کو عزت اور احترام کے ساتھ اُٹھا کر میدان سے باہر پھینک دیں گے۔ آپ اپنی ٹیم کے لڑکوں کو خوب دبا کر رکھیئے۔ مگر تا مت دبا بیٹھے گا کہ ان کی جان ہی نکل جائے۔ ان کی جان نکلنے کی صورت میں آپ کو دوسری ٹیم بنانے میں مشکل پیش آئے گی۔ کیونکہ سارے بے وقوفوں کو تو آپ پہلے ہی ٹیم میں شامل کر چکے ہوں گے۔ خیر اب آپ دوسری ٹیم کو دوستانہ میچ کھیلنے کی دعوت دیں (یہ اور بات ہے کہ یہ دوستانہ میچ اختتام تک دشمنانہ میچ میں تبدیل ہو جائے) کھیل شروع کرنے سے پہلے ایک دو بے حد باتونی لڑکے جو بے مقصد اور ادھر اُدھر کی ہانکنے میں اپنا جواب نہ رکھتے ہوں انہیں کمنٹری کرنے کا فرض سونپ دیں۔ وہ کمنٹیٹرز یہ بتائیں گے کہ موسم کیسا ہے؟ اس میدان کی آب و ہوا کیسی ہے؟ کوّے بول رہے ہیں کہ نہیں؟ لیکن میچ کے متعلق ایک لفظ نہیں بتائیں گے چاہے کچھ ہو جائے۔ ایک آدھ ایکسپرٹ بھی مقرر کر لیجئے (جسے بُرا کھیلنے کی وجہ سے ٹیم سے نکال دیا گیا ہو) وہ کھیل پر اپنی ماہرانہ رائے پیش کرے گا اور وقتاً فوقتاً بہانے بہانے سے اپنی تعریفیں بھی کرتا رہے گا یعنی اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا کردار بھی انجام دے گا۔ اب "ٹاس"، کیجئے۔ اگر آپ کو بیٹنگ کا چانس مل گیا ہے۔ تو اپنے دو بیٹسمینوں کو امام ضامن باندھ کر دعاؤں کے سائے میں بطور "اوپنرز"، یہ گانا گاتے ہوئے رخصت کر دیجئے کہ

جا تجھ کو سکھی سنسار ملے

اب مخالف ٹیم کا ایک بالر آنکھیں بند کر کے اندھا دھند پاگلوں کی طرح بھاگتا آئے گا اور گیند بیٹسمین کے منہ پر دے مارے گا۔ اس طرح کھیل کا آغاز ہو جائے گا۔ جب ایک اوپنر ہاتھ منہ تڑوا کر "برے نصیب میرے" گاتا ہوا واپس آجائے تو باقی قربانی کے بکروں میں سے ایک بکرا یعنی بیٹسمین منتخب کر کے کریز میں بھیج دیں۔

اِس طرح پیچھے بعد دیگرے سارے بیٹسمین "ون بائی ون"، کے اصول پر عمل کرتے ہوئے زخمی ہو کر واپس پویلین آجائیں گے۔ اب آپ کی بولنگ کی باری ہے۔ آپ بولنگ شروع کیجئے اور مخالف ٹیم کے پرخچے اُڑا دیں۔ جب آپ کی مخالف ٹیم کے سارے لڑکے بے جان اشیاء میں اور ان کا جسم ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے تو میچ خودبخود ختم ہو جائے گا۔ اب اگر اس میچ میں آپ کی مخالف ٹیم جیت گئی ہے تو امپائر کی بے ایمانی کو لعن طعن کیجئے شکست کا سارا الزام امپائر کے سر ڈال دیں اور اُسے بُرا بھلا کہیں خوب کھل کے۔ لیکن اگر جیت آپ کی ہوئی ہے تو بس امپائر کو پھولوں سے لاد دیں۔ اُس کی ایمانداری اور فرض شناسی کے گن گائیں۔ اُس کی عظمت کو سلام کریں۔ اب تمام کھلاڑیوں پر تشدد کر کے اُن سے بیانات دلوائیں۔ جو کچھ اس قسم کے ہوں گے کہ "یہ میچ تو ہم اپنے کپتان کی وجہ سے جیتے ہیں۔ ہمارے کپتان عظیم کپتان ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

اِس کے بعد اپنی ساری ٹیم کو گن گن کر احتیاط سے ان کے سارے "پارٹس آف باڈی"، اکٹھے کر کے انہیں قریبی کلینک لے جائیں۔ جب سارے ٹکڑے اِن کے جسموں میں دوبارہ فِٹ کر دیئے جائیں تو آپ دوسرے میچ کا اعلان کر دیں۔ جلد ہی آپ کی شہرت دور تک پھیل جائے گی۔ اور انشاءاللہ جلد از جلد آپ کو قومی کرکٹ ٹیم میں شامل کر لیا جائے گا۔

لیکن ذرا ٹھہریے کیا سلیکشن بورڈ میں آپ کے کوئی ماموں، پھوپھا، خالو وغیرہ ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو کسی کو بنا لیجئے۔ محاورے میں تو ضرورت پڑنے پر گدھے کو باپ بنایا جا سکتا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟

ضروری اعلان

آنکھ مچولی کے بعض ساتھی گرین گائیڈ اکیڈمی کی کتابیں حاصل کرنے کے لیے نقد رقم یا ڈاک ٹکٹ تو بھیج دیتے ہیں لیکن اپنا پورا پتہ نہیں لکھتے جس کی وجہ سے ادارہ ان کی فرمائش پوری نہیں کر پاتا اور پھر ایسے خطوط فائل میں محفوظ کر دیے جاتے ہیں۔ ساتھیوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنا پورا پتا صاف صاف لکھ کر بھیجا کریں۔ ذیل میں چند ایسے ہی ساتھیوں کے نام درج ہیں۔ ان ساتھیوں کو چاہیے کہ اپنے مکمل پتے سے فوراً آگاہ کریں تاکہ انہیں کتابیں بھیجی جا سکیں۔

۱- مرسلین (سفر مبارک)
۲- ایم فیروز احمد
۳- مسرت جہاں (سفر مبارک اور تعلیم الاسلام)
۴- محمد طارق (راہ نما کے لیے دس روپے کے ٹکٹ نہیں ملے)
۵- منصور احمد قریشی (پتہ نہیں ہے)

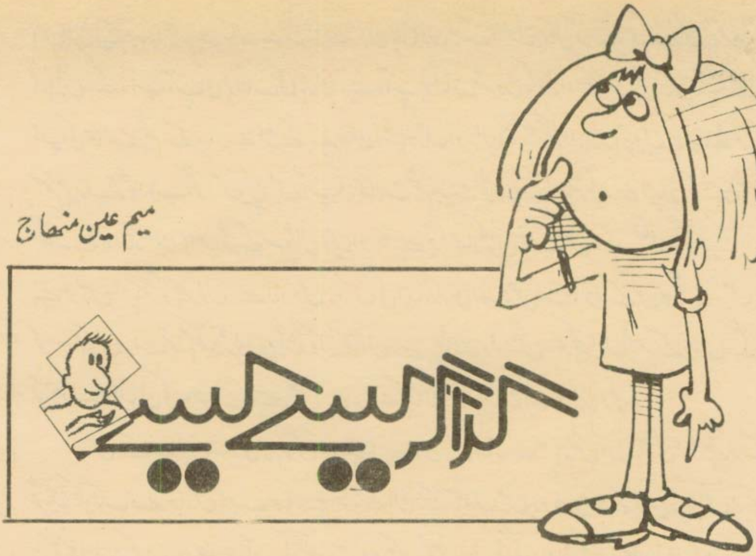

گداگر کیسے کیسے

میم عین منہاج

آج کل جدھر نظر اُٹھا کر دیکھیے گداگر نظر آتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ گداگروں میں بعض تو واقعی گداگر ہوتے ہیں اور بعض نہیں ہوتے مگر لگتے ہیں۔ گداگروں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں مثلاً مسکین گداگر، غمگین گداگر، فنکار گداگر، خاندانی گداگر وغیرہ۔ مسکین گداگر مسکین سی صورت بنا کر کھڑے

ہو جاتے ہیں ۔ بے چارے کسی سے کچھ نہیں کہتے ۔ بس ہر آنے جانے والے کی شکلیں تکتے رہتے ہیں ۔ گویا ۔ ؎ جو دے اُس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اُس کا بھی بھلا

ان کے گلے میں کشکول پڑا رہتا ہے جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال ہی دیتے ہیں یا پھر سڑک کے کنارے چادر بچھائے آنکھیں بند کرکے بیٹھے ہوتے ہیں اور سامنے ہر سائز کا سکّہ پڑا ہوتا ہے ۔ کبھی کبھار جب اپنی مالی حالت خراب ہوتی ہے تو جی چاہتا ہے اس میں سے اپنی ضرورت بھر کے سکّے اُٹھا کر رفو چکّر ہو جائیں ۔

غمگین وہ گداگر ہوتے ہیں جو چند غمناک قسم کی کہانیاں سُنا کر پیسہ بٹورتے ہیں ۔ ان کی کہانی عام طور پر اس قسم کی ہوتی ہے ۔

"جناب میں کل ہی پڈعیدن سے آیا ہوں کسی شخص نے میری جیب کاٹ لی ہے ۔ مجھے آج واپس لالہ موسیٰ جانا ہے اور میرے پاس کرایہ کے پیسے نہیں ہیں"۔ ان کی کہانیاں موقع محل کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں ۔ انہیں مجمعے میں مانگنا ہو تو "پیٹو یا رتنگ نگر" والی بس میں آواز لگاتے ہیں ۔

برادرانِ اسلام، السلام علیکم ! میں مزدوری کا کام کرتا تھا ۔ میری ٹانگ ایک حادثے میں زخمی ہو گئی میں کام کرنے سے معذور ہو گیا ہوں ۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچّے ہیں (ان کے بچّے ساری عمر چھوٹے ہی رہتے ہیں) جنھوں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا ۔ بھائیو ! میری مدد کرو ' مجھے اپنی کوئی پروا نہیں صرف اپنے بچّوں کے لیے مجبور ہوں "۔

گداگروں کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جنہیں فنکار گداگر کہا جا سکتا ہے ۔ یہ اپنی آنکھیں ٹیڑھی کرکے کھڑے ہو جاتے ہیں یا پھر اپنے بدن کو لرزاتے رہتے ہیں جیسے کرنٹ کے جھٹکے لگ رہے ہوں ۔ کچھ سرکس میں کرتب دکھانے والوں کی طرح اپنے ہاتھ یا پاؤں اس طرح ٹیڑھا کر لیتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے مگر وہ اپنے فن کا مظاہرہ داد کے لیے نہیں نوٹ کمانے کے لیے پیش کرتے ہیں ۔ ایک ایسا ہی فنکار گداگر اندھا بن کر بھیک مانگ رہا تھا ۔ "ایک روپے کا سوال ہے بھائی"۔ خوفِ خدا سے ڈرتے ہوئے ایک صاحب نے اُسے جلدی سے ایک روپیہ دے دیا ۔ پھر چونک کر بولے "تمہاری ایک آنکھ تو ٹھیک لگتی ہے "۔ گداگر نے معاملہ فوراً یہ کہہ کر سنبھال لیا "تو پھر آٹھ آنے ہی دے دو"۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ فنکار گداگروں کو فنکار لوگ بھی ٹکرا جاتے ہیں ۔ تب مقابلے کی چوٹ ہوتی ہے ۔ جیسے ایک گداگر نے ایک رحم دل شخص کو گھر سے باہر بلا کر اپنے معذور ہونے

کی دُکھ بھری داستان سُنائی ۔ان صاحب پر اس کہانی کا اتنا اثر ہُوا کہ بے چارے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے روتے ہوئے اپنے ملازم کو بلایا اور کہا: "اس کم بخت کو دھکے دے کر یہاں سے نکال دو اس نے رُلا رُلا کر میرا بُرا حال کر دیا ہے۔"

سب سے مزے کے گداگر وہ ہوتے ہیں جنہیں "جناب گداگر صاحب" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ بڑے رُعب اور دبدبہ سے بھیک مانگتے ہیں۔ اس قسم کے ایک گداگر نے ایک صاحب کو روکا اور بڑی گونج دار آواز میں گویا ہوئے۔

"دے! اللہ کے نام پہ دے" انھوں نے کچھ اتنے غصّے میں "دے کہا کہ وہ صاحب کانپ اُٹھے اور اُنھوں نے لرزتے ہاتھوں سے دس کا نوٹ نکال کر انھیں دے دیا۔ دیکھا یہ ہے بھیک مانگنے کا صحیح طریقہ!

ہاں ہم تو بھُول ہی گئے موسیقار گداگر بھی تو ہوتے ہیں۔ جو کوئی نہ کوئی ساز لے کر پھرتے ہیں۔ اور بڑے دلنشیں انداز میں ساز بجاتے ہیں۔ لوگ اُن کا مُدعا سمجھ کر انہیں کچھ نہ کچھ دے دیتے ہیں۔ کچھ الغوزہ اور کچھ بین بجاتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے چند تو گلے میں سانپ بھی لٹکا لیتے ہیں۔ تاکہ ان کی کچھ دہشت پھیلے اور لوگ باگ ڈر کر ہی کچھ دے جائیں۔

حیرت اس بات پہ ہے کہ ٹی وی والوں کی نظر ان فنکاروں پر کیوں نہیں پڑتی۔ وہ اگر ان عظیم فنکاروں کو موقعہ دیں تو اُن کو روزگار بھی مل جائے گا اور ٹی وی پہ موسیقی کا معیار بھی بلند ہوگا۔ ان موسیقار گداگروں سے صرف ایک ہی خطرہ ہے کہ پبلک کے رجحان کو دیکھتے ہوئے یہ بھیک ڈسکو میں نہ مانگنا شروع کر دیں۔

پیشگوئی کرنیوالا درخت

شمالی چین میں ایک حیرت انگیز درخت پایا جاتا ہے۔ دو سو سال پُرانا یہ درخت موسم کی پیش گوئی کے لئے بہت مشہور ہے۔ جب کبھی بارش ہونے والی ہوتی ہے۔ تو تین دن پہلے ہی اس کی چوٹی کے پتّے سرخ ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو پتا چل جاتا ہے کہ تین دن بعد بارش ہوگی۔

محمد مجاہد مصطفیٰ کوریہ، — عثمان کوریہ

ایک دن کا بکرا پیڑی کا میں

محمد رضوان

دو آنکھیں اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ اور ایک بیضوی چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ عالی گڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور جلدی سے سینگوں کو پکڑ لیا کیونکہ بکرا اس پر اس طرح جھکا ہوا جگالی کر رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی گھاس پھوس ہو۔

عالی زور زور سے چیخنے لگا بھائی جان پکڑیے بکرے کو... اتنے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا، یہ دھماکہ دراصل تھپیڑ کا تھا جو بھائی جان نے عالی کو دے مارا تھا کیونکہ عالی نے سوتے میں بھائی جان کے کان کو سینگ سمجھ کر پکڑ لیا تھا اور اتنی زور سے مروڑا تھا کہ بھائی جان بلبلا اُٹھے اور جواباً اس کے ایک زوردار

تھپیڑ رسید کردیا۔

عالی کئی روز سے سب گھر والوں کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ اس مرتبہ صرف بکرا عید ہوگی یعنی عید پر کاٹے میں حصّہ لینے کے بجائے اکیلے بکرے کی قربانی۔ عید میں چند روز باقی تھے اور عالی کی فرمائش زور پکڑ چکی تھی۔ اب تو نوبت یہاں تک آپہنچی تھی کہ عالی خواب میں بھی بکرے کو ہی دیکھ رہا تھا۔ اب تک عالی کئی لوگوں کے کان سینگ سمجھ کر کھینچ چکا تھا اور جواباً تھپیڑ بھی کھا چکا تھا۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر صبح کے ناشتہ کے بعد گول میز کانفرنس ہوئی جس کی صدارت والد محترم نے کی اور اس قرار داد میں والد صاحب کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور یہ قرار داد منظور ہو گئی۔ بکرا لانے کی ذمّہ داری مجھ غریب پر ڈالی گئی۔ مجھے پتا تھا کہ عالی بکرا منڈی میں میرا دماغ کھا جائے گا۔ چنانچہ میں بھیّا کو ساتھ لے کر منڈی پہنچا۔ رسّیوں میں بندھے ہوئے بکرے ہمیں اس حسرت سے دیکھنے لگے کہ ہمارا دل بھر آیا۔ اور جی چاہا کہ اُنہیں آزاد کر کے خود اُن کی جگہ کھڑے ہو جائیں۔ اگرچہ منڈی میں بے انتہا گندگی تھی مگر ہمارے محلّے سے پھر بھی صاف تھی۔ ہر طرف عجیب شوروغل اور افراتفری تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دوبارہ اپنے ہی گھر میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہر بکرا پاپ سنگر بنا ہوا تان سین کی روح کو تڑپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ منڈی کے کونے میں ایک منحنی سا بکرا دُنیا سے بے نیاز سر جُھکائے کھڑا تھا۔ بھیّا بولے "یہ بکرا یقیناً پچھلے جنم میں فلسفی ہوگا۔"

ہم نے تائید کی اور اُس کی طرف بڑھے۔ قریب گئے تو دیکھا کہ بکرے کے گلے میں ایک ضخیم کتاب لٹکی ہوئی ہے جس کے بوجھ سے بے چارہ جُھکا ہوا ہے۔ ہم نے مالک سے دریافت کیا تو بولا "حضور یہ اس کا شجرۂ نصب ہے، نوشیرواں کے دور میں اسی کے رشتے دار شیروں کے ساتھ ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ یہ تو شاہی بکرا ہے جو محض شہادت کے شوق میں اِدھر آکھڑا ہوا ہے..." بھیّا اس کی بات کاٹ کر بولے "وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ کمزور بہت ہے" وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا "اے صاحب! آپ اسے کمزور کہہ رہے ہیں حالانکہ یہ متقی اور پرہیزگار بکرا ہے۔ تین دن سے روزے رکھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ذرا دُبلا نظر آرہا ہے۔"

بھیّا کچھ مرعوب سے ہو کر آگے بڑھے اور بکرے کا منہ کھول کر دانت جو دیکھنے چاہے تو آدھی بتّیسی غائب تھی، ہم آگے بڑھ گئے۔

کچھ دُور گئے تھے کہ ایک خوبصورت سا خیمہ نظر آیا۔ باہر ایک بورڈ لگا ہُوا تھا۔ جس پر جلی حروف میں لکھا تھا: "ہدیہ رُونمائی پانچ روپیہ" ہم متجسّس ہوئے اور چوکیدار کو پانچ روپے دے کر اندر پہنچے تو ہکا بکّا

رہ گئے۔ ایک خوبصورت تخت پر ہاروں پھولوں سے لدا ایک بکرا جلوہ افروز تھا۔ دائیں بائیں دو خادم کھڑے مورچھل ہلا رہے تھے۔ بکرے کے سامنے موسمی پھلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ہمیں اپنے آدمی ہونے پر شرم آنے لگی۔ ہم شدید احساسِ کمتری کی حالت میں باہر آ گئے اور اپنی ہی حیثیت کا بکرا ڈھونڈنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہماری نظر ایک طرف سر جھکائے اور آنکھیں مُوندے ہوئے بیزار بکرے پر پڑی۔ ہم نے کمر پر ہاتھ رکھا تو اُس نے آدھی آنکھ کھول کر دیکھا اور بے پروائی سے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ ہاتھ لگانے پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہڈیوں پر کھال منڈھ دی گئی ہے۔ ہم نے بکرے والے سے اُسے کھڑا کرنے کو کہا تو وہ بولا۔

"بھائی دراصل یہ بکرا ایک افسر کے پاس پلا بڑھا ہے۔ اسی لیے اسے بیٹھے بیٹھے سونے کی عادت ہو گئی ہے یہ نہیں اُٹھے گا۔"

اسی طرح کا ایک اور بکرا بھی ہماری نظر میں آیا وہ کچھ لنگڑا تھا۔ مالک اس کے لنگڑے پن کو چھپاتے ہوئے بولا "اس بکرے کی تربیت ایک "ڈسکو ڈانسر" نے کی ہے۔ اسی لیے یہ بکرا چلتے چلتے ٹھمکتا ہے۔"

پھرتے پھرتے دوپہر ہو گئی۔ ایک کافی اچھے بکرے کو دیکھ کر ہم نے اس کے دام پوچھے تو اُس نے سترہ سو بتائے، لیکن ذرا سی حیل و حُجّت کے بعد وہ نو سو روپے لگانے پر تیار ہو گیا۔ ہم ٹھٹھک گئے کیونکہ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ اگر بکرے والا اچانک دام کم کر دے تو سمجھ جائیے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ہم نے بکرے کی اچھی طرح چھان پھٹک کی۔ مگر حیرت انگیز طور پر موصوف ٹھیک ٹھاک تھے۔

"اور جناب بکرے صاحب تشریف لے آئے" عالی خوشی سے چلّانے لگا اب تو بکرا عید ہو گی۔ ادھر ابّا جان بہت خوش تھے کہ سستے داموں اتنا اچھا بکرا مل گیا۔ عالی نے بکرے کو گھاس دکھائی تو بکرے صاحب کو کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ سمجھے شاید موصوف کا پیٹ بھرا ہے، لیکن شام میں بھی بکرے صاحب نے لفٹ نہ دی بلکہ متواتر ایک طرف گھورتے رہے تو ہمارے چچا ممتاز کی خدمات حاصل کی گئیں۔ چچا نے بھی ان کے آگے گھاس لہرائی تو اس کو کچھ اثر نہ ہوا آخر چچا نے ڈرتے ڈرتے معصومیت سے اس خدشے کا اظہار کر ہی دیا کہ "بکرا بینائی سے محروم ہے" چچا کے یہ الفاظ سنکر ہم بے ہوش ہوتے ہوتے بچے آخر فیصلہ کیا گیا کہ بکرے کو رات ہی کو قربان کر دیا جائے۔ جب اُسے ذبح کرنے کے لیے چھری لائی گئی۔ تو چھریوں کی چمک نے بکرے صاحب کے ہوش ٹھکانے لگا دیے اور وہ آنکھوں والوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگنے لگا اس طرح قربانی کے خوف سے اس کی بینائی بھی واپس آ گئی۔ اس طرح ہم نے بکرا عید منائی۔

عقلمند کون

نویلہ لیاقت

اس کا فیصلہ احمق ہی کر سکتے ہیں

بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ نوٹنگم کے قریب ایک گاؤں گوتھم کے لوگ اپنی بے وقونی کی وجہ سے مشہور تھے۔ کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جسے وہ حل کرنے کی کوشش نہ کرتے ہوں اور وہ بھی نہایت بے وقوفانہ طریقے سے۔ پوری دنیا اُن کی حماقتوں پر ہنستی اور اُن کا مذاق اُڑاتی تھی۔ اور اسی وجہ سے ان کو "گوتھم کے عقلمند لوگ" کہا جاتا تھا۔ لیکن انہیں اِس کی کوئی پروا نہ تھی کیونکہ وہ بہت سادہ لوگ تھے۔

ایک مرتبہ گوتھم کا ایک آدمی نوٹنگم کے بازار سے بھیڑیں خریدنے جا رہا تھا۔ وہ نوٹنگم کے پُل پر گوتھم کے ایک اور آدمی سے ملا جو بازار سے آ رہا تھا۔

"خوب ملے" انہوں نے ایک دوسرے سے کہا

"کہاں جا رہے ہو پڑوسی ؟ دوسرے نے پوچھا۔ جو بازار سے واپس لوٹ رہا تھا۔
"نوٹنگم بازار !! بھیڑیں خریدنے" پہلے نے جواب دیا۔
"بھیڑیں خریدنے ؟" دوسرا چلایا۔ "تم ان کو کس راستہ سے لے کر جاؤ گے"
"کیوں ؟" "اس پل کے اوپر سے" اس نے جواب دیا۔ جو بازار جا رہا تھا۔
گوتھم کا دوسرا آدمی جسکی عادت تھی کہ ہر چیز میں کچھ نہ کچھ عیب ضرور نکالنا، خوش نہیں تھا۔ وہ چلایا۔ "تم اس پل سے بھیڑیں لے نہیں جا سکتے لٹل ہڈ کی قسم۔"
"لٹل جون کی قسم میں اسی راستہ سے لے کر جاؤں گا"، پہلا طیش میں آ گیا۔
"تم لے کر نہیں جاؤ گے"، دوسرے نے چیخ کر کہا
"لیکن میں واضح کرتا ہوں کہ میں یہیں سے لیکر جاؤں گا۔" پہلے کا لہجہ اٹل تھا۔
وہ دونوں آدمی گوتھم کے پل پر ہی جھگڑنا شروع ہو گئے اور زمین پر زور زور سے چھڑیاں مارنے لگے جیسے بھیڑوں کا ریوڑ وہیں پر موجود ہو۔
"اپنی بھیڑوں کو ادھر ہی رکھو" دوسرا چلایا
"انہیں گزرنے دو" پہلے نے چیخ کر کہا۔ اور اپنی چھڑی سے محتاط رہو کہیں ایسا نہ ہو کہ میری بھیڑیں پل سے دریا میں گر پڑیں۔
اسی طرح دوڑتے بھاگتے۔ ادھر سے اُدھر وہ جھگڑتے رہے۔ یہاں تک کہ گوتھم کا ایک تیسرا آدمی وہاں پہنچا۔ وہ نوٹنگم مارکیٹ سے آ رہا تھا، اور اس کے گھوڑے کے اوپر آٹے کا ایک تھیلا رکھا ہوا تھا۔
وہ چند منٹ تک ان کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو اوپر کر کے کہا، "امن ! امن !
"امن ! امن !" "اچھے ساتھیوں۔ تمہیں عقل کب آئے گی ؟"
"مہربانی کر کے میری مدد کرو۔ یہ آٹے کی بوری اُتروادو۔ پھر میں تمہیں ایک مفید سبق سکھاؤں گا۔"
دونوں نے اسکی مدد کی۔ گوتھم کا تیسرا آدمی اُس پل کے کنارے گیا۔ تھیلے کا منہ کھولا اور سارا آٹا دریا میں پھینک دیا۔ آٹے کے تھیلے کو جھاڑتے ہوئے اس نے کہا۔
"اچھے پڑوسیوں !! مجھے بتاؤ کہ اب اس تھیلے میں کتنا آٹا باقی ہے ؟
"کچھ بھی نہیں،" دونوں نے ایک ساتھ کہا
"ٹھیک ہے،" تیسرا آدمی بولا "بالکل اتنی ہی عقل تمہارے احمق سروں میں ہے۔ تم لوگ اتنی دیر سے

لڑ رہے ہو اِن بھیڑوں کے لئے جو سرے سے یہاں موجود نہیں ہیں ۔

تو اب یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں ۔ اگر آپ فیصلہ کر سکیں کہ گوتم کے تینوں آدمیوں میں سے کون زیادہ عقلمند تھا ۔

(ماخوذ)

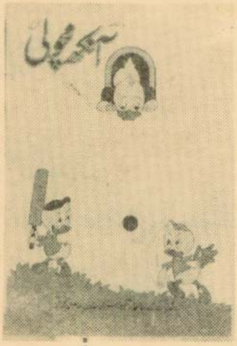

فضاؤں

میں

آنکھ مچولی

کبھی ہوائی سفر کا اتفاق ہو اور حُسنِ اتفاق سے یہ سفر پی آئی اے کے کسی خوبصورت سے طیّارے کے ذریعے ہو تو آپ یہ بات مت بھُولیے کہ اس جہاز میں آپ کا پسندیدہ ماہنامہ آنکھ مچولی بھی آپ کا ہم سفر ہے ۔ آپ دورانِ سفر مطالعے کے لیے فضائی میزبانوں سے آنکھ مچولی طلب کر سکتے ہیں ۔

گھر ہو یا سفر آپ کا ھم سفر " آنکھ مچولی "

ننھی نگارشات

نوخیز قلم کاروں کی مختصر تحریروں سے انتخاب

ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بارہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بددیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شدہ تحریر بھجوائے گا ہم اُس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھی نگارشات" کے آخری صفحے پر دیکھیے۔)

قائدِ اعظمؒ کی خوش مزاجی اور حاضر جوابی

مسعود الرحمٰن ، جہلم

بنیادی طور پر قائدِ اعظمؒ سنجیدہ انسان تھے مگر اُن کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مناسب اور موزوں موقعوں پر ہنستے ہنساتے بھی تھے۔ سلجھے ہوئے مذاق سے لُطف اندوز بھی ہوتے تھے۔

ابوالحسن اصفہانی اور ممتاز حسن جنھیں قائدِ اعظمؒ کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ فرخ امین جو آخری ایک برس اُن کے پرائیویٹ سیکریٹری بھی رہے تھے۔ اُن سب نے قائدِ اعظمؒ کی خوش مزاجی کا تذکرہ کیا ہے۔ فرخ امین نے قائدِ اعظمؒ کا سُنایا ہُوا ایک لطیفہ بھی لکھا ہے۔ جو درج ذیل ہے

"انگلستان کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی معمول سے زیادہ دیر تک ٹھہر گئی۔ ایک ہندوستانی جج نیچے اُتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے۔ اتنے میں ایک انگریز بھی گاڑی سے اُترا اور سیدھا جج صاحب کے پاس جاکر پوچھنے لگا کہ گاڑی کب چلے گی۔ جج نے کہا مجھے کیا معلوم۔ اس پر انگریز نے کہا تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔ کیا تم اسٹیشن ماسٹر نہیں ہو؟

جج نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ نہیں، میں اسٹیشن ماسٹر نہیں ہوں۔ انگریز بولا۔ اگر نہیں ہو تو ویسے نظر کیوں آتے ہو؟"

ایک مرتبہ قائدِ اعظمؒ لاہور میں اپنے ایک عزیز دوست اور مقتدر لیگی رہنما ملک برکت علی کے ہاں شادی کی ایک تقریب میں شریک تھے۔ کھانے کے بعد جو فرنی پیش کی گئی اُس میں غلطی سے چینی کے بجائے نمک مل گیا۔

جو مہمان فرنی کا چمچہ منہ میں ڈالتا، منہ بناتا میزبان پریشان اور شرمندہ تھے۔ قائدِ اعظمؒ مہمان کے آڑے آئے۔ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھے اور مہمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے "حضرات نمکین فیرنی پر متعجب نہ ہوں، ملک صاحب آپ کو اپنے گھر کا زیادہ سے زیادہ نمک کھلانا چاہتے ہیں"۔ اور بات ہنسی ہنسی میں ختم ہوگئی۔

کبھی کبھی قائدِ اعظمؒ کی حاضر جوابی حریفوں کے لیے طنز کی تلوار بھی بن جاتی تھی۔

قائدِ اعظمؒ اپنے زمانے کے بہت بڑے وکیل تھے۔ ایک دفعہ کسی مقدمے میں بحث لمبی ہوگئی۔ قائد کی یہ عادت تھی کہ وہ کیس کا تفصیلی تجزیہ کرتے تھے۔ انگریز مجسٹریٹ جھنجھلایا ہُوا تھا۔ چمک کر بولا۔

"مسٹر جناح! میں آپ کی باتوں کو ایک کان سے سُنتا ہوں اور دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں"۔ قائدِ اعظمؒ نے برجستہ جواب دیا۔

"جنابِ والا! آپ کے دونوں کانوں کی درمیانی جگہ غالباً خالی ہے"۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ ایک مقدمے میں بڑے اعتماد اور قدرے جارحانہ انداز سے اپنے دلائل پیش کر رہے تھے۔ انگریز مجسٹریٹ کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی، بھڑک اُٹھا تنبیہ کے لہجے میں بولا۔

"مسٹر جناح نہ بھولیے آپ کسی تھرڈ کلاس مجسٹریٹ سے مخاطب نہیں ہیں"۔ قائدِ اعظمؒ نے

بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"جنابِ والا! آپ کے سامنے بھی کوئی تھرڈ کلاس وکیل بحث نہیں کر رہا ہے۔"

ایک اور مقدمے میں ایک برخود غلط جج نے کہا: "مسٹر جناح ذرا زور سے بولیے میں سُن نہیں رہا۔" قائدِاعظمؒ نے کہا: "غور سے سُننا آپ کا کام ہے۔ میں بیرسٹر ہوں، ایکٹر نہیں۔"

لیکن قائدِاعظمؒ کی حاضر جوابی اور طنز کے اصلی جوہر سیاسی میدان میں کھلتے تھے۔ جب وہ اپنے طنز اور برجستہ گوئی کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔

کانگریسی لیڈر موہن داس کرم چند گاندھی نے مہاتما کا روپ دھار رکھا تھا اور مہاتما گاندھی کے نام سے معروف تھے۔ ان کے روحانی کمالات کا بھی ہندوؤں میں بڑا چرچا تھا۔ یوں تو وہ تمام ہندوستانیوں کا لیڈر ہونے کا دَم بھرتے تھے لیکن اندر سے خالص ہندو تھے اور ہندو مفادات کے کٹّر محافظ۔ قائدِاعظمؒ گاندھی کی منافقت کا حال جانتے تھے۔ اُن کی روحانی کرامتوں کے قصّوں سے بھی وہ مرعوب نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ بھی سیاسی ہتھکنڈے ہیں۔ دونوں سیاست کے میدان میں حریف تھے اور دونوں میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

ایک دفعہ گاندھی کے کسی چیلے نے اخبارات کو خبر مہیا کی کہ "کل شام مہاتما جی اپنے آشرم کی کُٹیا میں پرارتھنا (دُعا) کر رہے تھے۔ کہ باہر سے ایک بڑا سانپ کُٹیا میں آ گیا۔ مہاتما جی نہ اُس سے ڈرے اور نہ اُس کی پرواہ کی۔ برابر پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے مہاتما جی کے ارد گرد ایک دو چکّر لگائے اور جس طرح کُٹیا میں داخل ہوا تھا۔ اسی خاموشی سے باہر نکل گیا۔"

بس پھر کیا تھا کانگریسی حلقوں اور نیشنل پریس نے اس خبر کی خوب تشہیر کی۔ وقت بے وقت کوچہ و بازار میں عام جلسوں اور نجی محفلوں میں اس کے چرچے ہونے لگے۔

اس دوران ایک پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں نے قائدِاعظمؒ سے پوچھا: "قائدِاعظمؒ آپ نے سانپ اور گاندھی جی کی خبر اخبارات میں پڑھی ہے؟" آپ نے فرمایا ہاں پڑھی ہے۔ صحافیوں نے سوال کیا "آپ کا کیا خیال ہے یہ حقیقت ہو سکتی ہے۔ یا محض پروپیگنڈہ ہے"؟ جواب ملا: "ایسا ہونا ممکن ہے اور ہو سکتا ہے یہ بات صحیح ہو۔" ایک من چلے رپورٹر نے پوچھ لیا: "تو آپ سانپ کے طرزِ عمل کی کیا توجیہہ کریں گے؟"

قائدِاعظمؒ مسکرائے، آنکھوں میں ظرافت کی چمک پیدا ہوئی اور فرمایا۔

"یہ پیشہ وارانہ اخلاق کی بات ہے۔" مطلب یہ کہ زہریلے کیڑے اپنے جیسے زہریلے جاندار کو

نہیں ڈسا کرتے، اس سیاسی طنز کا جواب نہیں۔ جو لوگ گاندھی کی سیاسی چالوں سے واقف ہیں وہی اس کی داد دے سکتے ہیں۔

جون، ۱۹۳۶ء میں قائدِ اعظمؒ پنجاب مسلم لیگ کا پارلیمانی بورڈ قائم کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ اس وقت مسلم لیگ بالکل منظم نہیں تھی اور صوبے پر یونینسٹ پارٹی چھائی ہوئی تھی۔ قائدِ اعظمؒ کی ٹرین رات کو پہنچی کوئی ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ جیسے ہی قائدِ اعظمؒ نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا سارے ریلوے اسٹیشن کی لائٹ آف ہو گئی۔ اتفاقاً یا کسی کی شرارت تھی۔ مجلس استقبالیہ کے اراکین گھبرا گئے۔ قائدِ اعظمؒ نے اپنی بھرپور برجستہ آواز میں فرمایا: "دیکھا لاہور میں میرے قدم رکھتے ہی یونینسٹ پارٹی کا چراغ گل ہو گیا۔"

۵، اگست، ۱۹۴۷ء کو دہلی سے کراچی روانہ ہونے سے پہلے قائدِ اعظمؒ نے جو پریس کانفرنس بُلائی تھی۔ اُس میں ہندو صحافی مخالفانہ انداز میں سوال و جواب کر رہے تھے ایک نے پوچھا۔

"پاکستان کیا مذہبی ریاست ہوگی؟"

قائدِ اعظمؒ نے جوابی سوال کیا۔

"مذہبی ریاست کا کیا مطلب ہے؟ بغیر سوچے سوال نہیں کرنا چاہیے۔" اس پر ایک تیز ہندو صحافی نے اپنے خیال میں بڑا تیر مارا: "اس کا مطلب ہے "ملاؤں کی حکومت"۔ قائدِ اعظمؒ نے برجستہ جواب دیا۔

"پنڈتوں کی حکومت کے بارے میں کیا خیال ہے؟" (اشارہ پنڈت نہرو کی طرف تھا) اور کمرہ قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

۱۹۴۶ء میں قائدِ اعظمؒ اہم سیاسی مذاکرات کے لیے لندن تشریف لے گئے۔ قائدِ اعظمؒ پر سب کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ قبل از وقت کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے۔ جہاز سے اُترتے ہی اخبار لندن ٹائمز کے رپورٹر نے اُنھیں گھیرا۔

"جناب آپ کیا پیغام لائے ہیں؟" مقصد یہ تھا کہ قائدِ اعظمؒ کے رویّے کا کچھ کھوج لگایا جائے اُس روز اتفاق سے لندن کا مطلع صاف تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے فوراً جواب دیا: "میں آپ کے لیے خوشگوار موسم لایا ہوں۔"

پھر جائے مقام پر جانے سے پہلے ذرا سی دیر ٹھہرے تو اخباری نمائندے بیان لینے کے لیے جھپٹے۔ قائدِ اعظمؒ نے مُسکرا کر فرمایا

"دوستو! آج جو بیان مجھے دینا ہے وہ یہی ہے کہ فی الحال میں کوئی بیان نہیں دوں گا۔" یہ کہہ کر کار میں سوار ہو گئے۔

ڈاکوؤں سے انٹرویو

شاعر:- راجہ مہدی علی خاں

مرسلہ:- عبدالمتین، کراچی

جی اس بندے کو ویسے تو ابو داؤد کہتے ہیں

بہت سے مہرباں لیکن ابوالمردود کہتے ہیں

میرے والد فرید آباد کے مشہور ڈاکو تھے

خدا بخشے اُنھیں اپنے زمانے کے ہلاکو تھے
فرنکاباد کا تھانہ میرے نانا نے لُوٹا تھا
وہ گیارہ سیر کا تالہ اسی بندے سے ٹوٹا تھا
نہیں تھا چور کوئی شہر میں دادا کے پائے کا
چُرا کر گھر میں لے آئے تھے کتا وائسرائے کا
میرے پھوپھا چھٹے بدمعاش تھے اپنے زمانے کے
خُدا بخشے بہت شوقین تھے وہ جیل خانے کے

چچا میرے بہت مشہور تھے فنِ رذالت میں
مقدمہ ہار کر وہ ننگے ناچے تھے عدالت میں
میرے بھائی نے کی تھی فورٹونٹی چیف جسٹس سے
وہ جب بگڑا جلا دیں اُس کی مونچھیں اپنی ماچس سے
بڑے وہ لوگ تھے لیکن یہ بندہ بھی نہیں کچھ کم
خدا کا فضل ہے مجھ پر نہیں مجھ کو بھی کوئی غم
اجازت ہو تو یہ بندہ اشارے ہی اشارے میں
بتادے آپ کو تفصیل سے کچھ اپنے بارے میں
میں راجوں اور مہاراجوں کی جیبیں بھی کترتا تھا
چرس، کوکین اور افیون کا دھندا بھی کرتا تھا
میرے معمولی شاگردوں نے چودہ بینک لُوٹے تھے
میری کوشش سے باعزت بری ہو کر وہ چھُوٹے تھے
عدالت مانتی تھی میری قانونی دلیلوں کو
کرایا میں نے اندر شہر کے پندرہ وکیلوں کو
نہ انکم ٹیکس دیتا تھا، نہ سُوپر ٹیکس دیتا تھا
میں اُلٹا اپنی سب انکم پہ اُن سے ٹیکس لیتا تھا
جو دن میں نے گزارے شان و شوکت سے گزارے ہیں
ذرا کچھ ان دنوں ہی میرے گردش میں ستارے ہیں
مجھے کر لیں جو شامل آپ سب دو چار ڈاکوؤں میں
یقیناً چند دن میں آپ سب کھیلیں گے لاکھوں میں

بوڑھا مریض اور حکیم

مرسلہ:۔ فیصل احمد عبّاسی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بوڑھا آدمی بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہوگیا۔ بوڑھے کے گھر والے اس کی بیماریوں سے تنگ آگئے۔ لوگوں نے اُسے مشورہ دیا کہ فلاں گاؤں میں ایک بہت نامی گرامی حکیم ہے۔ وہ ہر بیماری کا علاج کرسکتا ہے۔ بوڑھے نے فوراً اپنا گھوڑا تیار کروایا اور حکیم کی طرف روانہ ہوگیا۔ حکیم صاحب نے بوڑھے کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور بولے "کس طرح آنا ہوا؟" بوڑھا بولا: "حکیم جی کیا بتاؤں۔ میرا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ کوئی ایسا علاج بتائیں کہ میں تندرست ہوجاؤں" حکیم جی بولے "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اس کی وجہ تمہارا

بڑھاپا ہے:" بوڑھا پھر بولا" حکیم صاحب اس کے علاوہ میری نظر بھی صحیح طرح سے کام نہیں کرتی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا رہتا ہے:" حکیم جی نے کہا" اس میں فکر کی بات نہیں یہ بھی بڑھاپے کی وجہ سے ہے:" بوڑھا کہنے لگا" اس کے علاوہ میری کمر میں سخت درد رہتا ہے:" "یہ بھی آپ کے بڑھاپے کی کارستانی ہے" حکیم صاحب نے جواب دیا۔ بوڑھا حکیم کی باتیں صبر سے سنتا رہا' پھر کہنے لگا" مجھے کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا" "بڑھاپے میں ایسا ہی ہوتا ہے" حکیم نے کہا۔ بوڑھے کو طیش آگیا۔ لیکن غصّے ضبط کرتے ہوئے بولا" حکیم جی! میں تھوڑا سا چلتا ہوں تو مجھے

سانس چڑھ جاتا ہے جسم میں تھکاوٹ ہوجاتی ہے اس کی وجہ کیا ہے" "بڑھاپے میں اکثر ایسا ہوجاتا ہے" حکیم اطمینان سے بولا۔

بوڑھے سے نہ رہا گیا۔ اپنی کمر پہ ہاتھ پھیر کر کہنے لگا" حکیم جی میری کمر بھی جھک گئی ہے" حکیم جی نے پھر وہی جواب دیا۔ اب تو بوڑھے سے نہ رہا گیا۔ اور غصّے میں کہنے لگا۔ حکیم صاحب رہنے دیجیے اپنی حکمت، آپ کو سوائے بڑھاپے کے اور کچھ بھی آتا ہے۔ بڑے حکیم لقمان بنے پھرتے ہو۔ میرے خیال میں تم نرے بدّھو ہو:" حکیم صاحب بوڑھے کو طیش میں آتے دیکھ کر بولے" بڑے میاں اتنی جلدی غصّے میں آنا بھی بڑھاپے کی وجہ سے ہے بوڑھا آدمی اپنے غصّے پر قابو نہیں کرسکتا:" بوڑھا حکیم کی یہ بات سُن کر پیر پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔

اللہ بچائے

مشا نسیہ فرحین ناظم آباد کراچی

"اللہ بچائے" کسی موصوف کا نام نہیں بلکہ یہ ہماری اپنی اختراع ہے جو ہم نے اپنے کرائے داروں کے لیے گھڑی ہے۔ خدا گواہ ہے جس دن سے ان کی تشریف آوری ہوئی ہے اس دن سے ہمارے گھر کا نظام درہم برہم ہوکر رہ گیا ہے۔ ان سے بچاؤ کے لیے کہیں جاؤ وہی سر پر سوار۔ کبھی بازار چلے جاؤ تو ان کا ساتھ ہونا ضروری۔ حتیٰ کہ رشتے داروں کے گھروں کو، تک انہوں نے نہیں چھوڑا ہے اور کبھی ڈھکے چھپے الفاظ میں منع کردیا جائے تو اس قدر آنکھیں پھاڑ کر دیکھیں گے جیسے ابھی غصّے سے آنکھیں نکل کر دیوار میں فِٹ ہوجائیں گی۔

اب بھلا آپ ہی انصاف کریں ہم جیسے شریف النّفس کے ساتھ ایسے چپکو لوگوں کا کہاں گزارا ہوسکتا ہے۔ رات ہی کی بات ہے ہم نے مشکلوں

سے اپنا دل بڑا کر کے اپنی پاکٹ منی سے ڈھائی روپے ڈھیلے کیے اور مونگ پھلی لے لی، نہ جانے اُن کے کون سے جاسوس کو خبر ہوئی رات کے گیارہ بجے ان کے تمام بچے آموجود ہوئے اور ہم سے مونگ پھلیاں چھین کر کھا گئے۔ مونگ پھلیوں سے شغف فرما چکے تو اُن کی بڑی بہن نے مُسکرا کر کہا۔

"اللہ، چھین جھپٹ کر کھانے میں کتنا مزا آتا ہے نا؟" اُن کی ایسی حرکتوں سے تنگ آکر ہم سب نے ابو کو الٹی میٹم دے دیا کہ وہ ان کرایہ داروں کو جلد از جلد نکالیں مگر وہ ابو ہی کیا جو ہماری مانیں۔ امی سے سفارش کرائی، پھر تو کیا مشکل تھا۔ امی نے صرف حکم دیا اور ابو جان نے منٹوں میں اقرار کر لیا کہ وہ آج ہی عبدالقیوم صاحب سے بات کریں گے۔

"اماں میں کہوں گھر پر کوئی ہے بھی" اپنی لمبی سی گردن نکال کر عبدالقیوم صاحب بولے۔

"جی ہاں ہیں... آئیے تشریف رکھیے" ابو نے حقِ میزبانی ادا کیا۔

"اماں تجھ سے ایک بات کرنی ہے پتے کی" انہوں نے راگ کھینچ کر رازدارانہ انداز میں کہا۔

"دراصل اپن کو بتاتے ہوئے شرم سی آرہی ہے خدا کی قسم" انہوں نے نظریں نیچی کر کے عجیب طرح سے گھورا۔

وہ دراصل اس مہینے کو میں اس قابل نہیں ہوں کرایہ دے سکوں، اماں سُن رہے ہونا"

"جی ہاں جی ہاں" ابو کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ ہمارا چھوٹا بھائی سلمان جو ان کی بات سن کر زیادہ ہی جذباتی ہو کر پیچ و تاب کھا رہا تھا اُن کو ایک ٹک گھورنے لگا۔

"اماں ایسے کیوں گھور رہا ہے قسم خدا کی ڈر لگ رہا ہے اگر تجھے ایسے دیکھنے کی عادت ہے تو ابا سے کہہ کر چشمہ لگوا لیو، قسم خدا کی تیری آنکھیں دیکھ کر خوف آرہا ہے"

ابو جو کہ ان کا ارادہ سُن کر پہلے ہی سوچوں میں گم تھے کچھ سوچ کر بولے "عبدالقیوم صاحب دراصل میں گھر خالی کرانا چاہتا ہوں آپ جلد از جلد گھر خالی کر دیں"

"اماں مذاق تو نہیں کر رہا مجھ سے" انہوں نے بلاوجہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلائی اور اس بات کو مذاق جان کر تیزی سے اوپر پہنچ گئے۔

"اے آپا میں کہتی ہوں کہاں ہو تم" عبدالقیوم صاحب کی بیگم اپنا غرارہ سنبھالتے ہوئے سیڑھیوں سے نمودار ہوئیں اور اپنا بے سُرا راگ الاپنے لگیں۔

"جی فرمائیے" امی جو کہ ان کے چیکو پن سے پہلے ہی نالاں تھیں تکلف سے بولیں۔

"وہ میں کہوں بھائی صاحب بہت مذاق کرنے لگ گئے ہیں۔ یہ کہہ رہے تھے کہ آج تو مذاق کی حد پار کر گئے اور گھر خالی کرانے کا کہہ رہے تھے۔"

"جی وہ مذاق نہیں حقیقت ہے" امّی نے غصّے کا اظہار کیا۔ وہ بھی شاید امّی کے خطرناک تیور سمجھ گئی تھیں۔ اسی لیے امّی کو چھوڑ کر ہماری جانب متوجّہ ہوئیں۔

"اے چھمّو، کلّو، نکٹو، لالی دیکھ تو سہی تیری باجی ناراض ہیں اپنّ سے قسم خدا کی" عبدالقیوم صاحب کی بیگم کا جلانا تھا کہ ان کے سارے بچّے ہم سے ایسے چپکے کہ صمد بونڈ بھی کیا چپکتا ہوگا۔

"اُف خدایا ہم کسی سے ناراض نہیں" ہم نے قدرے چیخ کر جھنجھلاتے ہوئے کہا مگر وہ کہاں سننے والے تھے۔

"کیا ہم اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دے دیں کہ ہم ناراض نہیں ہیں" اب ہم نے اپنے اندر عاجزی و انکساری پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"جاؤ ناراض ہم نہیں ہمارے بھائی جان ہیں شاید" ہم نے اس طوفانِ بدتمیزی کا رُخ بھائی جان کی طرف موڑنا چاہا جسے دیکھ کر بھائی جان نے میراتھن ریس کا آغاز کیا۔ خیر لاکھ جتن کے بعد وہ ہم سے الگ ہوئے اور کچھ دیر ہمارے ہاتھ جوڑنے کے بعد وہ اُوپر پہنچ چکے تھے۔

"بھائی جان آپ تو ہمیشہ بڑے جاسوسی ناولیں پڑھتے ہیں کوئی مشورہ دیجیے نا" ہم نے طعنہ دیا۔

"جاسوسی ناولوں میں چپکو لوگوں کے بھگانے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا جاتا" انھوں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"تو اب ہم کیا کریں؟"

"صبر" ابّو نے ہمیں گھورتے ہوئے کہا "مگر کب تک؟" ہم نے صدائے احتجاج بلند کرنا چاہی۔

"دو سال کے ایگریمنٹ کے خاتمے تک"

"کیا... یعنی پورا ایک سال نو مہینے؟" ہماری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اور منہ سے صرف اتنا ہی نکلا "اللہ بچائے"۔ اُس دن سے آج تک ہم اس کا وِرد کرتے چلے آرہے ہیں، مگر اللہ کو بھی شاید ہمارے صبر کا امتحان لینا مقصود ہے۔

ساتھیو! اب آپ کے دل میں بھی ہمارے لیے ہمدردی ہوگئی ہوگی ویسے یہ تو ہم آپ کو کچھ ٹریلر دکھا رہے تھے۔ پورا شو تو جب چلتا ہے جب عبدالقیوم صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ فلم دیکھنے جاتے ہیں اور بچّے ہمارے گھر اپنی فلم دکھاتے ہیں۔

بس اب آپ سب ہمارے لیے دعائے خیر کریں کہ یہ ماہ و سال پَر لگا کر اُڑ جائیں اور ہمارے ساتھ گزرنے والی ظالم کی داستان کا آخری سین جلدی سے آئے... ویسے اگر کسی ساتھی کے پاس ان کو بھگانے کا کوئی مفید مشورہ ہو تو ہم تک فوراً پہنچا دے تاکہ ہمیں "اللہ بچائے" کے وِرد سے چھٹکارا حاصل ہو اور ہم بھی کہانیوں کے شہزادہ شہزادی کی طرح ہنسی خوشی رہنے لگیں۔

موٹا لڑکا

اک لڑکا تھا گول مٹول
پیٹ تھا اُس کا جیسے ڈھول

گھی کے پراٹھے تھا وہ کھاتا
بکرے کا بھی گوشت اُڑاتا

کھا کھا کر ہو گیا تھا موٹا
رات بڑی مشکل سے سوتا

چلتے چلتے وہ گر پڑتا!
گرتے ہی وہ زور سے روتا

وہ تھا جیسے موٹا آلو!
کہتے تھے سب اس کو بھالو

بچو! زیادہ کبھی نہ کھاؤ
کم کھاؤ صحت کو بناؤ

رانا گلزار احمد، علی پور (مظفر گڑھ)

تخریب کار بکرا

حامد علی شاہد، لاوہ

عید قرباں کا دن تھا اور صبح کا وقت، یکایک بھیں بھیں کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی. میں ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا اور حیران و پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"تمہارے دوست کے بکرے کی آواز ہے"۔ امی نے مجھے گھبرایا دیکھ کر مسکرا کر کہا۔ بکرے کی آواز سے تو خیر ہم واقف تھے مگر یہ آواز کچھ عجیب سی موٹی سی تھی۔ امی نے بتایا تو ہم نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر یہ آواز بکرے کی ہے تو پھر وہ بکرا کیسا ہوگا؟ بس صاحب یہ سوچتے ہی ہم نے بکرا دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ فیصلہ کیا؟ گویا بھوت سوار ہو چکا تھا اور وہ بھی بغیر ٹکٹ کے!

ہم نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور چل دیے اپنے دوست کے پاس۔ دوست کے گھر آ کے پہنچتے ہی ہم نے آواز لگائی "اسلم... اسلم"۔

"مم میں میں" اندر سے پھر وہی مضحکہ خیز آواز آئی "ہائیں... یہ اسلم کی آواز کو کیا ہو گیا ہے" ہم نے دل ہی دل میں کہا "کہیں اسلم ہی بکرا نہ بن گیا ہو؟"

تصدیق کے لیے ایک بار پھر آواز لگائی اس بار بھی جواب نہ آیا تو ہم حیران و پریشان ہو کر گھر کی طرف چلنے ہی والے تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور اسلم باہر آ گیا "یہ... یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا تھا؟" ہم نے اُسے دیکھتے ہی حیرت سے چلّا کر کہا "کس کی آواز کو؟"

"بھئی تمہاری اور کس کی! ہم جب بھی آواز دیتے جواب میں بکرے کی آواز آتی تھی"، ہم نے اسلم کو چڑانے کے لیے کہا...

"ارے بے وقوف! یہ ہمارا بکرا ہے، جب بھی تم آواز دیتے تھے تو وہ تمہیں اپنی برادری... اُس نے ہنستے ہوئے کہنا چاہا، لیکن ہم نے درمیان سے اُس کی بات کاٹ دی "چھوڑو اس بات کو... ہم تمہارا بکرا

دیکھنے آئے ہیں" ہم نے اپنی خواہش ظاہر کر دی۔

"حضورِ والا آپ کی تشریف آوری ہمارے لیے باعثِ عزت ہے۔ ہمارا بکرا دیکھ کر آپ کو مزہ ہی آجائے گا۔ شاہی بکرا ہے کوئی ایسا ویسا نہیں۔ اس کی ماں دوسری جنگِ عظیم میں گولی لگنے کی وجہ سے زخمی ہو گئی تھی۔ اس کا باپ مغلوں کے شاہی دسترخوان کی زینت بن چکا ہے۔ انگریز اس کے بھائی کو۔۔۔ ہندوستان سے جاتے ہوئے ساتھ لے گئے تھے۔ ہندوستان کی حکومت نے اُس کی واپسی کے لیے پورا زور لگایا لیکن انگریز نہ جانے کہاں لے گئے تھے۔ اس کی بہن مُغلوں کی پسندیدہ بکری تھی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ جب۔۔۔" اسلم کہتا چلا گیا۔

"بس۔۔۔ بس۔۔۔ یہاں میں تمہاری فضول تاریخ دانی سے واقفیت حاصل کرنے نہیں آیا۔ میں صرف بکرا دیکھنے آیا ہوں اگر دکھانا ہے تو یہیں لے آؤ" ہم نے جھنجھلا کر کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی" یہ کہتے ہی وہ اندر چلا گیا اور چند لمحوں بعد واپس آگیا۔ بولا "اختر لا رہا ہے!"

ہماری پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ اچانک اسلم چلّایا "قبلہ گاہی! حضورِ والا! ایک شرارتی اور نافرمان بکرا اختر کو جُل دے کر آرہا ہے۔ وہ آپ کے ساتھ گستاخیاں کرنے کی منحوس کوشش کرے گا۔ اگر بروقت اس کی سرکوبی نہ کی گئی تو چند لمحات میں حضورِ والا صفات کی جانِ مبارک کو ایک عظیم نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔۔۔ اس لیے ایک ادنیٰ غلام کی طرف سے گزارش ہے کہ اپنے مبارک قدم۔۔۔"

"یہ تم کیا بک رہے ہو؟" ہم نے اُن کی بک بک پر جھنجھلا کر کہا۔۔۔۔۔ اچانک ہمیں پیچھے سے زوردار ٹکر لگی اور ہم پرواز کرتے ہوئے اسلم سے ٹکرائے اور چھپاک کی آواز کے ساتھ گندے کیچڑ میں جا گرے آپس میں سر ٹکرانے کی وجہ سے ہمیں نظامِ شمسی کا پورا خاندان نظر آگیا تھا۔

"بکرے کو پکڑو" پیچھے سے اختر نمودار ہوا اور چلّا کر بولا۔ ہم تیزی سے کیچڑ سے اُٹھے اور بکرے کے پیچھے دوڑے۔ آگے جا کر بکرا ایک ریڑھی والے کی سبزیوں پر منہ مارنے لگا۔ وہ بے چارہ اس ہاتھی نما بکرے کو دیکھتے ہی ریڑھی چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ ہم جب بکرے کو پکڑنے اس کے قریب پہنچے تو بکرے نما ہاتھی نے یا ہاتھی نما بکرے نے جونہی سر اُٹھا کر ہمیں گھُورا، ہمارا سارا خون خُشک ہو گیا اور ہم سکتے کے عالم میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اچانک بکرے نے اپنا سر جھکایا اور ہمیں ٹکر مارنے کے لیے

آگے بڑھا، اُس کے چھُری نما سینگ دیکھتے ہی ہمارا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو گیا۔ اور اگلے ہی لمحے ہم وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پہلے یہ پوزیشن تھی کہ ہم بکرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے اب یہ پوزیشن تھی کہ بکرا ہمارے پیچھے دوڑ رہا تھا بھاگتے ہوئے جلد ہی ہم اسلم کے قریب پہنچ گئے وہ ایک طرف کھڑا کانپ رہا تھا اور "جل تو جلال تو! آئی بلا کو ٹال تو" کا وِرد کر رہا تھا۔ بکرے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر سب کچھ بھول کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ "ابے اختر بڑے محمد علی کلے بنتے ہو بکرے کو پکڑ دو تو ہم جانیں" اختر کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم نے للکار کر کہا، معلوم نہیں اس کا چنگیزی خون جوش میں آگیا تھا۔ یا اُسے ہم پر ترس آگیا تھا بہرحال وہ بھاگ کر چارپائی پر چڑھ گیا اور جو نہی بکرا پاس سے گزرا اُس پر چھلانگ لگا دی۔ مگر لگتا تھا کہ بکرے نے اس کام میں باقاعدہ ٹریننگ لے رکھی تھی۔ چنانچہ بکرا اختر کے نیچے سے نکل گیا۔ اور بے چارہ اختر زور سے کیچڑ میں گرا "خُدا تیرا بیڑا غرق کرے... اُف اللہ! لگتا ہے ہڈی ٹوٹ گئی ہے" اُس نے کیچڑ میں پڑے پڑے پاؤں پکڑ کر کہا اور بکرے کو صلواتیں سُنانے لگا۔ آگے جا کر بکرے نے بریک لگائے، ٹرن لیا اور اختر کی طرف مُڑ گیا۔ لگتا تھا جیسے اُس نے صلواتیں سُن لی ہوں، اُدھر جو اختر پاؤں پکڑے چیخ رہا تھا بکرے کے تیور دیکھ کر اور سارا درد بھُول کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہُوا۔ اِدھر ہم نہ جانے کتنی دیر تک مسلسل بھاگتے رہے۔ مُڑ کر دیکھا تو پیچھے بکرے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ یہ دیکھ کر ہم نے آگے دوڑتے ہوئے اسلم کو اس بات سے مطلع کیا۔ وہ تیزی سے مُڑا اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہم نے اُسے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا اور خود اُس طرف دوڑ پڑے جس طرف ہمیں بکرے کے جانے کا اندازہ تھا۔ سانس ہمارے پھُولے ہوئے تھے لیکن پھر بھی ہم دوڑے جا رہے تھے...

اچانک ہماری نظر ایک ہجوم پر پڑی... قریب گئے تو ہر طرف پھل اور سبزیاں بکھری پڑی نظر آئیں اور ایک طرف ایک ریڑھی والا زخمی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ ایک تخریب کار بکرا اس ریڑھی والے کی ریڑھی کو گراتے ہوئے گزر گیا اور ساتھ ساتھ اس کو بھی زخمی کر گیا اُس کی سرکوبی کے لیے پولیس کا ایک تازہ دَم دستہ اُس کے پیچھے گیا ہوا ہے۔ یہ سُنتے ہی ہمیں بکرے کی فکر پڑ گئی اس لیے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے "فکر نہ کرو! پولیس اس بکرے کو نہیں پکڑ سکتی... اس بکرے نے تو پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مل کر مرہٹوں کو شکست دی تھی... پولیس اس کے آگے کیا چیز ہے" دوڑتے ہوئے اسلم نے ہمیں تسلی دی۔ لیکن ہم بھاگتے رہے دوڑتے رہے مگر بکرا نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر واپس اسلم کے گھر آ گئے۔ گھر پہنچتے ہی ہم حیرت سے اُچھل پڑے کیونکہ سامنے تخریب کار بکرا ہمیں گھُور رہا تھا

پتا چلا کہ جب بکرا اختر کے پیچھے دوڑا تھا تو وہ سیدھا گھر آگیا اور بکرا بھی اُس کے پیچھے گھر آگیا اس طرح اُسے آسانی سے سب نے مل کر گرفتار کر لیا۔ ہم نے دِل ہی دل میں اختر کی ذہانت کو داد دی۔ یکایک ہماری نظر اسلم پر پڑی تو ہم اُچھل پڑے کیونکہ اس کے گلے میں قمیض کی جگہ ایک چھوٹا سا کپڑے کا ٹکڑا لٹک رہا تھا۔ جب کہ شلوار کی جگہ نیکر نے لے لی تھی۔ لیکن ہمارے گلے میں تو قمیض کا بہرے سے نشان تک نہ تھا۔ ہاں! البتہ شلوار کی ایک ٹانگ موجود تھی۔ جبکہ دوسری غائب تھی . . . پورا جسم کیچڑ سے لت پت تھا۔ جب ہم گھر پہنچے تو سب لوگوں نے ہمارا کس طرح استقبال کیا یہ الگ کہانی ہے جسے پھر کبھی سنائیں گے۔

انوکھا لاڈلا

مرسلہ:- عمارہ احمد ۔ لاہور

روکر سوئے، جاگ کے روئے، کبھی نہ چپ ہوئے
صبح نہایا ہے تو شاید شام تلک سوئے
پھر بھی شاید "کچی نیند" سے جاگے اور روئے
من موجی ہے جب تک چاہے سوتا رہتا ہے
مُنّے کا تو کام ہے رونا، روتا رہتا ہے

چُپ، خاموش، ابھی سویا ہے، آہستہ بولو
مت چیخو، آواز نہ دو، دروازہ مت کھولو
مُنّا سویا ہے تم بھی جا کر پل بھر سو لو
سارا گھر اُس کی خاطر چُپ ہوتا رہتا ہے
مُنّے کا تو کام ہے رونا، روتا رہتا ہے

مُرغی کے ننھے مُنّے چوزے کو بھینچ دیا!
نیچے بچھائے دستر خواں کا کونا کھینچ دیا
دادی امّی کے سوکھے بستر کو سینچ دیا

بارش کا مختصر نظارہ

دُور سے بادل کالا آیا
کھیتوں میں سبزہ لہرایا

ہو گیا سارا عالم اندھا
بادل نے پھر شور مچایا

شور مچا کے کڑکی بجلی
جیسے کہ طوفان ہو آیا

لوگوں نے کھیتوں میں آکر
پیارا پیارا نغمہ گایا

ایسے پیارے موسم نے پھر
خوش ہو کر پانی برسایا

مرسلہ:- سیّد باقر رضوی، کراچی

سب کو ہُوا معلوم یہاں اکلوتا رہتا ہے
مُنّے کا تو کام ہے رونا، روتا رہتا ہے

معصوم

رانا گلزار احمد، مظفر گڑھ

جمعرات کے دن ہم بہت خوش ہوتے ہیں۔ کہ کل اسکول کی چھٹی ہے اور ہم خوب مزے سے سوئیں گے لیکن شاید ہماری قسمت ہی خراب ہے کیونکہ جب ہم جمعہ کے دن خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹ رہے ہوتے ہیں تو امی حضور ہمارے کمرے میں آنازل ہوتی ہیں اور جھنجھوڑ کر بستر سے اُٹھا دیتی ہیں کہ "غضب خدا کا دس بج رہے ہیں اور تمہاری ابھی تک نیند پوری نہیں ہوئی۔ چلو۔ جلدی سے اُٹھو اور مارکیٹ سے گوشت لے کر آؤ۔" اور ہم اپنے آپ کو کوستے ہوئے بستر سے اُٹھ جاتے ہیں۔

آج بھی جمعہ کا دن تھا ہم بستر پر پڑے

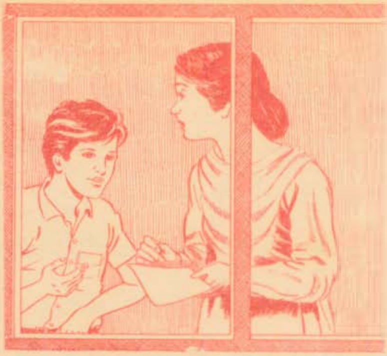

خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے کہ اچانک امی حضور نے ہمیں باورچی خانے سے آواز دی "ارے کمبخت گلزار! دن کے بارہ بج رہے ہیں اُٹھ جاؤ اور مارکیٹ سے گوشت لے آؤ بہت دیر ہوگئی ہے۔"

جناب ہم کہاں تھے اُٹھنے والے آپ خود ہی سوچیے کہ ایسے سنہری موقعے روز روز تو نہیں آتے امی حضور آوازیں دیتی رہیں مگر ہم مزے سے بستر میں دبکے پڑے رہے ابھی ہم خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹ ہی رہے تھے کہ اچانک کسی نے

نقل شدہ، طویل اور غیر معیاری تحریریں شائع نہ ہوسکیں گی۔

جو تحریر آپ ہمیں بھجوائیں اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں اور ہم سے واپسی کا تقاضہ نہ کریں۔

ہمارے کان کو پکڑا اور بینڈ مروڑ کر دوسرا اسٹیشن لگانے کی کوشش کی۔ ہم جلدی سے ہائے ... اُوئی " کی آواز کے ساتھ بستر سے اُٹھے اور اپنے اُوپر ہونے والے اس اچانک حملے کی صورتِ حال جائزہ لینے لگے۔ معلوم ہوا کہ امی حضور ہمارے کمرے میں نازل ہو چکی ہیں۔

" تیری ابھی تک نیند پوری نہیں ہوئی میں تمہیں صبح سے بلا رہی ہوں۔ غضب خدا کا سورج سر پر آگیا ہے " امی نے ہمارے معصوم کان کو مروڑتے ہوئے کہا۔

"ارے ... میرا کا... کان... تو چھوڑ دیں "

" بولو ابھی تمھاری نیند پوری ہوئی ہے یا..." امی نے ہمارے کان کو چھوڑتے ہوئے کہا۔

"نیند کو چھوڑیں امی! اب آپ فرمائیے... کیا کام ہے ؟"

" یہ لو پیسے اور مارکیٹ سے گوشت لے کر آؤ " امی نے کرارے کرارے نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا

ہم نے اپنا حلیہ درُست کیا اور اپنی ایف سولہ سائیکل پر سوار ہو کر مارکیٹ کی طرف چل دیے ... مارکیٹ میں کوئی خاص رَش نہیں تھا، کیونکہ زیادہ رش تو صبح کے وقت ہوتا ہے اس لیے ہم نے جلدی سے گوشت خریدا اور اپنی ایف سولہ پر سوار ہو کر اپنے یُوتے شریف کا ہینڈل گھر کی طرف موڑ دیا۔ جب میں اپنے گھر کے قریب والی گلی میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ محلّے کے لڑکے ایک چھوٹے سے بچّے کی پٹائی کر رہے ہیں جس کی عمر دس سال کے لگ بھگ تھی ہم جلدی سے اپنی سائیکل سے اُترے اور آگے بڑھ کر اُسے چھُڑوایا، اُسے چھُڑواتے ہوئے کئی لاتیں اور مکّے مجھے بھی لگے۔ میں نے اس معصوم کے گلے میں سے جوتیوں کا ہار نکالا جو شاید انہی محلّے کے لڑکوں نے اُسے پہنایا تھا اور اُسے کھڑا ہونے میں مدد دی۔ وہ بڑی مشکل سے کھڑا ہوا کیونکہ اُسے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ میں نے محلّے کے لڑکوں سے پوچھا " تم اس معصوم کو کیوں اتنی بے دردی سے مار رہے تھے ؟"

ان لڑکوں میں سے ایک نے ہنس کر جواب دیا " تمہیں نہیں پتا یہ پاگل ہے اور پاگل کی ہمیشہ پٹائی کی جاتی ہے" اس کے ساتھ ہی سب لڑکوں نے زور زور سے پکارنا شروع کر دیا" پاگل ... پاگل" مجھے یہ بات سُن کر بہت دُکھ ہوا۔ میں نے اُن لڑکوں سے کہا۔

"ارے ظالمو! اس بے چارے معصوم اور بے گناہ کو تم نے مار مار کر صرف اس لیے آدھ موا کر دیا ہے کہ یہ پاگل ہے تمہیں پتا ہے کہ ایسے لوگ خُدا کے پیارے ہوتے ہیں میں تم سے پوچھتا ہوں کہ خدا کے پیاروں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ جیسا تم نے کیا ہے ؟ اُن لڑکوں میں سے ایک موٹے سے لڑکے نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولا " آیا ہے

ہمیں نصیحتیں کرنے والے ایک تو پاگل تھا، دوسرا بھی پاگل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی لڑکوں نے قہقہے لگائے اور پاگل پاگل... کی آوازیں لگانے لگے۔ میں نے اس معصوم بچّے کو اپنی سائیکل پر بٹھایا اور اس دُعا کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چل دیا کہ خدا اُنھیں ہدایت دے۔

جو نہی میں اپنے گھر میں داخل ہُوا تو ماں نے پُوچھا۔

"بیٹا گلزار یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟" میں نے امّی کو اس کے بارے میں ساری بات بتادی اور کہا "ماں! یہ اب ہمارے گھر میں رہے گا۔"

"ہاں بیٹا! اب یہ ہمارے گھر میں میرا بیٹا بن کر رہے گا۔" ماں نے اُسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

یہ لڑکا بہت ہی خوبصورت تھا۔ گول مٹول چہرہ اُبھرے ہوئے رُخسار اور نیلی نیلی آنکھیں، گورا رنگ

"میرا یہ بیٹا تو پورا چاند ہے چاند!" ماں نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ میں خوش ہوکر بولا۔

"ماں! یہ واقعی چاند جیسا ہے کیوں نہ ہم اس کا نام چاندو رکھ دیں۔"

ٹھیک ہے آج سے میرے بیٹے کا نام چاندو ہے۔ امّی جان چاندو کی بہت خدمت کرتی ہیں۔ جب دیکھو اُسے نہلا کر نئے کپڑے پہنا رہی ہیں۔ گود میں بٹھا کر کھانا کھلا رہی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن مجھے جنّت میں داخلہ تو میرا بیٹا چاندو ہی دلائے گا!

میں سوچتا ہوں کہ اس چاندو کو تو میں اپنے گھر لے آیا ہوں۔ لیکن ابھی پتا نہیں کتنے چاندو دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ ظالم اور سرکش لوگوں کے ظلم و ستم برداشت کر رہے ہیں۔

تصحیح

آنکھ مچولی کے گزشتہ شمارے میں صفحہ ۱۱۴ پر حضرت بلالؓ سے متعلق نذیر احمد کی ایک مختصر تحریر شائع ہوئی تھی۔ ہمارے ایک قاری سہیل احمد صدّیقی نے توجہ دلائی ہے کہ حضرت بلالؓ کے والد کے نام کے بجائے رباع نہیں 'رباح' ہے۔ مزید یہ کہ حضرت بلالؓ کی وفات اس تحریر میں بیان کیے گئے واقعے کے بہت بعد یعنی ۲۰ھ میں ہوئی۔ ادارہ اس غلطی کے لیے معذرت خواہ ہے۔ (ادارہ)

بلیک بکس

"اگر آپ مستقبل کے اچھے اور نیک نام ادیب بننا چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے کہ آپ کا نام بلیک بکس میں نہ آنے پائے۔"

اُمِّ رمیصاء

اُمّی ابّو کا صفحہ

ایک شخص رات کی تاریکی میں سنسان اور ویران قبرستان سے گذر رہا ہے۔ آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ اِس ماحول میں یہ شخص یقیناً خوف زدہ ہوگا۔ اِس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی ہوں گی۔

اب ایک اور شخص کو لیجئے۔ جو کھیل کے میدان میں بیٹھا ہوا اپنی پسندیدہ ہاکی ٹیم کو کسی دوسری ٹیم سے مقابلہ کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ کبھی اُس کا چہرہ مطمئن اور کبھی بے چین نظر آتا ہے، کسی لمحے وہ سیٹ سے اُٹھ جاتا ہے اور کبھی وہ خوشی سے چلاّنے لگتا ہے..... کھیل کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اِس کے چہرے کے تاثرات میں اُتار چڑھاؤ کی کیفیت نمودار ہونے لگتی ہے۔

آیئے اب ایک تیسرے شخص کو دیکھتے ہیں۔ جو ایک خوبصورت تقریب میں اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہے.... اِس کے چہرے پر غور کیجئے... مطمئن مسرور خوشی سے کھلتا ہوا۔ یہ چہرہ آپ کو شاداں و فرحاں نظر آئے گا۔

کبھی کسی سوگ یا تعزیت کے موقع پر کسی شخص کا چہرہ غور سے، دیکھئے انتہائی سنجیدہ نظریں جھکی ہوئی۔ آواز بالکل آہستہ، لہجہ بڑا دھیما۔

مندرجہ بالا مثالوں سے جو بات میں ثابت کرنا چاہ رہا ہوں۔ وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم جس ماحول میں بھی ہوں گے اِس کے اثرات ہماری شخصیت پر بھی پڑیں گے۔ اور ہمارا چہرہ اِس کیفیت کا غمّاز بن جائے گا۔

ایک بات بتائیں۔ آپ کے بچّے کس ماحول میں رہ رہے ہیں؟

آپ جب اپنے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو دیکھ کر آپ کے بچے سہم جاتے ہیں، خوش ہوتے ہیں۔ یا آپ کے آنے کی پروا نہیں کرتے؟ اِس پر غور کیجئے۔

اگر آپ کے بچّے سہم جاتے ہیں تو ثابت یہ ہُوا کہ وہ آپ سے خوفزدہ ہیں۔ آپکی شخصیت سے اُنہیں احساسِ تحفّظ ملنے کے بجائے خوف اور بے اطمینانی ملتی ہے۔ اِس کے برعکس آپ کو دیکھ کر ان کے چہرے کھل اُٹھتے ہیں تو میرا یہ گمان کبھی غلط نہیں ہوسکتا کہ آپ کی شخصیت میں جادو ہے، آپ خوشگوار طبیعت کے مالک ہیں۔ آپ کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی ہے...

اگر آپ اپنے مسکراتے ہوئے چہرے سے بچّوں کو خوشگوار ماحول فراہم کر رہے ہیں تو آپ سمجھ لیجئے کہ آپ اُن کے اندر خود اعتمادی، حوصلے اور محبّت کی پرورش کر رہے ہیں۔ اور اگر آپ کا چہرہ سنجیدہ اور آپ کا روّیہ خشک رہتا ہے تو آپ نہ بھولیئے کہ آپ اپنے بچّوں کی شخصیت کو توڑنے پھوڑنے کے عمل میں مصروف ہیں۔

یاد رکھیئے!... آپ کی مسکراہٹ، آپ کا قہقہہ نہ صرف آپ کے گھر کو جنّت بنا دیتا ہے۔ بلکہ آپ کے بچوں کو بھی اعتماد اور مُحبّت کی دولت سے مالامال کر دیتا ہے۔ اُن کی شخصیت کو نکھار دیتا ہے۔

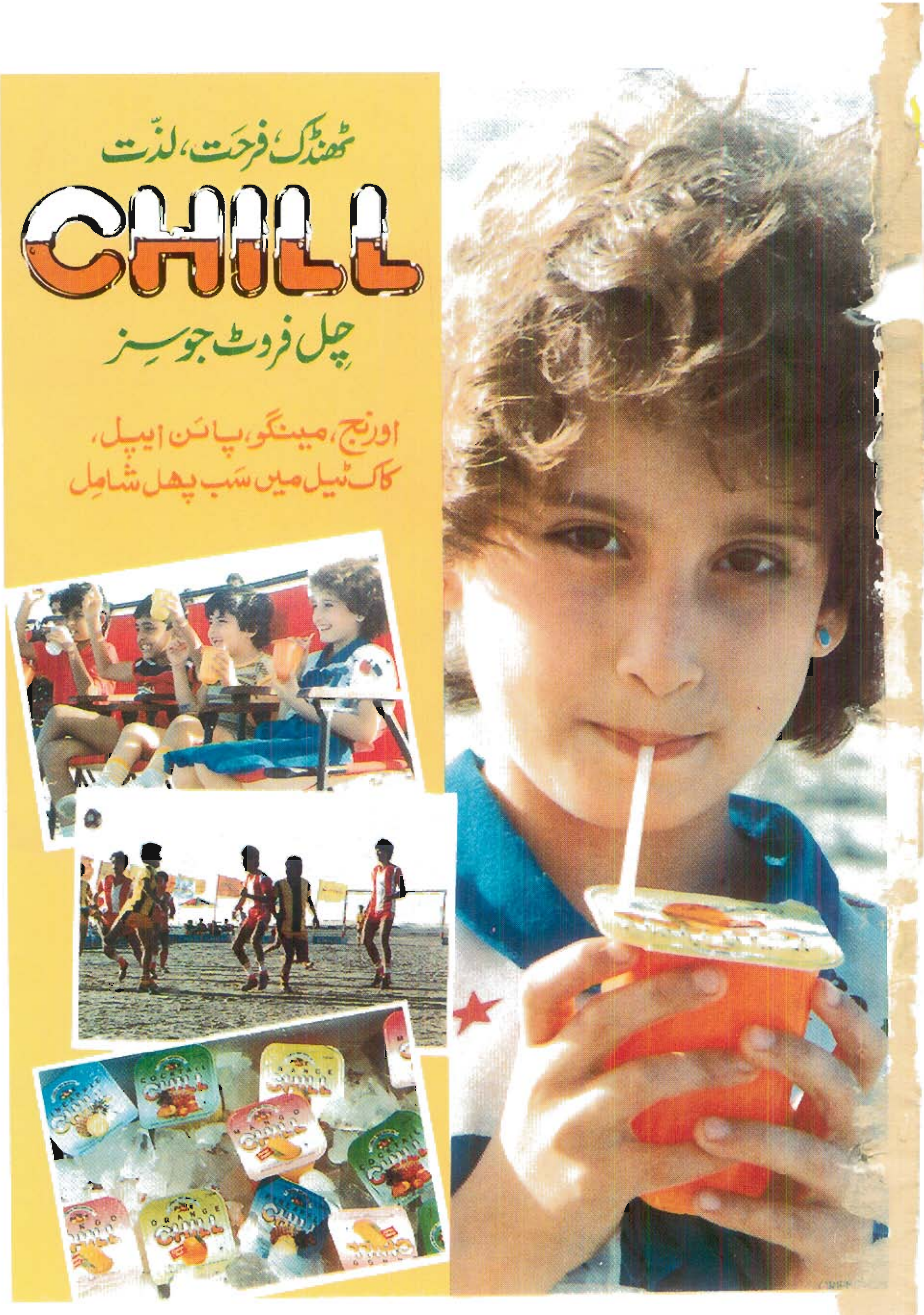
ٹھنڈک، فرحت، لذّت
CHILL
چل فروٹ جوسِز
اورنج، مینگو، پائن ایپل،
کاک ٹیل میں سب پھل شامل

بلوبینڈ
مارجرین
لذّت بھی
توانائی بھی
Blue Band
MARGARINE